شمارہ نمبر ۵

قائداعظم لائبریری کا ادبی مجلہ

دورِ جدید

# مخزن
## لاہور

مدیر: ڈاکٹر وحید قریشی

قائداعظم لائبریری، شاہراہ قائداعظم، باغ جناح لاہور

## مجلس ادارت

عنایت اللہ (صدر مجلس)

انتظار حسین

ڈاکٹر سہیل احمد خاں

ڈاکٹر سلیم اختر

ڈاکٹر انور سدید

امجد اسلام امجد

ڈاکٹر وحید قریشی (مدیر اعزازی)

محمد ہارون عثمانی (معاون امور دفتری و ادبی)



جلد ۳، شمارہ ۱، ۲۰۰۳ء

ناشر: قائداعظم لائبریری، شاہراہ قائداعظم باغ جناح لاہور

فون نمبر: ۹۲۰۱۰۰۷۔ فیکس: ۹۲۰۱۰۰۶

ای میل: qal@brain.net.pk

ویب سائٹ: www.qal.fws1.com

کمپوزنگ: محمد اکرام الحق

طابع: گوہر سنز، رحمان مارکیٹ غزنی سٹریٹ لاہور

صفحات: ۱۶۴

قیمت: -/100 روپے



## جملہ حقوق محفوظ


### ضروری نوٹ

(۱) مخزن میں شائع ہونے والی نگارشات کے مندرجات سے قائداعظم لائبریری اور مجلس ادارت کا متفق ہونا ضروری نہیں۔

(۲) تبصرے کے لیے ہر کتاب کے دو دو نسخے روانہ کیے جائیں۔

(۳) ادبی معاملات میں جملہ خط و کتابت مدیر مخزن، معرفت قائداعظم لائبریری، شاہراہ قائداعظم باغ جناح لاہور سے کی جائے۔

(۴) مالی امور میں چیف لائبریرین قائداعظم لائبریری سے

# ترتیب


| | | |
|---|---|---|
| **اداریہ** | | ۵ |
| **ادبیات** | | |
| ۱۔ حسرت موہانی کے بارے میں غلطی ہائے مضامین | شفقت رضوی | ۷ |
| ۲۔ حفیظ ہوشیار پوری اور ہجرت | ڈاکٹر قرۃ العین طاہرہ | ۲۹ |
| ۳۔ بابائے اردو کی نو دریافت تحریر | طاہر مسعود | ۴۲ |
| **اقبالیات** | | |
| ۱۔ اقبال شناسی | ڈاکٹر وزیر آغا | ۵۰ |
| ۲۔ ''اقبال شناسی'' کی خطرناک جہتیں | ڈاکٹر وحید عشرت | ۵۲ |
| **یادرفتگاں** | | |
| ۱۔ مالک رام | پروفیسر جگن ناتھ آزاد | ۶۸ |
| ۲۔ مولانا روحی (ایک نادیدہ شخصیت کا خاکہ) | ڈاکٹر خورشید رضوی | ۷۵ |
| ۳۔ جیلانی کامران۔ ایک تہذیبی نقاد | ڈاکٹر سلیم اختر | ۸۱ |
| ۴۔ بیاد افتخار احمد صدیقی | ڈاکٹر تحسین فراقی | ۸۵ |
| ۵۔ تعلیم نسواں اور بابا سرکھیم سنگھ بیدی | محمد عباس چغتائی | ۹۱ |
| **تبصرے** | | |
| **مفصل تبصرے** | | |
| ۱۔ پانچ کتابوں کا جائزہ | ڈاکٹر انور سدید | ۹۵ |
| i۔ نے چراغے نے گلے | | |
| ii۔ رائدین جدیدیت | | |
| iii۔ حیات جاوید | | |
| iv۔ مولانا صلاح الدین احمد پر دو کتابیں | | |
| ۲۔ تعارف دیوان مانی مشہدی | پروفیسر سید امیر حسن عابدی | ۱۰۳ |
| **مختصر تبصرے** | | |
| ۳۔ اصول تحقیق و ترتیب متن از ڈاکٹر تنویر احمد علوی | ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا | ۱۰۶ |

۴۔ پوشیدہ تری خاک میں (سفرنامہ اندلس) — جعفر بلوچ — ۱۰۷
از ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی

۵۔ یادنامہ داؤدی — رفاقت علی شاہد — ۱۰۸
مرتبہ از ڈاکٹر تحسین فراقی اور جعفر بلوچ

۶۔ دنیا جن سے روشن ہے — محمد سعید — ۱۰۹
مرتبہ از ڈاکٹر نثار احمد قریشی

۷۔ ہمدرد فاؤنڈیشن کراچی کی دو کتابیں — سیدہ مصباح رضوی — ۱۱۱
i۔ ادبی مقالات سعید
ii۔ شہید حکیم محمد سعید کے انٹرویو


## کھوئے ہوؤں کی جستجو


۱۔ تزک نادری عرف سیاحت نامہ ہند — شفیق الرحمٰن — ۱۱۳
۲۔ قبر سے واپسی — فکر تونسوی — ۱۳۶


## مخزن


۱۔ آرا اور تبصرے — ادارہ — ۱۴۱
۲۔ کتب موصولہ برائے تبصرہ — محمد ہارون عثمانی — ۱۵۵


## قائداعظم لائبریری


۱۔ علمی و ادبی تقاریب — محمد ہارون عثمانی — ۱۵۷
۲۔ لائبریری میں آنے والی نئی اردو کتب — ضیاء الدین فاروقی رفہیم عثمانی — ۱۶۰
۳۔ لائبریری میں چند اہم شخصیات کے ذاتی ذخیرہ ہائے کتب — محمد ہارون عثمانی — ۱۶۳


# اداریہ

پاکستان میں اس سال محترمہ فاطمہ جناح کا یوم ولادت منایا گیا اور اسی نسبت سے یہ سارا سال خواتین کے لیے مخصوص رہے گا۔ پاکستان میں خواتین کی آبادی مردوں سے زیادہ ہے، یعنی ۵۱ فیصد۔ اس نسبت سے سرکاری محکموں میں ان کی نمائندگی زیادہ ہونی چاہیے تھی، لیکن ایسا نہیں ہے۔ باوجود یہ کہ پچھلے چند برسوں سے عورتوں کی تعلیم مردوں سے زیادہ رہی۔ حتی کہ یونیورسٹیوں میں بھی مردوں کے مقابلے میں عورتوں کی تعداد بطور طالب علم بہت زیادہ ہے، لیکن محکموں میں ان کی تعداد کا تناسب بہت کم ہے۔ ادب میں خواتین نے اپنا ایک الگ مقام پیدا کیا ہے۔ اردو ادب میں خواتین کی نگارشات کو خصوصی اہمیت حاصل ہے۔ ایسے ادبی ادارے بھی حکومت کی سربراہی میں چل رہے ہیں، لیکن ان اداروں میں خواتین کی نمائندگی نہ ہونے کے برابر ہے۔ کسی ادبی ادارے کا سربراہ آج تک کسی خاتون کو نہیں بنایا گیا، لیکن ایسی ادیب خواتین ہمارے معاشرے میں موجود ہیں جو انتظامی تجربہ بھی رکھتی ہیں اور ادب کے دائرے میں انہیں اہمیت بھی حاصل ہے۔ فی الوقت لاہور اور اسلام آباد کو سامنے رکھتے ہوئے بعض نام ذیل میں پیش کیے جاسکتے ہیں۔ ان میں سے اکثر اداروں کی سربراہی کے لیے بھی موزوں ہیں۔ اس سال جن ادبی اداروں میں سربراہوں کی آسامیاں خالی ہوں اگر اس سلسلے میں ان ناموں کو بھی پیش نظر رکھ لیا جائے تو خواتین کی نمائندگی کا حق ادا ہو جائے گا۔

لاہور میں بشریٰ رحمٰن، سائرہ ہاشمی، ڈاکٹر میمونہ انصاری، عمرانہ عزیز، توصیف افضل، بانو قدسیہ، عطیہ سید، شیما مجید، شبہ طراز (تجدیدنو)، عفت انیس (دانشور)، صدیقہ بیگم (ادب لطیف)، منصورہ احمد (فنون)، پروین ملک (مادنو) یہ چند نام بہت نمایاں ہیں۔

اسی طرح اسلام آباد میں کشور ناہید (سابق مدیرہ مادنو)، عذرا اصغر (تجدیدنو)، شمع خالد، مسز علم دار رضا، شبنم شکیل، خالدہ حسین، بیگم ثاقبہ رحیم الدین، ڈاکٹر قرۃ العین طاہرہ اور نصرت منیر شیخ کے نام اہم ہیں۔

اسی طرح ایک بڑی تعداد کراچی میں بھی موجود ہے۔ ہاجرہ مسرور، شاہدہ حسن، فاطمہ حسن، ادا جعفری اور آمنہ مشفق چند نام ہیں، مزید نام بھی اضافہ کیے جاسکتے ہیں۔ ہماری یہ گزارش ہے کہ حکومت خواتین کے اس سال میں اداروں کی سربراہی میں ان کے ناموں پر بھی غور کرے۔

**مدیر**

# حسرت موہانی کے بارے میں غلطی ہائے مضامین

شفقت رضوی

حسرت موہانی کی سیرت کی پاکیزگی اور کردار کی بلندی نے سب کو ان کا گرویدہ بنائے رکھا۔ اس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے بعض اہل قلم نے ایسے واقعات ان سے منسوب کر دیے ہیں جن سے بظاہر ان کی عظمت میں اضافہ ہوتا ہے، لیکن وہ واقعات تاریخی شواہد اور منطقی استدلال سے درست ثابت نہیں ہوتے۔ مظلوم حسرت ایسی بے شمار روایات کے شکنجے میں جکڑے ہوئے ہیں۔ اکثر صورتوں میں صداقت کا متلاشی ان خود ساختہ روایات کی تردید کرتے ہوئے اس لیے ڈرتا ہے کہ ان کے راوی معتبر اور ثقہ مانے جاتے ہیں۔ ان کے خلاف لکھنا اپنے خلاف محاذ کھولنے کا سبب نہ بن جائے۔

افسوس اس بات پر ہوتا ہے کہ اگر کوئی بات غلط نہیں یا یادداشت کی کمزوری کی بنا پر لکھ دی گئی تب بھی بعد کے لکھنے والے اس کی اصلیت پر غور کرنے اور اسے صداقت کی کسوٹی پر پرکھنے کی کوشش نہیں کرتے بلکہ اس کا معلوم صداقت کے طور پر بار بار اعادہ کرتے ہیں۔ یہاں تک پڑھنے والوں کو اس پر یقین آ جاتا ہے۔ خطرہ یہ ہے کہ اس طرز عمل سے تاریخ اور سیرت مسخ ہو کر رہ جائیں گی۔ اگر من گھڑت روایات کو مسترد کر دیا جائے تب بھی حسرت کی بزرگی میں ذرہ برابر فرق نہیں پڑے گا۔ ہماری غرض وغایت ایسی ہی باتوں کی نشان دہی کرتے ہوئے شواہد اور دلائل سے ان کا محاسبہ کر کے کسی درست نتیجہ تک پہنچنا ہے۔ ممکن ہے اس کوشش میں ہم سے بھی سہو ہو جسے اہل علم درست کر سکتے ہیں۔

## قضیہ علی گڑھ کالج سے نکالے جانے کا:

حسرت موہانی ایم۔اے۔او کالج علی گڑھ کے طالب علم رہے ہیں۔ انہوں نے ۱۹۰۳ء میں اس کالج کے طالب علم کی حیثیت سے الہ آباد یونیورسٹی سے بی۔اے کی ڈگری حاصل کی، لیکن امتحان سے قبل ان کے کالج سے نکالے جانے کی اطلاع عام ہے۔ یہ غلط فہمی عبدالشکور کی کتاب ''حسرت موہانی'' مطبوعہ آگرہ ۱۹۴۶ء سے پیدا ہوئی۔ اس کتاب میں انہوں نے لکھا ہے:

> ''امتحان پاس کرنے سے پہلے وہ سیاست اور وطن کی آزادی کے اس قدر دلدادہ ہو چکے تھے کہ تین مرتبہ نعرہ حریت بلند کرنے پر ایم۔اے۔او کالج سے نکالے گئے''۔
>
> (عبدالشکور: تصنیف ''حسرت موہانی'' مطبوعہ آگرہ، ۱۹۴۶، ص ۱۳)

اسی بات کو رابعہ بیگم نے اپنے مضمون ''حسرت کی خانگی زندگی'' مشمولہ رسالہ لکھنؤ، جولائی ۱۹۵۲ء میں دہرایا ہے۔ حسرت کی پہلی سوانح عمری عارف ہنسوی نے ۱۹۱۸ء میں لکھی تھی اس میں ایسے کسی واقعہ کا ذکر نہیں۔ عبدالشکور نے اپنے بیان کی تائید میں کوئی شہادت پیش نہیں کی بلکہ یہ اضافہ بھی کیا ہے کہ:

> ''اس کا تعجب نہیں کہ کالج سے حسرت تین مرتبہ نکالے گئے بلکہ حیرت اس سے پیدا ہوتی ہے کہ وہ آخر امتحان میں کیسے شریک کیے گئے'' (حوالہ مذکورہ)

حسرت کی عملی زندگی سے واضح ہوتا ہے کہ وہ بڑی حد تک آزادی کی جدوجہد کے لیے وقف ہو گئے تھے۔ ممکن ہے طالب علمی کے زمانہ میں جذبہ حریت کی چنگاری ان کے دل میں پیدا ہوئی ہو۔ اس وقت کے تعلیمی ماحول میں یہ خودسری پیدا نہیں ہوئی تھی کہ طالب علم اپنے فرائض سے ہٹ کر سیاست کی الجھنوں میں پڑے۔ علی گڑھ میں تو سرسید کی تعلیمات کا گہرا اثر تھا جس کے مطابق مسلمانوں کا سیاست میں حصہ لینا ممنوع قرار پایا تھا۔ کالج چھوڑنے کے بعد بھی سال ڈیڑھ سال تک ان میں سیاست میں شمولیت کا رجحان پیدا نہیں ہوا تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ طالب علمانہ شرارتوں کی وجہ سے ان کو سزائیں ملیں، لیکن ان کی نوعیت وہ نہیں تھی جو عبدالشکور نے بیان کی ہے۔

حسرت کے بارے میں پہلا مضمون ''حسرت موہانی، ایک قدردان کی نظر میں'' رسالہ زمانہ کانپور، دسمبر ۱۹۰۸ء میں چھپا تھا اس کے ساتھ مضمون نگار کا نام ''خافی خاں'' درج ہے۔ یہ دراصل سجاد حیدر یلدرم کا قلمی نام ہے، وہ علی گڑھ میں حسرت سے سینئر تھے۔ انہوں نے ۱۹۰۰ء میں گریجویشن کر لیا تھا۔ اس کے بعد بھی کچھ عرصہ وہ علی گڑھ کے ''بیچلرز لاج'' میں مقیم رہے۔ انہوں نے جولائی ۱۹۰۰ء میں انجمن اردوئے معلی قائم کی تھی جس کی ہفتہ وار نشستیں ہوتی تھیں حسرت اس انجمن کے روح رواں تھے۔ سجاد حیدر یلدرم اور حسرت کے درمیان قریبی مخلصانہ روابط تھے اس لیے باور کرنا پڑتا ہے کہ اپنے مضمون میں انہوں نے جو کچھ لکھا وہ حقائق پر مبنی ہے۔ انہوں نے تفصیل سے حسرت کی شرارتوں اور انہیں ملنے والی سزاؤں کا ذکر کیا ہے۔

حسرت کو ایک سزا اس وقت ملی جب کالج کی کرکٹ ٹیم کی کسی انگریزوں کی ٹیم سے میچ جیتنے کی خوشی میں طالب علموں نے ہنگامہ پرور جلوس نکالا اس میں حسرت بھی شریک تھے۔ سجاد حیدر یلدرم نے لکھا ہے کہ:

''نتیجہ یہ ہوا کہ فردِ سیاہ میں جو پرنسپل کے دفتر کی میز کے داہنے خانے میں بند رہتی تھی، ان کا نام لکھا گیا''۔

(خافی خان: مضمون ''حسرت موہانی ایک قدردان کی نظر میں: مشمولہ رسالہ زمانہ، دسمبر ۱۹۰۸ء، ص ۲۹۶)

دوسرا واقعہ جس کا خافی خاں نے حوالہ دیا ہے موسم برسات کے پہلے چھینٹے پر لڑکوں کا بے قابو ہو کر پانی اور کیچڑ میں کھیلنا اور حسرت کا دونوں ہاتھوں میں کیچڑ کے لوندے لیے ان کلاسوں کی طرف بڑھنا جہاں طلبہ برسات کا لطف اٹھانے کے بجائے درس لے رہے تھے۔ چنانچہ:

''فردِ سیاہ گھات میں لگی ہی تھی اور مولینا کا نام درج ہوا''۔ (ایضاً، ص ۲۹۶)

تیسرا واقعہ یہ ہے کہ گرمی کی دوپہر میں شور ہوا کہ آموں کے باغ کے مالی نے کسی لڑکے کی پٹائی کر دی ہے اس کی خبر لی جائے۔ حسرت بھی لڑکوں میں شریک ہو گئے اور باغ کو اجاڑ دیا۔ اس کی سزا یہ ملی کہ:

''فردِ سیاہ ایک مرتبہ پھر نکلی اور مولینا کچھ عرصہ کے لیے حکماً کالج سے رخصت کر دیے گئے''۔ (ایضاً، ص ۲۹۷)

حسرت نے اکتوبر ۱۹۰۲ء کو کالج میں ایک عظیم الشان مشاعرہ کا اہتمام کیا۔ یہ میر مہدی مجروح کی زندگی کا آخری مشاعرہ تھا۔ ان کے علاوہ حسرت کے استاد تسلیم لکھنوی اور گستاخ رام پوری بھی شریک ہوئے تھے۔ مشاعرے کے بارے میں حسرت کے مخالفین نے پرنسپل سے شکایت کی کہ اس میں خلاف اخلاق اشعار پڑھے گئے تھے۔ اس پر پرنسپل نے سخت غصہ کا اظہار کیا اور:

''تھوڑی دیر میں معلوم ہوا کہ اردوئے معلی بار دیگر ترک وطن کیا'' (ایضاً، ص ۲۹۵)

ان واقعات میں کہیں بھی نعرہ حریت بلند کرنے کا ذکر نہیں۔ فردِ سیاہ میں نام لکھے جانے کے علاوہ دو بار انہیں کالج سے نکالا گیا۔ علی گڑھ کالج سے واقف حضرات جانتے ہیں کہ وہ ایک اقامتی کالج تھا، جو طالب علم داخلہ لیتا اس کو ہاسٹل میں رہنا پڑتا۔ کالج سے نکالے جانے کا مطلب ہوتا کہ طالب علم کچھ مدت کے لیے کالج یا ہاسٹل کی حدود میں داخل نہیں ہو سکتا۔ اس سزا کی وجہ سے اس کی تعلیم کا ہرج ہوتا۔ حاضری کم ہو جاتی اسے علی گڑھ میں رہنے کے لیے کوئی ٹھکانہ نہ رہتا تو اس کی سزا کی اطلاع والدین تک پہنچ جاتی۔ یہ اخراج عارضی چند دنوں کے لیے ہوتا، لیکن جس انداز سے عبدالشکور اور رابعہ بیگم نے سزا کا ذکر کیا اس سے تاثر قائم ہوتا ہے کہ وہ expell کر دیے گئے تھے۔ Expell کرنے کی صورت میں اطلاع متعلقہ یونیورسٹی کو دی جاتی ہے پھر طالب علم اس یونیورسٹی کے کسی امتحان میں شریک نہیں ہو سکتا۔ ہمارے سامنے رابعہ غلام حسین کی مثال ہے جن کو ۱۹۰۷ء میں علی گڑھ کالج نے expell کیا تھا اور ۱۹۱۳ء میں سید ہاشمی فرید آبادی کو expell کیا گیا، پھر ان دونوں کو نہ داخلہ دیا گیا اور نہ امتحان دینے کی اجازت دی گئی۔

حسرت کو کالج سے نکالے جانے کی اطلاع رسالہ اردو ادب (علی گڑھ) کے کسی مضمون میں چھپی تھی جس پر قاضی عبدالودود نے بھی شک کا اظہار کرتے ہوئے مسعود حسن رضوی کے نام اپنے خط میں لکھا تھا:

''یہ بات بالکل غلط معلوم ہوتی ہے کہ حسرت مشاعرے کی وجہ سے کالج سے نکالے گئے تھے۔ یہ باتیں اگر غلط ہیں (اور تھوڑی سی زحمت گوارا کی جائے تو ان کے صحیح یا غلط ہونے کا پتہ چل سکتا ہے) تو ''اردو ادب'' میں اس کا اندراج مناسب نہ تھا اور اندراج ضروری تھا تو ساتھ ساتھ اس کی تردید بھی ہوتی تھی''۔

(قاضی عبدالودود کا خط بنام مسعود حسن رضوی مشمولہ کتاب ''مشاہیر کے خطوط'' مطبوعہ لکھنو: ۱۹۸۵ء، ص ۲۱۵)

حسرت کو ملنے والی سزا کے حوالہ سے ہارون خاں شیروانی کا بیان معتبر مانا جا سکتا ہے۔ ان کا تعلق بھی علی گڑھ ہی سے تھا۔ جن دنوں حسرت کالج میں پڑھتے تھے یہ اسکول کے طالب علم تھے۔ انہوں نے حسرت کو حاجی موسیٰ خاں رئیس ویتاولی کے مکان پر بارہا دیکھا تھا۔ حسرت کی شہرت علی گڑھ میں اتنی تھی کہ اسکول کے طالب علم ان کو دیکھنے اور ان سے ملنے کے متمنی رہتے تھے۔ ان میں ہارون خاں شیروانی بھی تھے۔ وہ لکھتے ہیں:

''حسرت کی طبیعت میں بغاوت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ اسی کا شاخسانہ یہ نکلا کہ کالج کے پرنسپل مورسن (جو بعد کو سر تھیوڈ مورسین، وزیر ہند کی کونسل کے ممبر ہوئے) نے حسرت کو اقامت خانے سے نکال دیا۔ یہ بھی مشہور تھا کہ حسرت کی قابلیت کا سکہ کالج کے سیکرٹری نواب محسن الملک مرحوم اور مقامی ٹرسٹیوں پر بیٹھا ہوا نہ ہوتا اور وہ طلبہ میں اتنے مقبول اور ہر دلعزیز نہ ہوتے تو شاید انہیں اقامت خانے سے نہیں بلکہ کالج سے نکال دیا جاتا۔ پرنسپل کی اتنی ہمت نہ ہوئی اور انہیں صرف اقامت خانے سے نکل جانے کے حکم پر اکتفا کرنا پڑا''۔

(ہارون خاں شیروانی: مضمون ''حسرت کی سیاسی زندگی'' مشمولہ رسالہ آج کل دہلی: جون ۱۹۵۳ء، ص ۵)

حسرت کے نعرہ حریت بلند کرنے کا ذکر نہ تو خافی خاں نے کیا ہے نہ اس کی تصدیق ہارون خاں شیروانی کی ہے اس لیے عبدالشکور کے بیان کو بار بار نقل کرنے سے اجتناب کرنا اور صحیح صورت حال کو ذہن میں رکھنا ضروری ہے۔

## رسالہ اردوئے معلی میں مضمون کی اشاعت اور پہلی بار گرفتاری:

حسرت موہانی نے ۱۹۰۳ء میں تعلیم مکمل کرنے کے بعد علی گڑھ میں مستقل قیام کا فیصلہ کیا اور جولائی ۱۹۰۳ء سے رسالہ

اردوئے معلیٰ کا اجرا ہوا۔ ابتدا میں یہ ادبی رسالہ تھا بعد میں اس میں ادب اور سیاست پر یکساں اہمیت کے مضامین شائع ہونے لگے۔ حسرت نے سیاست میں دلچسپی، کامل آزادی کے نصب العین کے تحت لینا شروع کی اور ہمیشہ اس پر قائم رہے۔ اردوئے معلیٰ میں ان کے اور دیگر اہل علم کے مضامین حکومت کے خلاف اور آزادی کی جدوجہد کو آگے بڑھانے کے مقصد کے تحت اشاعت پذیر ہوتے رہے۔ انہوں نے اپریل ۱۹۰۸ء میں ایک مضمون شائع کیا جس پر مضمون نگار کے نام کے بجائے ''ایک مسلمان طالب علم'' درج تھا۔ علی گڑھ کی سرکاری انتظامیہ ان سے سخت نالاں تھی وہ ان کے خلاف مقدمہ بنانے کے درپے تھی کہ متذکرہ مضمون شائع ہوا۔ اسے باغیانہ، حکومت کے خلاف اکسانے کا الزام لگا کر مقدمہ چلایا گیا اور قید کی سزا دی گئی۔ اس مضمون کے بارے میں دو باتوں کی صراحت ضروری ہے ایک مضمون کا عنوان کیا تھا اور دوسرے مضمون نگار کون تھا۔ ان دونوں باتوں کے بارے میں خوب موشگافیاں کی گئی ہیں۔ مثلاً عارف سوی نے اپنی کتاب ''حالات حسرت'' میں لکھا ہے:

''۱۹۰۸ء میں لطف ولذت ایذا کی لکھی ہوئی دعوت آپ کو دی گئی۔ آپ پر اردوئے معلیٰ میں ایک مضمون ''مصر میں انگریزوں کی پالیسی'' شائع کرنے کے جرم میں مقدمہ دائر کیا گیا''۔

(عارف ہنسوی: کتاب ''حالات حسرت: مطبوعہ دہلی ۱۳۳۷ھ، ص ۱۶)

اس مضمون کے بارے میں مولانا سید سلیمان ندوی نے لکھا:

''ایک بے نام صاحب قلم کا مضمون مصر کے نامور لیڈر مصطفیٰ کامل کی موت پر شائع ہوا جس میں مصر میں انگریزوں کی پالیسی پر بے لاگ تنقید تھی، یہ مضمون سرکار کی نظر میں قابل اعتراض ٹھہرا اور علی گڑھ کی سلطنت میں بغاوت کا پہلا جرم تھا''۔

(مولانا سید سلیمان ندوی: مضمون ''حسرت کی سیاسی زندگی'' مشمولہ رسالہ نگار، لکھنو، حسرت نمبر: جنوری فروری ۱۹۵۲ء، ص ۱۱۲)

اس مضمون کے سلسلہ میں دیگر اہل علم کے بیانات لائق غور ہیں۔

**نیاز فتح پوری:** ''آپ نے ۰۸ء میں مصر میں انگریزی پالیسی کے متعلق اردوئے معلیٰ میں شائع کیا اور حکومت نے جرم بغاوت عاید کر کے دو سال کی قید سخت کی سزا دی''۔

(مضمون ''تذکرہ حسرت'' مشمولہ رسالہ نگار، حسرت نمبر ۱۹۰۲ء، ص ۷)

**عتیق احمد صدیقی:**

''ان کو باغیانہ مضامین لکھنے کے جرم میں ماخوذ کیا گیا''۔

(مضمون ''حسرت کے عہد کا سیاسی پس منظر'': مشمولہ رسالہ اردو ادب، دہلی، حسرت نمبر: ص ۵۳)

**رام لعل نابھوی:** ''اردوئے معلیٰ میں ایک مضمون کی اشاعت پر حسرت پر تعزیرات ہند کی دفعہ ۱۲۴ الف کے تحت مقدمہ قائم ہوا''۔ (مضمون ''حسرت موہانی: مشمولہ رسالہ آج کل دہلی: حسرت نمبر ۱۹۸۵ء: ص ۴۴)

**راج بہادر گوڑ:** ''۱۹۰۸ء میں اردوئے معلیٰ میں انگریزوں کے خلاف ایک سخت مضمون شائع ہوا جو یہ تھا ''مصری حریت پسند مصطفیٰ کامل کی موت پر''۔

(مضمون حسرت موہانی: مشمولہ رسالہ اردو ادب دہلی: حسرت نمبر ص ۱۶۳)

**اختر حسن:** مصر میں انگریزی حکمت عملی کے زیر عنوان اردوئے معلیٰ میں شائع ہونے والے ایک مضمون کے سلسلہ میں ۲۳ جون ۱۹۰۸ء کو حسرت پر مقدمہ قائم ہوا''۔

(مضمون ''اردوئے معلیٰ'' مشمولہ کتاب نقد و نظر: مطبوعہ حیدرآباد دکن، ۱۹۸۴ء، ص ۲۳)

**اشتیاق اظہر:** ''سب سے پہلے آپ پر وار کیا گیا کہ اردوئے معلیٰ میں ایک مضمون کی اشاعت کے سلسلہ میں آپ پر مقدمہ قائم کیا گیا''۔ (کتاب ''سید الاحرار حسرت موہانی: اردو اکیڈمی بہاول پور، ۱۹۷۸ء، ص ۱۱۹)

ناطقہ سر بہ گریباں ہے اسے کیا کہیے؟ سوانح، تاریخ یا افسانہ طرازی؟

یہ مضمون اردوئے معلیٰ کی اپریل ۱۹۰۸ء کی اشاعت میں شامل ہے۔ مضمون کا عنوان ہے ''مصر میں انگریزوں کی تعلیمی پالیسی''۔ اس میں اعداد و شمار کے ذریعے سے ثابت کیا گیا تھا کہ مصر میں انگریزوں کی تعلیمی پالیسی کی وجہ سے تعلیم کا فروغ ہونے کی بجائے اس میں کمی ہو رہی تھی۔ مضمون کا تعلق مصر سے ضرور تھا لیکن اس میں مصطفیٰ کامل کا کوئی ذکر نہیں۔ اردوئے معلیٰ کا مصطفیٰ کامل نمبر فروری مارچ ۱۹۰۸ء کا مشترکہ شمارہ تھا (مصر میں انگریزوں کی تعلیمی پالیسی" ہماری کتاب ''مطالعہ حسرت موہانی'' کے باب صحافت میں شامل ہے)

جس طرح مضمون کے عنوان کے بارے میں طرح طرح کی قیاس آرائی کی گئی ہے اسی طرح اس کے لکھنے والے کے بارے میں بھی ہوئی ہے۔ ملاحظہ ہو۔

**مولانا سید سلیمان ندوی:**

''مضمون مذکورہ حسرت کا نہ تھا مگر مقدمہ قائم ہونے پر حسرت نے اس کو خود اوڑھ لیا اور باوجود اصرار کے اس کے لکھنے والے کا نام نہیں بتلایا۔ جہاں تک کانوں پڑی بات اس وقت یاد آتی ہے خیال آتا ہے کہ یہ مضمون اعظم گڑھ کے مشہور وکیل اقبال سہیل کا تھا''۔ (مضمون ''حسرت کی سیاسی زندگی'': حوالہ مذکورہ، ص ۱۱۲)

**جلیل قدوائی:** ''اب خاص خاص لوگوں کو معلوم ہے کہ یہ مضمون مولوی عبدالحق کی اردو اور فضل امین کی انگریزی تحریروں کا خلاصہ تھا جو اقبال سہیل صاحب نے تیار کیا تھا۔ اس اطلاع کے لیے سید ہاشمی فرید آبادی اور مولانا سید سلیمان ندوی کا شکر گزار ہوں۔ یہ معلوم کرنا بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ عدالت کی طرف ایک پروانہ مولوی عبدالحق صاحب کے نام بھی جاری کیا گیا تھا مگر اس کی تعمیل نہ ہو سکی۔ نیز حکومت نے جس جملہ کو قابل اعتراض سمجھا تھا وہ اس قسم کا تھا کہ اس زمانہ میں ایک نئی بیماری نکلی ہے جو انگریزی قوم سے مخصوص ہے اسے ''بوع الارض'' کہتے ہیں''۔ (مقدمہ ''انتخاب حسرت، اردو اکیڈمی سندھ، کراچی: ۱۹۵۳ء، ص ۹)

جلیل قدوائی نے جس بیماری ''بوع الارض'' کا حوالہ دیا ہے وہ اس مضمون میں ہمیں نہیں ملا۔ جلیل قدوائی نے سید ہاشمی فرید آبادی کا حوالہ دیا ہے اس لیے اس معاملہ میں ان سے براہ راست رجوع کرنا مناسب رہے گا۔ سید ہاشمی فرید آبادی لکھتے ہیں۔

''دکن ریویو عام ادبی ماہنامہ تھا، مولوی عبدالحق صاحب کو ہر مہینے اس کے لیے مضمون لکھنے ہوتے تھے۔ انہیں میں ایک مبسوط مقالہ ''عالم اسلامی'' چند قسطوں میں کوئی ۳۰۰ صفحات میں چھپا پھر بھی ناتمام رہا۔ اس

میں مصر کے حالات میں برطانیہ کی غاصبانہ حکمت عملی پر سخت نکتہ چینی کی تھی۔ مقالہ کے ایک حصہ کا اقتباس حسرت موہانی کے رسالہ اردوئے معلیٰ میں نقل ہوا اور ان پر الزام بغاوت کی دلیل بنا۔ (مضمون ''مولوی عبدالحق مشمولہ علی گڑھ کالج میگزین، علی گڑھ کالج نمبر، ص ۵۴)

جلیل قدوائی نے سید ہاشمی کی گواہی فراہم کی اور سید ہاشمی کی تحریر سے اس کی تردید ہوگئی۔ مضمون نگار کے بارے میں مزید قیاس آرائیاں ملاحظہ ہوں:

**خورشید سلطانہ عفت موہانی:**

''وہ مضمون مولانا سہیل مرحوم کا نہیں بلکہ حسرت صاحب کے ملنے والے طالب علم کالج فضل امین مرحوم ساکن پٹیالہ کا تھا''۔ (مضمون ''حسرت موہانی، مشمولہ ''ہماری زبان'' دہلی۔ یکم مارچ ۱۹۵۸ء

**عابد رضا بیدار:** ''سہیل مرحوم نے مجھے بتایا تھا کہ یہ مضمون ان کا لکھا ہوا تھا'' (مضمون ''حسرت'' مشمولہ رسالہ برہان، دہلی: جنوری ۱۹۶۲ص ۴۹)

**ضیاء الدین برنی:** میرے دوست ڈاکٹر سید سجاد نے ۲۶ ستمبر ۱۹۵۱ء کو مجھے یہ تحریر لکھ کر دی کہ بابائے اردو مولوی عبدالحق فرماتے ہیں کہ یہ مضمون ان کا تھا'' (بحوالہ کتاب سید الاحرار از اشتیاق اظہر، ص ۱۲)

ڈاکٹر ریاض الحسن نے محمد یوسف صاحب کے حوالہ سے لکھا ہے: ''وہ (عبدالرحمٰن شہید پشاوری) ایک روشن شام کو علی گڑھ میں ہاکی کھیل رہے تھے کہ کسی نے آ کر ان سے کہا کہ تمہارے کمرے کی سی، آئی، ڈی تلاشی لے رہی ہے۔ عبدالرحمٰن نہایت گورے چٹے آدمی تھے اور بالکل انگریز معلوم ہوتے تھے۔ وہ نکر اور قمیص میں اپنے کمرے میں پہنچے تو پولیس والوں نے انہیں انگریز افسر سمجھ کر بڑے ادب سے سلام کیا۔ اس پر انہوں نے تحکمانہ لہجہ میں کہا **Cary on** اور یہ کہہ کر وہ دوسرے کمرے میں چلے گئے اور اس مضمون کا جو اصل مسودہ رکھا ہوا تھا اسے لے کر پیچھے کے دروازے سے باہر چلے گئے اور اس مضمون کو جلا دیا۔ عبدالرحمٰن اور فضل امین ایک ہی کمرے میں رہتے تھے۔ پولیس کو معلوم ہوا اور اس کو بہت افسوس ہوا۔ حکومت کو پتہ نہ چل سکا کہ اس مضمون کا لکھنے والا کون تھا'' (کتاب ''غازی عبدالرحمٰن پشاوری از ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہاں پوری: مطبوعہ کراچی ۱۹۷۶ صفحات ۲۶۶، ۲۶۷)

ڈاکٹر ریاض الحسن کا خیال ہے کہ مضمون فضل امین کا لکھا ہوا تھا۔ عبدالرحمٰن نے ان کو بچانے کے لیے مسودہ غائب کر دیا مگر اس بیان میں سقم یہ ہے کہ علی گڑھ کے ہاسٹلوں میں پچھلا دروازہ کوئی نہیں ہوتا۔

یہ تمام قیاس آرائیاں ہیں۔ ان میں سے کسی نے بھی کوئی مضبوط اور ناقابل تردید شہادت پیش نہیں کی۔ عرصہ تک ان قیاس آرائیوں کا سلسلہ جاری رہا بالآخر ڈاکٹر نفیس احمد صدیقی نے اپنی کتاب میں اصل صورت حال منکشف کی۔ انہوں نے اخبار ٹائمز آف انڈیا (بمبئی) میں ۱۵ اگست ۱۹۰۸ء کو شائع ہونے والی خبر کا حوالہ دیا ہے جس میں مقدمہ کے فیصلہ کی اطلاع ہے۔ نفیس احمد صدیقی نے خبر کا ترجمہ یوں کیا ہے:

''۱۹۰۸ء کا مقدمہ علی گڑھ

۴ راگست ۱۹۰۸ء اردوئے معلیٰ کا ایڈیٹر، پرنٹر اور پبلشر فضل الحسن کے خلاف اس مقدمہ کی کارروائی مکمل کر لی جنہوں نے اپنے اپریل کے شمارے میں مصر میں انگریزوں کی تعلیمی پالیسی کے متعلق تنقید کی ہے۔ فضل امین جنہوں نے یہ مقالہ لکھا تھا، نے بیان دیا کہ ملزم نے یہ مشورہ دیا تھا کہ ان کو مصر میں تعلیم کے سلسلہ میں مضمون لکھنا چاہیے۔ گواہ نے اس وجہ سے ہی یہ تحریر کیا تھا کہ وہ مضمون کے مواد کے لیے ذمہ دار نہ ہوگا۔

گواہ نے کہا وہ جانتا تھا کہ ملزم کا نظریہ ہی اس مضمون میں تھا۔ عنوان گواہ کا نہیں تھا اور اس مضمون میں مضمون نگار ''مسلمان طالب علم'' علی گڑھ چھپا تھا۔

فضل امین، نواب وقار الملک اور حبیب اللہ خاں ڈپٹی کلکٹر کی جرح کے بعد استغاثہ کے وکیل نے ۲۰ منٹ اور ملزم کے وکیل نے ایک گھنٹہ تک عدالت میں بحث کی۔ اس سے یہ ثابت ہے کہ مضمون فضل امین، جو پٹیالہ ریاست میں ایک افسر کے عہدہ پر ملازم تھا، کا ہی تحریر کردہ تھا اور تحریر کرنے والے کو گواہ بنایا گیا اور محض اشاعت کرنے والے پر مقدمہ چلایا گیا۔ اس سے بڑا انصاف کا مذاق اور خون کیا ہو سکتا ہے''۔

(نفیس احمد صدیقی: کتاب ''حسرت موہانی، انقلابی تحریک آزادی: مطبوعہ پٹنہ، ۱۹۹۹ء، ص ۱۰۹۔۱۱۰)

ٹائمز آف انڈیا کی خبر کے بعد قیاس آرائیوں کا سلسلہ ختم ہونا چاہیے اور یہ حقیقت تسلیم کر لینا چاہیے کہ مضمون کا عنوان ''مصر میں انگریزوں کی تعلیمی پالیسی'' تھا۔ اس کا مواد حسرت موہانی کا فراہم کردہ تھا جسے فضل امین ضبط تحریر میں لائے تھے۔ اسی کے ساتھ انگریزوں کی انصاف پسندی بھی سامنے آتی ہے۔ ایک امر کا اشارہ تو ٹائمز آف انڈیا کی خبر میں موجود ہے کہ لکھنے والے کو سزا دینے کے بجائے اسے گواہ بنا لیا گیا اور شائع کرنے والے کو سزا دی گئی۔ اس سے زیادہ اہم پہلو یہ ہے کہ مضمون مصر کے بارے میں ہے۔ مضمون میں مصر میں انگریزوں کی پالیسی پر تنقید کی گئی تھی اس پر مقدمہ چلانے یا نہ چلانے کا حق مصر کی حکومت کو تھا نہ کہ ہندوستان کی حکومت کو!

## حسرت موہانی کی مسلم لیگ میں شمولیت:

مولانا سید سلیمان ندوی کا ایک مضمون ''حسرت کی سیاسی زندگی'' رسالہ نگار، لکھنو، حسرت نمبر ۱۹۵۲ء میں شائع ہوا تھا اس میں انہوں نے بہت سی معلومات فراہم کرتے ہوئے اپنی یادداشت کے بھروسے پر ایک واقعہ لکھا ہے کہ:

''مسلم لیگ اجلاس منعقدہ آگرہ ۱۹۱۴ء میں جو مسجد کانپور کی مصالحت کے بعد بھی ہوا تھا، حسرت شریک تھے (اور میں بھی اجلاس میں شریک تھا)، سردیوں کا زمانہ تھا۔ شب کے اجلاس میں مصلحت پسندوں نے لارڈ ہارڈنگ کے شکریہ کا رزولیوشن پیش کیا۔ یہ وہ موقع تھا جب ان مصلحت پسندوں کے ساتھ بہت سے احرار بھی اس کی تائید میں تھے۔ ایسے موقع پر صرف دو نوجوان اس کی مخالفت میں اٹھے۔ ایک حسرت موہانی اور دوسرے عبدالودود بریلوی''۔ (حوالہ مذکورہ: صفحہ ۱۱۴)

محب مکرم ڈاکٹر اعمر لاری نے حسرت موہانی کے بارے میں تحقیقی کام کر کے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی ہے انہوں نے اپنے خط مرقومہ ۲۱ راکتوبر ۱۹۸۸ء میں ہمیں لکھا ہے کہ:

''سید سلیمان ندوی نے اپنے مضمون 'حسرت کی سیاسی زندگی' (مشمولہ نگار، لکھنو، حسرت نمبر صفحہ ۱۱۴) میں لکھا ہے کہ مولانا مسلم لیگ کے اجلاس منعقدہ آگرہ (۱۹۱۳) میں شریک تھے۔ سید صاحب نے سنہ ۱۹۱۴ء لکھا ہے میں نے سنہ کی تصحیح کر کے اپنی کتاب میں درج کیا ہے (صفحہ ۱۰۲) لیکن آپ کی کتاب میں اس کا کوئی ذکر نہیں ہے اس کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے؟''۔

میں نے حقیقت معلوم کرنے کے لیے ان ماخذات کا انتخاب کیا۔

۱۔ روائیداد اجلاس ہائے سالانہ آل انڈیا مسلم لیگ منعقدہ آگرہ بتاریخ ۳۰، ۳۱ دسمبر ۱۹۱۳ء مرتبہ سید وزیر حسن آفریدی سیکرٹری، شائع کردہ آل انڈیا مسلم لیگ، بہ اہتمام محمد حسن خاں قزلباش مالک وکٹوریہ پریس، منک گنج، لکھنو

۲۔ فاؤنڈیشنز آف پاکستان (انگریزی) از شریف الدین پیرزادہ، نیشنل پبلشنگ ہاؤس، کراچی، ۱۹۶۹ء

۳۔ تاریخ مسلم لیگ مرتبہ اختر حسین: شائع کردہ مکتبہ لیگ، بمبئی نمبر ۳، ۱۹۴۰ء

ان ماخذات سے تصدیق ہوئی کہ آگرہ اجلاس ۱۹۱۴ء میں نہیں ۱۹۱۳ء میں ہوا تھا۔ مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس بوجہ جنگ عظیم ۱۹۱۴ء میں منعقد ہوا ہی نہیں۔

سید وزیر حسن کی مرتبہ رپورٹ میں کارروائی کی تفصیل کے علاوہ ڈیلی گیٹ حضرات کے ناموں کی فہرست بھی ہے۔ اس میں نہ تو مولانا سید سلیمان ندوی کا نام ہے اور نہ مولانا حسرت موہانی کا! نہ ہی کارروائی میں حصہ لینے والوں میں ان کے نام ہیں۔ البتہ عبدالودود بریلوی کی موجودگی کا اندراج ہے لیکن ہر سہ ماخذات میں ان کا رزولیوشن سے اختلاف کا ذکر نہیں ہے۔ مسجد کانپور کے تنازعہ کے حل کے سلسلہ میں ۱۹۱۳ء کے آگرہ اجلاس میں شکریہ کی قرارداد آغا خاں نے فارسی زبان میں پیش کی تھی جو بالاتفاق منظور ہوئی۔ قرارداد پر جن حضرات نے تقریریں کیں ان میں مولانا ابوالکلام آزاد بطور ڈیلی گیٹ بنگال بھی شامل تھے۔ انہوں نے تقریر میں کہا کہ ''انصاف ملا بھی تو شملہ کی بلندیوں سے، وہاں سے نہیں ملا جہاں سے توقع تھی''۔

ظاہر ہے کہ مولانا سید سلیمان ندوی کی یادداشت نے صحیح طور پر کام نہیں کیا اور ایک غلط بات عام ہوگئی۔

مولانا حسرت موہانی کے خیالات کسی بھی سیاسی جماعت کے موافقت میں نہیں تھے۔ میری نظر سے اردوے معلیٰ کے پہلے دور (۱۹۰۳ تا ۱۹۱۳ء) کے تقریباً تمام پرچے گزرے ہیں۔ ۱۹۰۷ء کے بعد تمام سیاسی پارٹیاں ان کی نظر میں غلط راستہ پر چل رہی تھیں۔ اردوے معلیٰ نومبر ۱۹۰۹ء کے ایک شذرہ سے ان کے خیالات کا اندازہ ہوتا ہے۔ لکھا ہے:

''پالیٹکس میں ہم مقتدائے وطن پرستان مسٹر تلک اور سرگروہ احرار بابو آر بندو گھوش کی پیروی کو اپنے اوپر لازم سمجھتے ہیں چنانچہ اس حیثیت سے ''فیروز شاہی کانگریس'' سے ہم کو اتنی ہی بیزاری ہے جتنی ''امیری لیگ'' یا ''نوزائیدہ چندی کانفرنس'' سے اور ہمارے خیال میں یہ بیزاری بالکل حق جانب ہے''۔

ان بیانات سے دو حقیقتیں واضح ہوتی ہیں ایک یہ کہ حسرت کے آگرہ اجلاس میں شریک رہنے کی توثیق کسی مستند حوالہ سے نہیں ہوتی۔ دوسری یہ کہ وہ تمام سیاسی پارٹیوں سے بدظن تھے۔ کانگریس سے ان کی بدظنی آخر وقت تک رہی۔ مسلم لیگ سے بدظنی کب دور ہوئی، تحقیق کے لیے ایک سوال تھا۔ میں نے سوچا کہ مسلم لیگ کے فائلوں میں حقیقت تلاش کی جائے۔ مسلم لیگ کی سالانہ رپورٹوں میں پہلی بار ان کا نام ۱۹۱۵ء کی رپورٹ میں ہے۔ انہوں نے اس سال بمبئی میں منعقدہ اجلاس میں بطور ڈیلی گیٹ شرکت کی تھی، گویا وہ ۱۹۱۵ء یا اس سے قبل کسی سال میں مسلم لیگ کے رکن بنے تھے۔ خیال ہوا کہ مسلم لیگ نے ۱۹۱۲ء میں اپنے اغراض و مقاصد Creed میں حصول سیلف گورنمنٹ کو شامل کیا تھا اور اسی سال ہندوستانی رہنماؤں نے لندن کی مسلم لیگ سے بغاوت کر کے جسٹس امیر علی سے گلوخلاصی کی مہم شروع کی تھی۔ اس مہم کے سربراہ سید وزیر حسن اور مولانا محمد علی جوہر تھے۔ خیال تھا ان وجوہ کی بنا پر حسرت نے ۱۹۱۲ اور ۱۹۱۵ء کے درمیان کسی وقت مسلم لیگ کی رکنیت اختیار کی ہوگی۔ اس کے لیے میں نے مسلم لیگ کے محفوظ فائلوں کا ایک ایک صفحہ دیکھا۔ میری خاص توجہ ان فائلوں کی طرف رہی جس میں رکنیت کی درخواستیں اور چندہ دینے کی صورت میں رسید کے مثنیٰ تھے۔ ہم نے دیکھا کہ ۱۹۱۳ء تک کے رکنیت کے فارم اردو ٹائپ میں چھپے ہوئے تھے بعد میں اردو کی جگہ انگریزی نے لے لی تھی۔ ایسا بھی دیکھنے میں آیا کہ جن حضرات کو چھپے ہوئے فارم نہ مل سکے انہوں نے اپنے قلم سے فارم کے مفہوم کے مطابق درخواست دی تھی۔ کئی فائلوں کی ورق گردانی کے بعد ہمیں حسرت موہانی کی درخواست رکنیت فائل نمبر ۲۷ بابت ۱۹۱۵ء میں صفحہ ۸۵ پر ملی۔ یہ ان کے خط میں گہرے آسمانی رنگ کے لیٹر پیڈ پر لکھی ہوئی ہے۔ درخواست کی عبارت من وعن لیگ کے فارم کی نہیں ہے۔ انہوں نے اپنے الفاظ میں اس کا مفہوم ادا کیا تھا۔

''بخدمت شریف جناب سیکرٹری صاحب آل انڈیا مسلم لیگ،

جناب عالی! ازراہ کرم میرا نام ممبری آل انڈیا مسلم لیگ کے لیے جلسہ کونسل لیگ میں پیش کر دیجئے اور اگر میں منتخب ہو جاؤں تو اس کی اطلاع مجھ کو جلسہ سالانہ لیگ سے قبل روانہ فرما دی جائے۔ میں بھی جلسہ میں شریک ہو سکوں۔

حسب دفعہ نمبر ۴ قانون اساسی لیگ میں اقرار کرتا ہوں کہ مجھ کو لیگ کے اغراض و مقاصد اور دفعہ ۲ قانون مذکور سے اتفاق ہے۔

فقط خاکسار سید فضل الحسن موہانی بی۔اے
مینجر سدیشی اسٹور، علی گڑھ

اطلاع انتخاب آنے پر فیس داخلہ ممبر شپ مع فیس سالانہ حاضر کروں گا۔''

حسرت نے درخواست پر تاریخ درج نہیں کی ہے۔ ان کی تحریر کے نیچے محرک نے اپنے قلم سے لکھا ہے:

''میں تحریک کرتا ہوں کہ مسٹر حسرت موہانی آل انڈیا مسلم لیگ کے ممبر بنائے جائیں''۔

اسی کے ساتھ اردو میں دستخط ہے اور نام صاف پڑھا جاتا ہے ''خواجہ عبدالحمید۔ ۲۸ نومبر ۱۹۱۵ء''۔

درخواست کے اوپری حصے میں بائیں جانب انگریزی میں لکھا ہوا ہے:

**Seconded by Ghulam Husain**

غالباً یہ راجہ غلام حسین ہی ہیں جو ۱۹۰۷ء میں علی گڑھ کالج سے نکالے گئے تھے۔ مسلم لیگ کے سرگرم رکن تھے۔ پہلے مولانا محمد علی کے انگریزی اخبار سے منسلک رہے بعد میں لکھنو کے اخبار New Era سے وابستہ رہے۔ وہیں ایک حادثہ میں ان کی موت واقع ہوئی تھی۔ درخواست کی عبارت سے دو باتیں واضح ہو جاتی ہیں ایک یہ کہ ۲۸ نومبر ۱۹۱۵ء تک حسرت مسلم لیگ کے رکن نہیں بنے تھے دوسرے وہ رکنیت حاصل کیے بغیر اجلاس میں شریک ہونے کو مناسب نہیں سمجھتے تھے۔ اس لیے آگرہ اجلاس میں ان کی شرکت خارج از بحث ہو جاتی ہے۔

حسرت کی لیگ میں شمولیت کے بارے میں بھی سابق میں غلط اطلاعات فراہم کی جاتی رہی ہیں۔ مثلاً جمال میاں فرنگی محل نے بتلایا ہے کہ ''وہ جناح صاحب سے پرانے مسلم لیگی تھے'' (مضمون ''رئیس الاحرار مولانا حسرت موہانی'' مشمولہ نگار لکھنو حسرت نمبر، صفحہ ۸۸) اور جلیل قدوائی نے اطلاع دی ہے کہ ''۱۹۳۶ء میں آپ باقاعدہ مسلم لیگ میں شامل ہو گئے''۔ (مقدمہ انتخاب حسرت: صفحہ ۱۱۷)۔

مسلم لیگ کی فائلوں کی ورق گردانی کے دوران ہمیں قائداعظم محمد علی جناح اور مولانا ابوالکلام آزاد کی رکنیت کے فارم درخواست بھی دیکھنے کو ملے یہ Membership & Subscription Volume 225 (1913) میں ہیں۔

دونوں درخواستیں لیگ کے مقررہ اردو فارم پر ہیں۔ مولانا آزاد نے واضح طور پر دستخط کی جگہ ''ابوالکلام آزاد دہلوی'' لکھا ہے۔ اس پر تاریخ ۱۰ نومبر ۱۹۱۳ء ہے۔ قائداعظم نے فارم پر اپنے معروف انداز میں دستخط کیے ہیں۔ اس پر ۲۰ دسمبر ۱۹۱۳ء درج ہے۔ ان تفصیلات سے واضح ہو جاتا ہے کہ ''حسرت، جناح صاحب سے پرانے مسلم لیگی نہیں تھے'' البتہ ''مولانا ابوالکلام آزاد، جناح صاحب سے دس روز پرانے مسلم لیگی تھے''۔ یہ ثابت ہو جانے کے بعد کہ حسرت نے ۱۹۱۵ء میں مسلم لیگ میں شمولیت اختیار کی۔ جلیل قدوائی کا بیان غلط ثابت ہو جاتا ہے انہیں شاید یہ بھی یاد نہیں رہا کہ حسرت مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس منعقدہ احمد آباد ۱۹۲۱ء کی صدارت بھی کر چکے تھے۔

اس چھان بین کے دوران اور چند باتیں جن کا علم ہوا ان کا اظہار غیر ضروری نہیں ہوگا۔ مسلم لیگ کی جانب سے دسمبر ۱۹۱۶ء میں تمام اراکین کی مکمل فہرست صوبہ داری تقسیم کے ساتھ چھاپی تھی جو جہازی سائز کے ۱۹ صفحات پر مشتمل ہے۔ یہ فہرست Membership & Subscription Vol. 254 (1916) میں ہے ہر صوبہ کے اراکین کے نام انگریزی میں حروف تہجی میں ہیں Members of United provinces of Agra & Oudh کے نام چھ صفحات پر پھیلے ہوئے ہیں۔ اس کے تیسرے صفحے پر حسرت موہانی بی۔ اے، علی گڑھ کا نام ہے جو سلسلہ میں ۷۳ واں نمبر ہے۔ صفحہ ۱۳ پر اراکین بنگال میں ابوالکلام آزاد، ایڈیٹر الہلال کلکتہ اور صفحہ ۱۷ پر اراکین بمبئی میں ''ایم اے جناح آنریبل، مسٹر، بار ایٹ لاء، بمبئی ایم۔ سی درج ہے۔ (اس فہرست میں بھی مولانا سید سلیمان ندوی کا نام نہیں ہے)

## مسلم لیگ اجلاس منعقدہ بمبئی ۱۹۱۵ء میں کیا حسرت نے گڑبڑ کی تھی؟

حسرت موہانی نے مسلم لیگ میں شمولیت کے بعد اس کے سالانہ اجلاس منعقدہ بمبئی ۱۹۱۵ء میں پہلی بار شرکت کی۔ اجلاس کی صدارت بیرسٹر مظہر الحق کر رہے تھے۔ اجلاس کی کارروائی کے دوران حسرت تقریر کرنے کھڑے ہوئے۔ ابھی انہوں نے اتنا ہی کہا تھا ''صاحب صدر، ہمیں آپ پر کامل اعتماد ہے'' کہ جلسہ میں ہلڑ مچ گئی۔ شور وغل کے دوران کرسیاں اچھالی گئیں۔ ہنگامہ اتنا بڑھ گیا مسلم لیگ کارکنوں کا امن بحال کرنا ممکن نہ رہا اور اجلاس کو ملتوی کرنا پڑا۔ اس ہنگامہ آرائی کی ذمہ داری تمام مورخین حتیٰ کہ Freedom at midnight کے مصنف نے حسرت پر ڈالی ہے۔ اس کی کوئی معقول وجہ کسی نے نہیں بتلائی وہ لیگ میں نئے نئے شریک ہوئے تھے۔ ان کا کسی لیڈر یا صدر اجلاس سے کوئی اختلاف نہ تھا۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ ان کے پاس ہلڑ بازی کے لیے کرائے کے لوگوں کو حاصل کرنے کے لیے مال نہ تھا۔ ایسی حرکتیں صاحب اختیار یا ناجائز دولت حاصل کرنے والے کرتے ہیں۔ حسرت میں یہ باتیں کبھی نہ رہیں۔ تاریخ مسلم لیگ میں لکھا ہے کہ اس وقت لیگ دو گروہوں میں بٹی ہوئی تھی ایک گروہ امیر علی کا حمایتی تھا دوسرا نوجوانوں کا گروہ تھا۔ یہ اجلاس نوجوانوں کا بلایا ہوا تھا جنہوں نے امیر علی سے لیگ کا اقتدار چھینا تھا اس وجہ سے امیر علی کے حامیوں نے یہ حرکت کی اور الزام حسرت کے سر تھوپا۔ اس قسم کی گڑبڑ کی توقع اجلاس سے قبل ہی کی جا رہی تھی اور اس کی اطلاع پولیس کے ذمہ دار افراد کو دی جا چکی تھی کہ وہ گڑبڑ نہ ہونے دیں مگر پولیس اپنی ذمہ داری نبھانے میں ناکام رہی اور ہلڑ بازی کر کے جلسہ کو درہم برہم کرنے کے جرم میں کسی کے خلاف کارروائی بھی نہیں کی گئی۔

لیگ کا ملتوی شدہ اجلاس دوسرے روز ایک مقامی ہوٹل میں ہوا۔ اس میں بھی حسرت نے شرکت کی وہاں انہوں نے نہ کوئی گڑبڑ کی اور نہ حاضرین نے گزشتہ روز کی ہنگامہ آرائی کا ذمہ داران کو قرار دے کر باز پرس کی۔

## حسرت موہانی کی چوتھی بار گرفتاری۔ حقیقت یا افسانہ؟

ہم نے حسرت موہانی کی سوانح عمری کا جو مطالعہ کیا ہے اس سے ثابت ہے کہ انہوں نے ۳ بار قید فرنگ کی صعوبتیں جھیلیں۔ پہلی بار ۲۳ جون ۱۹۰۸ء کو گرفتار کیے گئے۔ ۳ر جولائی ۱۹۰۹ء کو رہا ہوئے۔ دوسری بار ۱۳ر اپریل ۱۹۱۶ء کو گرفتار کیے گئے ۲۲ مئی ۱۹۱۸ء کو رہا ہوئے۔ رہائی کے بعد عائد پابندی کے تحت اواخر دسمبر ۱۹۱۸ء تک اپنے گھر (علی گڑھ) نہیں آئے۔ تیسری بار ۴ر اپریل ۱۹۲۲ء کو گرفتار کیے گئے۔ ۱۳ر اگست ۱۹۲۴ء کو رہا ہوئے۔

حسرت ان کے علاوہ کبھی دار و رسن کی آزمائش سے گزرے ہوں اس کی کوئی مصدقہ اطلاع نہیں ہے۔ ایک گرفتاری کے بارے میں غلام احمد فرقت واحد راوی ہیں۔ اس گرفتاری کی خبر اخبار میں نہیں چھپی۔ کسی سوانح نگار نے اس کا حوالہ نہیں دیا۔ حسرت ان کے لواحقین نے اس بارے میں کچھ نہیں بتلایا۔ غلام احمد فرقت اس گرفتاری کی تفصیل بتلاتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''۱۹۳۰ء میں جب کانگرس نے انفرادی ستیہ گرہ کی تحریک کی اور لکھنو میں گرفتاریوں کا سلسلہ شروع ہوا تو بھلا یہ کیسے ممکن تھا کہ مولانا جیل نہ جاتے۔ امین الدولہ پارک میں شام کے وقت پارک کے دونوں طرف جیل کی لاریاں کھڑی رہتی تھیں۔ پارک میں کانگریسی لیڈر حکومت کے خلاف تقریریں کرتے اور لاریاں ان کو بھر بھر کر حوالات پہنچا آتیں۔ اس زمانہ میں امین الدولہ پارک ایسا بارونق نہ تھا جیسا کہ اب ہے بلکہ اس میں بڑی بڑی گھاس اگی ہوئی تھی۔ مولانا پارک میں گرفتار ہوئے اور جس وقت گرفتار ہونے جا رہے تھے اس وقت راقم الحروف وہاں موجود تھا۔ مولانا اپنی تقریر ختم کر کے جوں ہی اترے سپاہی ان کو پکڑنے کے لیے لپکے۔ پہلے تو مولانا نے سپاہیوں کو ایک طرح کی جھکائی دی اور اس کے بعد یک دم زمین پر اوندھے لیٹ گئے اور گھاس پکڑ لی۔ اب عالم یہ تھا کہ ایک طرف تو دو سپاہی مولانا کو اوپر کی طرف کھینچ رہے تھے اور دوسری طرف مولانا تھے کہ گوہ کی طرح زمین پکڑے ہوئے تھے۔ آخر میں تین سپاہیوں نے زور لگا کر جو مولانا کو پوری طاقت سے کھینچا تو جڑ سمیت مولانا اکھڑ آئے اور سپاہیوں نے مولانا کو پارک کے باہر لاری کے دروازہ تک گود میں لاد کر اس بے دردی سے لاری میں ٹھونس دیا جس طرح انجن میں کوئلہ جھونکا جاتا ہے۔ مولانا نے نون غنہ کے ساتھ انقلاب زندہ باد کا نعرہ لگایا اور راستے بھر نعرے لگاتے لاری پر جیل روانہ ہو گئے''۔ (غلام احمد فرقت کاکوروی: مضمون ''مولانا حسرت موہانی کے لطائف، مشمولہ رسالہ آج کل دہلی: دسمبر ۱۹۵۵ء، ص ۴۴)

فرقت ایک مزاح نگار اور لطیفہ باز بھی ہیں۔ انہوں نے محولہ بالا واقعہ بطور لطیفہ بیان کیا ہے لیکن بعض لوگوں نے ''شوق نام آوری'' میں اسے تاریخی واقعہ باور کر لیا اور تحقیق کا کارنامہ قرار دے کر بار بار دہرایا ہے۔ فرقت کے شوخی بیان کو کیا کہیے کہ ''مولانا جڑ سمیت اکھڑ گئے'' جیسے فصیح جملہ ان کے معیار فکر و فن کے غماز ہیں۔

اس لطیفہ کو تاریخ کی کسوٹی پر پرکھ کر دیکھیے۔ مولانا ۱۹۰۷ء سے کانگریس سے بیزار ہو چکے تھے اس کی انتہا ۱۹۲۱ء میں ہوئی جب احمد آباد کے سیاسی اجتماعات میں انہوں نے کانگریس، لیگ اور خلافت کے جلسوں میں ''آزادیٔ کامل'' کی قرارداد پیش کی جس کی شدید ترین مخالفت کانگریس کے لیڈر گاندھی جی نے کی۔ ان کی مخالفت کی وجہ سے قرارداد منظور نہ ہو سکی۔ اس کے بعد حسرت گرفتار ہو گئے۔ ۱۹۲۴ء میں انہوں نے کانگریس سے باقاعدہ علیحدگی اختیار کر لی۔ اس کے بعد وہ کبھی بھی کانگریس کے 'پلیٹ

فارم پر نظر آئے اور نہ اس کی کسی تحریک کی تائید کی۔

اب ذرا ستیہ گرہ کی تاریخ پر روشنی ڈالیے۔ حسرت کی آزادی کامل کی قرارداد ۱۹۲۱ء میں مسترد کروانے کا سہرہ گاندھی جی کے سر ہے۔ انہوں نے ہی ۱۹۲۹ء میں کانگریس کے لاہور اجلاس میں ویسی ہی قرارداد پیش کر کے منظور کروائی۔ اسی اجلاس میں ۲۶ جنوری کو یوم آزادی قرار دیا گیا اور حصول آزادی کی خاطر ستیہ گری کا آغاز ہوا۔ حسرت کسی حد تک اس ستیہ گرہ کے حامی تھے۔ اس کا اندازہ ان کی اس وقت کی تحریروں سے ہوتا ہے واضح رہے کہ اس زمانہ میں وہ اخبار ''مستقل'' نکالتے تھے۔ ان کے سیاسی خیالات کا یہی اخبار ترجمان تھا۔ قرارداد آزادی کے بارے میں انہوں نے اخبار مستقل کے اداریہ میں لکھا:

''خرابی بسیار کے بعد آخر خود مہاتما گاندھی کی جانب سے آزادی کامل کی تجویز لاہور کانگرس میں پیش ہو کر پاس ہو گئی مگر تعجب ہے کہ ایسی اہم قرارداد کے منظور ہونے پر نہ حکومت کی جانب سے کسی قسم کا اندیشہ و اضطراب کا اظہار ہوتا ہے اور نہ جمہور کی طرف سے کسی جوش و خروش یا عزم بالجزم کا اعلان!''۔

''لوگ اس بدگمانی میں حق بجانب ہوں یا نہ ہوں اتنا تو ہم کو بھی شبہ ہوتا ہے کہ آزادی کامل کے ایک سخت ترین دشمن کی جانب سے مکمل آزادی کی حمایت میں کوئی راز ہے''۔ (بحوالہ ''مقالات حسرت مرتبہ اشتیاق اظہر: مطبوعہ کراچی ۱۹۸۵ء، صفحات ۲۵، ۲۶)

اس سے زیادہ سخت الفاظ میں کانگریس اور کانگریس میں منظور ہونے والی قرارداد کی مذمت ممکن نہیں جسے اساس سے اختلاف ہو کیا وہ اس کے تحت ہونے والے عمل کا حامی ہو سکتا ہے؟

وہ آزادی کی تحریک کے لیے شرط لگاتے ہیں کہ پہلے مسلمانوں کے حقوق تسلیم کیے جائیں۔ ان کی ضمانت دی جائے تب ہی مسلمان ایسی کسی تحریک میں حصہ لے سکتے ہیں چنانچہ انہوں نے لکھا:

ان کا سیاسی موقف مسلمانوں کے حقوق کا فوری تصفیہ ہونا تھا۔

''جب تک اقوام ہند کے درمیان تصفیہ حقوق کا معاملہ باہمی رضامندی کے ساتھ طے نہ ہو جائے گا اس وقت تک کانگریس کے اعلان آزادی سے بھی مسلمانوں کے دل سے بدگمانی دور نہ ہوگی''۔ (اداریہ اخبار مستقل: ۱۶ جنوری ۱۹۳۰ء، بحوالہ مقالات حسرت: صفحہ ۳۱)

انہوں نے مسلمانوں کو مشورہ دیا تھا کہ:

''مسلمانوں کا صحیح مسلک یہ ہونا چاہیے کہ وہ جہاں آزادی کامل کی پوری اور دل سے تائید کرتے رہے ہیں مسلم حقوق خصوصی کے تحفظ کو بھی کسی حالت میں نظر انداز نہ کریں''۔ (ایضاً صفحہ ۳۷)

انہوں نے کانگریس سے خواہش کی کہ:

''ہمارا اب بھی عقیدہ ہے کہ ارباب کانگریس کے لیے بہتر ہے کہ تصفیہ حقوق کے ذریعہ مسلمانوں کے دل سے رہی سہی بدگمانی کو کم سے کم اپنی طرف سے دور کریں''۔ ایضاً ص ۴۱)

حسرت کا موقف دراصل مسلم لیگ کا موقف تھا۔ کانگریس نے لیگ یا حسرت کی باتوں پر ذرا بھی دھیان نہ دیا یہاں تک کہ جب آزادی کی خاطر ستیہ گرہ شروع کی گئی تو کسی بھی کانگریسی لیڈر نے خصوصیت سے مسلمانوں کو شریک ہونے کو نہیں کہا اور نہ مسلمان زعما سے تعاون کا رابطہ پیدا کیا۔ اس کی وجہ سے مسلمانوں میں کانگریس کی طرف سے شکوک بڑھے اور یہ سمجھا جانے لگا کہ کانگریس کو مسلمانوں کے تعاون کی ضرورت ہی نہیں ہے اس لیے حسرت نے مسلمانوں کو مشورہ دیا:

''مسلمانوں کے حقوق کے بارے میں جب تک تفصیلی سمجھوتہ نہ ہو جائے اس وقت تک کانگریس کی ہر تحریک سے علیحدہ رہنا چاہیے''۔ (اداریہ مستقل: ۲۰ مئی ۱۹۳۰ بحوالہ مذکورہ: ص ۷۶)

''تحریک سول نافرمانی کی تمام کارروائی جس میں خلاف ورزی قوانین اور قید و بند کی زحمت کشی لازم آتی ہے مسلمان بطور احتجاج کوئی حصہ نہ لیں مگر اس کی مخالفت بھی نہ کریں''۔

(اداریہ مستقل ۶ مئی ۱۹۳۰ء حوالہ مذکورہ: صفحہ ۷۲)

حسرت کے کہنے کے مطابق مسلمانان یوپی کے بعد مسلمانوں نے برائے نام ہی تحریک میں حصہ لیا۔ زیادہ تر لوگ بے تعلق رہے اس صورت حال کی وضاحت کرتے ہوئے انہوں نے لکھا:

''آزادی ہند کی جو تحریک ہندوستان کے بڑے بڑے شہروں کی طرح کانپور میں بھی بخوبی جاری ہو چکی ہے۔ اس میں چند قابل احترام مستثنیات کے سوا اس وقت تک مسلمانان کانپور نے من حیث القوم کوئی حصہ نہ لیا۔ ہم نے بھی تامل کیا اور کیوں نہ کرتے جب کہ خود ہم اس بات کو محسوس کرتے رہے اور اب بھی کرتے ہیں کہ ہنود کانپور نے جمہور مسلمین کے ساتھ مفاہمت یا مصالحت کی نہ کبھی کوشش کی نہ اس کی ضرورت سمجھی! ظاہر ہے اسی حالت میں اگر مسلمانوں کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا تو کچھ بے جا نہیں ہوا کہ برادران وطن کو بظاہر ہماری پروا ہے نہ ضرورت تو پھر خواہ مخواہ قید و بند یا زحمت و کشمکش کے جھگڑوں میں پڑنے کے بجائے ہمارے لیے بہتر ہے کہ اس تحریک سے علیحدہ اور غیر جانبدار کی طرح تماشائی بنے رہیں''۔ (اداریہ مستقل، ۲۶ مئی ۱۹۳۰، حوالہ مذکورہ: صفحہ ۷۰، ۷۱)

ان تمام تحریروں سے واضح ہے کہ حسرت مسلمانوں کے ستیہ گرہ میں شریک ہونے کے حق میں نہیں تھے۔ وہ اپنے قول کے سچے اور پکے تھے۔ وہ ان سیاست دانوں میں نہیں تھے جو عوام سے کچھ کہیں اور عمل اس کے برخلاف کریں۔ ان تحریروں کی روشنی میں غلام احمد فرقت کا بیان من گھڑت اور حسرت کے حق میں بہتان ہے۔

## حسرت اور فن زرگری:

بعض اہل قلم اپنے مفروضہ خیالات اور رجحانات کے اسیر ہوتے ہیں۔ ان سے باہر نکلنا ان کے لیے ممکن نہیں ہوتا اور وہ دوسروں کو اپنی پوشیدہ خواہشات کی ترازو میں تولنا ہی انصاف پسندی سمجھتے ہیں۔ وہ حسرت کی تعریف کرتے ہوئے ایسا جملہ لگا دیتے ہیں جس سے حسرت کی توہین مقصود ہوتی ہے۔ اس طرح ان کی توہین کر کے وہ اپنی ''انا'' کی تسکین کر لیتے ہیں۔

حسرت موہانی کی حق پرستی، خلوص نیت اور اظہار صداقت کی بے باکی کی دنیا قائل ہے۔ سب جانتے ہیں وہ فقیر مزاج تھے ہر حال میں صبر و شکر سے کام لیا۔ وہ حصول دنیا کے کبھی خواہاں نہیں رہے۔ دولت کی ان کے مقاصد حیات میں کہیں جگہ نہ تھی۔ مولانا عبدالمالک اردی نے ان کی تعریف میں لکھا:

''ان کی سیاست میں ایک پناہ خلوص، ایک سرفروشانہ عزم اور ایک مجاہدانہ عظمت ملتی ہے۔ وہ ایک صاف گو نقاد، ایک متین شاعر، اور ایک بے ریا سیاست دان تھے''۔

اس قدر لکھنے کے بعد اپنی ناکامی کا داغ حسرت کی پیشانی پر لگا کر اپنی تسکین کی خاطر لکھا:

''یہی وجہ ہے کہ جہاں تک فن زرگری کا تعلق ہے وہ ہمیشہ ناکام رہے'' (عبدالمالک آروی: مضمون حسرت کا عزم امور: مشمولہ رسالہ نگار لکھنو: حسرت نمبر صفحہ ۱۱۹)

کسی فن میں ناکام وہ ہوتا ہے جب اس نے فن کو آزمایا ہو۔ مضمون نگار ان واقعات اور حالات کا ذکر بھی فرما دیتے جہاں حسرت نے دولت کمانے کی کوشش کی ہو اور ناکام رہے ہوں؟ جسے فن زرگری آتا ہی نہ ہو اور جس نے یہ ہنر آزمایا ہی نہ ہو اس پر الزام ناکامی بہتان کے سوا کیا ہے!

## حسرت ناکام سیاست دان!

ظ۔ انصاری بھی حسرت موہانی کے خلوص کے قائل ہیں، لیکن اپنے سوا کسی کو کچھ نہ سمجھنے کے مرض میں مبتلا ہیں۔ حسرت کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''حسرت مخلص انسان تھے۔ ان کے خلوص سے انکار نہیں کیا جا سکتا مگر سیاست کی دنیا میں صرف خلوص سے کام نہیں چلتا بلکہ سچ پوچھیے تو سیاست میں حد سے زیادہ خلوص نقصان دہ ہوتا ہے۔ یہی ہوا کہ خلوص کے باوجود حسرت کو میدان سیاست میں ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔'' (ظ۔ انصاری) بحوالہ کتاب حسرت موہانی، حیات اور کارنامے از احمر لاری: مطبوعہ گورکھ پور ۱۹۷۳: صفحہ ۱۸۸)

معلوم نہیں احمر لاری نے ظ۔ انصاری کے بیان کو سمجھ کر نقل کیا ہے یا ان کے نام اور شہرت سے مرعوب ہو کر! ظ۔ انصاری کے بیان کے دونوں حصے ان کے انتشار ذہنی کے ترجمان ہیں۔ ''سیاست میں حد سے زیادہ خلوص نقصان دہ ہوتا ہے'' انہوں نے پرنس (میکاولی) میں پڑھا ہے یا ارتھ شاستر میں اور اس پر بغیر سوچے سمجھے یہاں لے آئے ہیں۔ دوسرے حصے میں وضع نہیں کہ حسرت کو کب اور کس میدان سیاست میں ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔

عبدالمالک آروی اور ظ۔ انصاری ان دانش وروں میں جن کی دانش وری صرف فقرہ بازی پر منحصر ہے جن کا حقائق سے کوئی تعلق نہیں۔

## ناکام سیاست دان ہونے کی دلیل:

ڈاکٹر احمر لاری بھی حسرت موہانی کو ناکام سیاست دان بتلاتے ہیں کیونکہ ان کا مزاج سیاست سے مناسبت نہیں رکھتا تھا۔ احمر لاری اصول سیاست اور حسرت کے طرز عمل کے بارے میں لکھتے ہیں:

''حسرت نے کم و بیش اپنی زندگی کے پچاس سال سیاسی جد و جہد میں گزارے اس کے باوجود کہنا پڑتا ہے ان کی طبیعت کو سیاست سے زیادہ مناسبت نہ تھی۔ سیاست میں حالات کے تحت کبھی آگے بڑھنا پڑتا ہے اور کبھی پیچھے ہٹنا۔ سیاست اور مصلحت کا چولی دامن کا ساتھ ہے''۔ (ڈاکٹر احمر لاری کتاب ''حسرت موہانی، حیات اور کارنامے: حوالہ مذکورہ: صفحہ ۱۸۸)

احمر لاری نے اصول پسندی اور موقع پرستی میں حد فاصل قائم نہیں کی ہے، وہ موقع پرستی کے قائل معلوم ہوتے ہیں اور اس کو سیاست سمجھتے ہیں۔ یہ بات اصول کی نہیں، برصغیر کے سیاست دانوں کے طریق عمل کی ہے۔ ہر انسان کو اپنے شریفانہ اور مہذب اصولوں پر قائم رہنے کا حق ہے۔ اگر کوئی شرافت کی سیاست کو اپناتا ہے تو اس پر تنقید کوئی جواز نہیں رکھتی۔ حسرت ایک اصول پسند سیاست دان تھے انہوں نے نفع و نقصان کی پروا کیے بغیر سیاست کی، یہی ان کی عظمت کی دلیل ہے۔ برصغیر کے سیاست دانوں میں اس قدر سختی سے اپنے اصولوں پر قائم رہنے والے سیاست دانوں میں مشکل سے، چار نام ہی ملیں گے۔ ان پر طعن کرنا زیب نہیں دیتا۔ وہ تو قابل صد ہزار ستائش ہیں کہ ہزاروں بروں میں انہوں نے اچھے ہونے کی مثال قائم کی۔ مرد مومن وہ نہیں جو دوسروں کے کردار کو اپنائے۔ مرد مومن وہ ہوتا ہے جو اپنا بلند کردار خود منوائے۔ حسرت ''مصلحت وقت'' کے خلاف رہے اس میں کبھی لچک نہیں پیدا کی۔ اس لیے کہا ہے:

لگا دو آگ عذر مصلحت کو — کہ ہے بیزار اس شے سے مرا دل

اپنے وقت کے سیاسی چلن کو دیکھتے ہوئے مصلحت پسندوں کو پیشوا نہ ماننے کی تلقین کی ہے۔

حق سے یہ مصلحت وقت جو کرے گریز — اس کو نہ پیشوا سمجھ، اس پہ نہ اعتبار کر

وہ اپنے دل کا حال یہ بیان کرتے ہیں:

غلط ہے قول مصلحت کوش — نہ اس جانب کرے گا اعتنا دل
توانائے صداقت ہے تو ہرگز — نہ ہو گا پیرو باطل مرا دل

جس میں صداقت کی توانائی ہوتی ہے وہ وقت کا غلام نہیں ہوتا، وقت پر حکمران ہوتا ہے اور اپنی صداقت کی عظمت کے نشان چھوڑتا ہے۔

ڈاکٹر احمر لاری کے بیانات ایک دوسرے کی ضد معلوم ہوتے ہیں۔ وہ تسلیم کرتے ہیں کہ ''حسرت ایک واضح سیاسی نصب العین رکھتے تھے'' (حوالہ مذکورہ: صفحہ ۱۹۱) اور ساتھ ہی الزام بھی لگاتے ہیں کہ ''حسرت کی ایک کمزوری جذباتیت بھی تھی۔ اسی جذباتیت کے سبب حسرت بار بار پارٹیاں بدلتے تھے (حوالہ مذکورہ: صفحہ ۱۸۹) حسرت پر جذباتی ہونے کا الزام ڈاکٹر احمر لاری ہی نہیں لگاتا سطحی سوچ رکھنے والے تمام اہل قلم کا رویہ یہی ہے۔ وہ فرق نہیں کر پاتے جذباتی اور اپنے رائے پر شدت پر قائم رہنے والے کے درمیان! حسرت جذباتی نہیں تھے انہوں نے جب سیاست میں پہلا قدم رکھا اس وقت اپنا نصب العین مقرر کر لیا تھا۔ اس میں ''آزادی کامل'' کو فوقیت حاصل تھی۔ وہ اس نصب العین کے لیے لڑتے رہے جس پارٹی سے حصول مقصد کی عملی تائید کا گمان ہوتا اس میں شمولیت اختیار کرتے اور اگر پارٹی ان کی توقعات پر پوری نہیں اترتی تو وہ اسے چھوڑ دیتے۔ ان کی نظر میں اہمیت پارٹیوں کی نہیں تھی نصب العین کی تھی۔ اس سے انہوں نے سر مو ہٹنا گوارہ نہیں کیا۔ وہ اپنے موقف پر ڈٹے رہتے اور پارٹی کو خاطر میں نہ لاتے۔ خلافت کے ایک جلسہ میں ان کی اس خصوصیت کے اظہار پر گاندھی جی نے بھی کہا تھا:

''مولانا حسرت موہانی اس جلسہ میں (خلافت کے جلسہ میں) شریک تھے انہیں میں پہلے سے جانتا تھا مگر اس کانفرنس میں معلوم ہوا کہ وہ کس غضب کے لڑنے والے ہیں۔ مجھ میں اور ان میں ابتدا سے اختلاف رائے تھا اور بعض مسئلوں پر اب تک ہے''۔ (گاندھی جی: تلاش حق (جلد دوم) ترجمہ ڈاکٹر سید عابد حسین: مکتبہ جامعہ دہلی: چوتھا ایڈیشن: ۱۹۸۵: صفحہ ۲۲)

گاندھی جی نے حسرت کو درست سمجھا۔ وہ جذباتی نہیں تھے مگر اپنے موقف پر غضب کے لڑنے والے تھے۔ ایسا وہی کر سکتا ہے جس کو اپنے موقف کی صداقت کا یقین ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ پارٹی سے وفاداری کے قائل نہ تھے ان کی وفاداری ان کے مقاصد سے تھی۔ اس معاملہ میں مجنوں گورکھ پوری کا تجزیہ درست ہے کہ:

''حسرت کا مسلک دراصل کانگریس اور مسلم لیگ دونوں سے الگ رہا۔ وہ خود ہندوستان کی ہر سیاسی

جماعت کے گرم سے گرم فرقے سے بھی زیادہ گرم تھے''۔ مجنوں گورکھ پوری: مضمون ''حسرت موہانی۔
مشمولہ رسالہ آج کل: حسرت نمبر، مئی ۱۹۸۵ء، ص۲۲)

مجنوں گورکھ پوری نے حسرت کے رویہ کی مزید وضاحت اس طرح کی ہے۔

''حسرت نے سیاسی جماعتوں کی اعتدال پسندی یعنی بزدلی سے واقف تھے اور ان بزدلوں کو سمجھاتے رہتا اور ان کی مخالفت کرتے رہنا وہ ہر لحاظ سے اپنا فرض سمجھتے تھے۔ اس لیے انہوں نے کبھی ان جماعتوں میں کوئی جماعت کسی حد تک ان کے اپنے نصب العین کے قریب آتی دکھائی دی وہ اس کے ساتھ ہو لیے''۔

(حوالہ مذکور: صفحہ ۲۵)

حسرت اپنے دور کے سیاست دانوں سے اسی لیے نالاں تھے کہ وہ حسرت کی تیز روئی کا ساتھ دینے کو تیار نہ تھے۔ اس کا اظہار اس شعر میں کیا ہے۔

اپنا سا شوق اوروں میں لائیں کہاں سے ہم　　گھبرا گئے ہیں بے دلی مہرباں سے ہم

## ڈاکٹر احمر لاری کی تضاد بیانی:

برصغیر میں تحریک آزادی کے دوران ایک اصطلاح ''قوم پرست'' عام رہی ہے۔ اس کا اشارہ ان سیاسی رہنماؤں کی طرف ہوتا ہے جو برصغیر میں بسنے والے تمام افراد کو ایک قوم مانتے تھے۔ ان کے نظریہ کے مطابق ''ہر ملک میں ایک قوم بستی ہے''، گویا قومیت کا انحصار جغرافیائی حدود پر ہوتا۔ مذہب، نسل اور زبان کا اختلاف کوئی معنی نہیں رکھتا۔ کانگریس اس نظریے کی خالق تھی۔ ایک بڑا طبقہ اس کو مانتا تھا اور اس کی کوشش ہوتی کہ ہر بڑے آدمی کو کھینچ تان کر قوم پرست ثابت کر دے تاکہ دو قومی نظریے اور پاکستان کی نفی ہو سکے۔ احمر لاری نے یہی رویہ اختیار کیا ہے اور حسرت کو قوم پرست ثابت کرنے کی کوشش میں تضادات کے شکار ہو گئے ہیں۔ ان کا بیان ہے کہ:

''ان کی سیاست کی بنیاد دو باتوں پر قائم تھی۔ ایک ''ہندوستانی قومیت'' اور دوسری ''اتحاد اسلامی'' اور وہ دونوں کو لازم و ملزوم سمجھتے تھے۔ قوم پرست کی حیثیت سے ہندوستان کی مکمل آزادی کے علمبردار تھے اور اتحاد باہمی کے پرستار کی حیثیت سے وہ مسلمانوں کی ایک عالمی تنظیم قائم کرنا چاہتے تھے جسے وہ اسلام کا ایک ضروری جزو سمجھتے تھے۔ اس کے ساتھ ہی ہندوستانی سیاست میں وہ ہندو مسلم اتحاد کو ضروری سمجھتے تھے کیونکہ ان کے خیال میں اس کے بغیر ہندوستانی قومیت کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا''۔

(حوالہ مذکورہ صفحہ ۱۸۷)

یہ بیان وہ شخص دے سکتا ہے جس کے سامنے حسرت کی کتاب زندگی کے تمام ابواب نہ ہوں۔ یہ صحیح ہے کہ ۱۹۰۴ء میں حسرت نے سیاست میں شمولیت کے دو مقاصد ظاہر کیے تھے۔ ایک آزادی کامل اور دوسرا اتحاد بین الاقوام ہند۔ وہ نہیں مانتے تھے کہ ہندوستان کے جغرافیائی حدود میں بسنے والے تمام افراد لازماً ایک قوم ہیں اس لیے ان کو ''قوم پرست'' نہیں کہا جا سکتا۔ البتہ وہ چاہتے تھے تمام اقوام ہند اتحاد کے ذریعے سے قوم کے تصور کو پورا کریں، ان کی کوششیں بار آور نہیں ہوئیں۔ انہوں نے اپنی قوم پرستی کے حوالہ سے یہ بیان عبدالشکور کو دیا تھا:

''آزادی کامل میرا نصب العین ہے اور میں کمیونسٹ ہوں۔ پہلے نیشنلسٹ تھا لیکن ۲۵ء سے میں نے نیشنلزم کو خیرباد کہا''۔ (عبدالشکور: حوالہ مذکورہ، ص۲۲)

یہ غور کرنے کا مقام ہے کہ احمر لاری کے بیان کو درست سمجھا جائے یا حسرت موہانی کے بیان کو ان کے اپنے بارے میں صحیح باور کیا جائے!

احمر لاری ایک طرف تو یہ کہتے ہیں کہ ہندوستان میں مسلمان ایک جداگانہ قوم نہیں تھے بلکہ ہندوستانی قوم کا حصہ تھے اور دوسری طرف ان کا کہنا ہے کہ حسرت اتحاد بین المسلمین عالم کے حامی تھے اور اس کے بغیر ہندوستانی قومیت کا تصور بھی ممکن نہ تھا۔ یہ اتحاد فکر و خیال نہیں لفظی بازی گری ہے۔

## حسرت مذہب کی بنیاد پر سیاست کے خلاف تھے؟

اختر حسن حیدر آباد دکن کے ترقی پسندوں کے سرخیل سمجھے جاتے ہیں۔ انہیں امتیاز حاصل تھا کہ وہ حسرت موہانی کے بھانجے تھے۔ خیال تھا کہ ان کی نگارشات مبنی بر حقیقت ہوں گی۔ مگر انہوں نے سب سے زیادہ گمراہ کرنے کی کوشش کی۔ ان کی بیان کردہ ہر بات صداقت سے عاری ہے انہوں نے لکھا ہے:

''حسرت ہندوستان کے پہلے سیاسی رہنما ہیں جنہوں نے مذہب کو سیاست سے الگ رکھنا ضروری سمجھا۔ حسرت کی سیاسی بصیرت ان کے معاصر رہنماؤں میں کسی رہنما کے ہاں بھی نہیں پائی جاتی''۔

(اختر حسن: کتاب ''نقد و نظر'' مطبوعہ حیدر آباد دکن، ۱۹۸۴ء، ص۶۴)

یہ بیان ایسا شخص دے سکتا ہے جو آزادی کی تحریک کی تاریخ اور حسرت موہانی کی سیاست سے بالکل نابلد ہے۔ اختر حسن کو یہ نہیں معلوم کہ مسلم لیگ ایسی سیاسی جماعت تھی جو مذہب کی بنیاد پر تشکیل پائی تھی۔ حسرت ۱۹۱۵ء سے تاحیات اس کے رکن رہے۔ ۱۹۲۱ء میں مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس منعقدہ احمد آباد کی صدارت کی۔ ۱۹۳۷ء کے بعد وہ اس کے انتہائی سرگرم رہنما قرار پائے۔ اس کا اعتراف چودھری خلیق الزمان نے ''شاہراہ پاکستان'' میں کیا ہے وہ مسلم لیگ کونسل کے رکن تھے۔ انہوں نے مسلم لیگ کے ٹکٹ پر صوبائی اسمبلی اور مرکزی اسمبلی کی رکنیت کے انتخابات لڑے اور کامیاب ہوئے۔ انہوں نے جدوجہد آزادی کے لیے کانگریس کا ساتھ دینے کی مشروط پیشکش اس بنیاد پر دی تھی کہ پہلے مسلمانوں کے حقوق کی ضمانت دی جائے۔ وہ واحد مسلمان لیڈر تھے جن کو قیام پاکستان سے بہت پہلے پاکستان بننے کی بشارت ہوئی تھی۔ یہ، اور ایسی ہی تاریخی صداقتوں کو وہی شخص جھٹلا سکتا ہے جس کی معلومات نہ ہونے کے برابر ہوں۔ انہوں نے تاریخ کو مسخ کرنے کے سلسلہ میں یہ بھی لکھا ہے۔

''حسرت اور جناح (صاحب) میں بھی یہی اختلاف تھا۔ جناح (صاحب) مذہب کی بنیاد پر ایک پاکستان کی تشکیل چاہتے تھے لیکن حسرت ہندوستان کی تقسیم کے خلاف تھے۔ مذہبی بنیادوں پر سیاسی پارٹیوں کی تشکیل بھی حسرت کے لیے ناقابل قبول تھی''۔ (حوالہ مذکورہ: ص۷۶)

اس بیان کا ایک ایک لفظ تاریخی صداقتوں کے برخلاف اور گمراہ کن ہے۔

## غلط بیانیوں کا طویل سلسلہ:

اختر حسن نے حسرت موہانی سے رشتہ داری کا غلط فائدہ اٹھاتے ہوئے گمراہ کن باتیں تحریر کی ہیں۔ ہماری نظر سے ان کے تین مضامین گزرے ہیں۔ ایک مضمون رسالہ اردوئے معلی کے بارے میں ہے۔ دوسرا احمر لاری کی کتاب ''حسرت موہانی۔

حیات اور کارنامے'' پر طویل تبصرہ ہے اور تیسرا ''بیرونی شعرا حیدرآباد میں'' نامی کتاب میں شامل مضمون ہے۔ یہ مضامین کیا ہیں غلط بیانوں کا طویل سلسلہ ہے۔ اس کے ضمن میں چند بیانات کا ذکر ہو چکا اب اردوئے معلی کے بارے میں ان کی گل افشانیاں ملاحظہ ہوں۔ لکھا ہے:

''انہوں نے نیم ادبی و نیم سیاسی ماہنامہ اردوئے معلی کے نام سے جاری کیا جو ۱۹۰۳ء سے ۱۹۴۵ء تک ابتدا میں بیس سال تک علی گڑھ اور پھر کانپور سے نکلا''۔ (اختر حسن: مضمون ''حسرت موہانی، حیدرآباد میں'' مشمولہ کتاب ''بیرونی شعرا حیدرآباد میں'' مطبوعہ حیدرآباد دکن ۱۹۸۸ء، ص ۱۷۵)

اردوئے معلی ۱۹۰۳ء میں جاری ہوا۔ اپریل ۱۹۰۸ء میں ایک مضمون شائع کرنے کے جرم میں گرفتار ہوئے۔ رسالہ بند ہو گیا۔ اکتوبر ۱۹۰۹ء سے دوبارہ اجرا ہوا۔ جون ۱۹۱۳ء میں اردو پریس کی ضبطی کے بعد دوبارہ بند ہو گیا۔ جنوری ۱۹۲۵ء میں ایک بار پھر چھپنا شروع ہوا۔ مارچ ۱۹۴۲ کا شمارہ اس کا آخری شمارہ تھا۔ حسرت ۱۹۰۳ء سے ۱۹۲۰ء تک علی گڑھ میں رہے پھر کانپور منتقل ہو گئے۔

یہ ہیں حقائق ان کی روشنی میں اختر حسن نے جو کچھ لکھا محض قیاس پر مبنی ہے وہ تاریخ سے واقف ہیں اور نہ حسرت کی سوانح سے۔ اردوئے معلی کے سلسلہ میں اختر حسن نے مزید معلومات فراہم کی ہیں:

''۱۹۱۴ء سے ۱۹۱۶ء کے اواخر تک اردوئے معلی بند رہا، اس دوران بڑی لڑائی شروع ہو گئی۔ ۱۹۱۴ء میں حسرت کو نظر بندی کا حکم ملا جسے انہوں نے ماننے سے انکار کر دیا۔ دو سال تک یہ کارروائی چلتی رہی اور بالآخر انہیں قید کر دیا گیا۔ رہائی کے بعد ۱۹۱۷ء کے اوائل میں انہوں نے اردوئے معلی جاری کیا۔ اردوئے معلی کا یہ تیسرا دور جو ۱۹۲۲ تک جاری رہا، زیادہ تر شعر و شاعری کے لیے وقف رہا''۔ (اختر حسن: مضمون ''اردوئے معلی'' مشمولہ کتاب ''نقد و نظر'' مطبوعہ حیدرآباد دکن: ۱۹۸۴ء، ص ۲۳)

اردوئے معلی مئی ۱۹۱۲ء میں بند نہیں ہوا۔ جون ۱۹۱۳ء میں اس دور کا آخری پرچہ شائع ہوا۔ اردوئے معلی ۱۹۱۷ء کے اوائل سے شائع ہونا شروع نہیں ہوا۔ جون ۱۹۱۳ء کے شمارہ کے بعد جنوری ۱۹۲۵ کا شمارہ چھپا۔

حسرت ۱۹۱۴ء میں نظر بند نہیں ہوئے۔ اخبار مدینہ نے یکم مئی ۱۹۱۶ء کو ان کی گرفتاری کی یہ خبر شائع کی تھی:

''۱۳ اپریل ۱۹۱۶ء کو بوقت دوپہر سپرنٹنڈنٹ پولیس، علی گڑھ جن کے ہمراہ اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ کوتوالی ہائی کورٹ انسپکٹر اور دیگر پولیس مین تھے، نے مسٹر فضل الحسن موہانی کو گرفتار کر لیا''۔

گرفتاری کے بعد انہیں علی گڑھ کی جیل میں رکھا گیا جہاں سرکاری احکام نظر بندی دیے گئے۔ حسرت نے احکام ماننے سے انکار کر دیا انہیں حراست ہی میں ۱۹ اپریل ۱۹۱۶ء کو لکھنؤ پور منتقل کر دیا گیا جہاں ان پر سرکاری حکم نہ ماننے کا مقدمہ قائم ہوا۔ سرسری سماعت کے بعد انہیں دو سال کی سزائے قید دی گئی۔ وسط دسمبر ۱۹۱۸ء میں رہا ہوئے اواخر دسمبر تک وہ علی گڑھ واپس نہیں آئے۔

ان ناقابل تردید حقائق کی روشنی میں اختر حسن کے بیان کو دیکھیے۔ واضح ہو جائے گا جس طرح حسرت پر ظلم کیا گیا۔

دوسری جنگ عظیم کے دوران حسرت موہانی نے زیادہ تر حیدرآباد دکن ہی میں قیام کیا۔ وہاں معلے پلی میں ''آرائشی بلدہ'' کے محکمہ کے تعمیر کردہ کوارٹرز میں ایک ان کو سرکاری طور پر رہنے کے لیے دے دیا گیا تھا۔ اس زمانہ میں ان کے بھانجے اختر حسن کا فرض تھا کہ وہ حسرت سے ملتے رہتے ان کے سوانحی حالات معلوم کر کے مرتب کرتے اور حسرت پرستوں کی رہنمائی کرتے، لیکن انہوں نے عزم کر رکھا تھا کہ غلط بیانیوں سے لوگوں کو گمراہ کریں گے۔ انہوں نے حقائق معلوم کرنے اور انہیں صحیح تناظر میں پیش کرنے کے بجائے دوسروں کے بیانوں کو توڑ مروڑ کر بیان کرنا اپنا شعار بنائے رکھا۔ اس کی ایک مثال تو یہ ہے:

''میں اپنے چھوٹے بھائی کے ساتھ حسرت کے گھر پہنچا۔ ایک کمرہ کا مکان دیکھا کہ کمرے کی داہنی جانب ایک چارپائی اور چارپائی کے سامنے بوریا بچھا ہوا۔ کمرے میں کوئی نہیں، ہاں اندر کے دالان سے کچھ آوازیں آ رہی تھیں۔ میری نظر ابھی اس ماحول کا جائزہ لے رہی تھی کہ چارپائی کے نیچے کچھ جنبش سی ہوئی پھر دیکھا کہ چارپائی کے نیچے سے حسرت برآمد ہو رہے ہیں''۔ (اختر حسن: مضمون ''حسرت حیدرآباد میں''؛ حوالہ مذکورہ ص ۱۸۰)

اس بیان کی ایک خامی تو یہ کہنا ہے کہ اختر حسن نے نہ تو گھر پر دستک دی نہ اندر آنے کی اجازت چاہی۔ دندناتے ہوئے گھر میں گھس گیا جو حیدرآباد میں شرفا کا شیوہ نہیں تھا۔ اختر حسن کو یہ ثابت کرنا تھا کہ ان کے حسرت سے قریبی تعلقات تھے اور اس کے سہارے چونکا دینے والی بات بتلانا تھی کہ چارپائی ہونے کے باوجود حسرت اس کے نیچے لیٹا کرتے تھے اور اس عظیم الشان تحقیق پر لوگوں سے داد سمیٹنا تھا۔ اختر حسن کے انکشاف کے ساتھ ہی ہمارا ذہن رابعہ بیگم کے ایک مضمون کی طرف منتقل ہو گیا جو اختر حسن کے مضمون سے ۱۲، ۱۳ سال قبل چھپا تھا۔ رابعہ بیگم نے لکھا ہے:

''ایک مرتبہ راقم الحروف کو ان سے ملنے کے لیے ان کے مکان پر جانے کا اتفاق ہوا۔ مکان نہایت مختصر تھا ایک یا شاید دو کمرے تھے۔ گھر کے لوگ بھی تھے اور خاندان کے افراد بھی ملنے کے لیے آئے تھے۔ حسرت کا پتہ نہ تھا۔ میں نے خیال کیا کہ اندر کسی کام میں مصروف ہوں گے۔ تھوڑی دیر بعد دیکھتی کیا ہوں کہ کمرے میں جو چارپائی بچھی ہوئی تھی اس کے نیچے سے حسرت صاحب نکل رہے ہیں۔ نہایت اطمینان سے باہر آئے اور کہنے لگے ''یہاں شور بہت ہو رہا تھا اور جگہ بھی نہ تھی اس لیے ہم نے سوچا کہ پلنگ کے نیچے ہی اخبار پڑھنا ٹھیک رہے گا''۔ (رابعہ بیگم: مضمون ''حسرت کی خانگی زندگی'' مشمولہ رسالہ نگار لکھنؤ، جولائی ۱۹۵۲ء، ص ۱۴۴)

رابعہ بیگم کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ مہمانوں کی آمد کی وجہ سے گھر میں چہل پہل تھی چھوٹے سے گھر میں کوئی مناسب جگہ اخبار بینی کی نظر نہ آئی تو حسرت نے چارپائی کے نیچے پناہ لے لی تھی۔ اس نقش اول میں جواز موجود ہے جبکہ نقش ثانی (اختر حسن کے بیان) میں کوئی جواز نہیں۔ نقل بھی کی تو ناقابل یقین!

اسی طرح اختر حسن نے حسرت سے ایک اور ملاقات کا ذکر کیا ہے۔ وہ حیدرآباد ہی کے گھر میں ملنے گئے۔ اس دفعہ بغیر اجازت گھر میں نہیں گئے۔ باہر سے دستک دی معلوم ہوا حسرت بازار گئے ہوئے ہیں بس آتے ہی ہوں گے۔ وہ گھر کے باہر ہی انتظار کرنے لگے۔ مغرب کی اذان کے ساتھ ہی حسرت دائیں طرف سے گلی میں داخل ہوئے ایک ہاتھ میں آٹے کا تھیلا تھا دوسرے میں ایک پڑا۔ یہ کہتے ہوئے کہ ''ابھی آیا'' گھر میں چلے گئے۔ ایک منٹ سے بھی پہلے باہر آ گئے۔ بھانجے کو گھر میں نہیں بلایا۔ گلی میں کھڑے کھڑے باتیں ہوئیں۔ اختر حسن نے پوچھا ''آپ یہ چند لمحوں کے لیے اندر کیوں گئے تھے؟'' بات پوچھنے کی تھی ہی نہیں۔ بازار سے سامان خرید کر لا رہے تھے۔ دونوں ہاتھوں میں سامان تھا اسے گھر میں رکھ کر ملاقات کے لیے باہر آئے تھے۔ اختر حسن کو افسانہ طرازی کرنا تھا اس لیے یہ سوال کیا۔ سوال کے ساتھ یہ بھی لکھتے ہیں ''انہیں خبر تھی کہ حسرت مغرب کی نماز

پڑھنے کے لیے اندر گئے تھے'' اس کے باوجود انہوں نے سوال کیا اور حسرت نے جواب دیا۔ ''وہ نماز پڑھنے اندر گئے تھے اس لیے جلدی آ گئے کہ وہ نماز میں سورتیں نہیں پڑھتے بلکہ ان کے اعداد نکال لیے ہیں جب غلبت میں ہوتے ہیں تو سورتوں کی جگہ اعداد پڑھ لیتے ہیں''۔ (تفصیل کے لیے دیکھیے اختر حسن کا مضمون ''حسرت حیدر آباد میں'' حوالہ مذکورہ، ص ۱۸۰۔۱۸۱)

اس واقعہ نے خافی خاں کے مضمون کی یاد تازہ کر دی۔ انہوں نے حسرت کی طالب علمانہ زندگی کا جو خاکہ کھینچا ہے اس میں بتلاتے ہیں کہ:

> ''صوم وصلوٰۃ کی پابندی ان کی زندگی کا ضروری عنصر تھا مگر برخلاف عوام کے اس سے ان کی شیرینی طبع میں فتور نہیں آنے پایا تھا۔ دیکھا گیا کہ بے تکلفی کا جلسہ گرم ہے اور نماز کا وقت بن بلائے مہمان کی طرح آن پہنچا فضل مسکراتے اٹھے معذرت بھی کرتے جاتے تھے اور وضو بھی! یہاں تک کہ نماز سے فارغ ہو کر پھر ویسے ہی! مگر ایسی حالتوں میں نماز بہت جلد پڑھتے تھے بلکہ ان کے دوستوں کا خیال ہے کہ کلام مجید کی سورتوں کے بجائے ان کے اعداد بحساب ابجد پڑھ لیا کرتے ہیں''۔ (خافی خان: مضمون ''حسرت موہانی، ایک قدرداں کی نظر میں: حوالہ مذکورہ: صفحہ ۲۹۳)

خافی خاں (سجاد حیدر یلدرم کا قلمی نام) کا مضمون دسمبر ۱۹۰۸ء میں چھپا تھا اور اختر حسن کا ۱۹۸۸ء میں، دونوں کا فرق ظاہر ہے۔ اگر علی گڑھ میں ان کے ساتھیوں نے کہا کہ وہ سورتوں کے اعداد پڑھ لیتے ہیں تو انہوں نے حسرت کا مذاق اڑایا۔ اور بقول اختر حسن، حسرت نے خود کہا تو گویا انہوں نے نماز کا مذاق اڑایا۔ ہم جیسے لوگ جو حسرت کے بارے میں خوش عقیدہ ہیں باور نہیں کر سکتے کہ حسرت نماز کا مذاق اڑا سکتے ہیں۔ بہر حال مذکورہ بالا ہر دو صورتوں میں نقش ثانی نقش اول سے بہتر نہیں ہے۔

## حسرت کو کئی وقت کے فاقوں کے سوکھی روٹی میسر آتی تھی!؟

حسرت موہانی کے بارے میں جو داستان سرائی ہوتی رہی ہے اس میں ایک داستان وہ بھی ہے جو کرشن بلدیو شرما کی تصنیف کردہ ہے۔ انہوں نے یہ داستان بیان کی ہے:

> ''ایک مرتبہ کانپور کے ایک سوداگر چوب جو حسرت کے نیاز مند تھے ان سے ملنے گئے تو دیکھا کہ مولانا کچھ تحریر فرما رہے ہیں۔ غالباً شرح دیوان غالب لکھ رہے تھے۔ یہ سلام کرنے کے بعد شکستہ بوریے پر جو مولانا کے ڈیسک کے سامنے بچھا ہوا تھا بصد ادب بیٹھ گئے۔ مولانا لکھتے جاتے تھے اور گفتگو بھی فرماتے جاتے تھے۔ پشت پر ایک پھٹا پرانا پردہ لٹک رہا تھا۔ مولانا پردے کے پیچھے سے کچھ نکالتے اور منہ میں رکھ لیتے اور گڑ کی ڈلی سے تھوڑا سا گڑ کھا لیتے۔ سوداگر خاموشی سے یہ منظر دیکھتے رہے جب ضبط نہ ہوا تو عرض کی کہ آپ کیا کھا لیتے ہیں۔ کچھ خادم کو بھی عطا ہو۔ مولانا نے پردے کے پیچھے سے مٹی کا بنڈا نکال لیا جس میں سوکھی روٹیاں تھیں پانی میں بھیگی ہوئی۔ گڑ کی ڈلی بھی ڈیسک پر رکھ دی اور فرمایا ''لو کھاؤ۔ فقیر کا کھانا تم رئیس نہ کھا سکو گے''۔ سوداگر آب دیدہ ہو گئے''۔ (کرشن بلدیو شرما: مضمون ''مولانا حسرت موہانی: مشمولہ رسالہ آج کل دہلی، اگست ستمبر ۱۹۸۱ء، ص ۳۲)

یہاں تک تو داستان معمولی اور قابل یقین ہے۔ اس کے مخالف نقطۂ عروج anti climix سے ساری داستان کو مشکوک بنا دیا۔ لکھتے ہیں:

> ''مولانا نے فرمایا آج تیسرا فاقہ ہے۔ شکر ہے سوکھی روٹی میسر آ گئی۔ بڑی تسکین ہو گئی سچ ہے۔ جہاں میں نانِ شعیر پر ہے مدار قوتِ حیدری''۔ (ایضاً)

اس اضافہ نے ذہن کو جھنجھوڑ کے رکھ دیا۔ یہ پڑھ کر کئی سوالات ذہن میں پیدا ہوئے۔ یہ مولانا کا ''تیسرا فاقہ'' تھا۔ اس میں واضح نہیں ہے کہ تیسرے وقت کا فاقہ ہے یا تیسرے دن کا! ''تیسرے فاقے'' کے بعد میسر آئی تو سوکھی روٹی! وہ بھی اتنی سوکھی کہ پانی میں بھگوئے بغیر کھائی نہ جا سکے۔ یہ روٹی آئی کہاں سے؟ گھر میں تھی تو انہوں نے فاقے کیوں کیے، کہیں سے مانگ کر لائے تھے تو دینے والے کے پاس سوکھی روٹی کے سوا دینے کو کچھ نہ تھا؟ ویسے بھی مانگنا حسرت اور بیگم حسرت کے مزاج کے خلاف تھا!

## حسرت متعصب انسان تھے؟

یہ الزام ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی نے لگایا ہے۔ اس معاملہ میں موصوف اکیلے ہیں، حسرت کے بارے میں جو سینکڑوں تحریریں ہماری نظر سے گزری ہیں اس میں کسی نے بھی یہ بے بنیاد بات حسرت سے منسوب نہیں کی۔ انہوں نے اپنے ایک مضمون میں لکھا ہے:

> ''حسرت کی تمام تر خوبیوں کے باوجود ہمیں ان کی عظمت میں غلو نہیں کرنا چاہیے۔ مثلاً یہ کہنا کہ ان میں وہ تمام باتیں پائی جاتی تھیں جو اقبال کے قلندر میں پائی جاتی ہیں، درست نہیں ہے کیونکہ اقبال کا قلندر تو اپنے فکر و خیال اور اعمال و افعال میں ایک متوازن شخصیت کا مالک ہے، جبکہ حسرت کی بے لچک شخصیت میں انتہا پسندی، ایک حد تک تعصب اور واضح طور پر تضادات کی کارفرمائی تھی۔ مگر ان کی بشری کمزوریوں اور تضادات کے باوجود یہ شخص منافقت، مکاری و ریاکاری اور مادہ پرستی سے کوسوں دور تھا!''۔ (ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی: مضمون ''حسرت موہانی کی شخصی عظمت: مشمولہ کتاب ''تفہیم و تجزیہ کلیہ علوم اسلامیہ شرقیہ جامعہ پنجاب لاہور، ۱۹۹۹ء)

مجھے یہ تحریر پڑھ کر حیرت ہوئی کہ ایک ''ڈاکٹر'' بے بنیاد بات کے سہارے دل کی بھڑاس نکالنے کے لیے یوں اظہار خیال کر سکتا ہے اور اس سے زیادہ حیرت اس بات پر ہے کہ جامعہ پنجاب جیسے معتبر ادارہ کا ایک ذیلی ادارہ ایسی تحریروں کو شائع کر سکتا ہے۔

پہلی بات کہ یہ بے سروپا ہے کہ کسی نے حسرت کو اقبال کا قلندر قرار دیا ہے جس قلندر کا وجود سوائے ایک شاعر کے رومانوی تصور کے سوا کچھ نہ ہو وہ یا تو شاعر کے ذہن تک محدود رہتا ہے یا اس کے اندھے مقلدین کے ذہن میں۔ نامو جود سے تشبیہ دینا ویسے بھی حماقت ہے اور دوسری بات کہ یہ تشبیہ دینے والا کس مرتبہ کا ہے، صاحب عقل و ہوش ہے یا یونہی سودا ہے، کسی نے کہہ دیا اور ''ڈاکٹر صاحب'' نے اچک لیا۔ اس مختصر سی تحریر میں سب سے زیادہ قابل اعتراض بات بلا ثبوت و دلیل حسرت کو متعصب قرار دینا ہے اس سے بڑھ کر لاعلمی اور ناواقفیت کی دلیل صاحب تحریر کے بارے میں نہیں ہو سکتی۔ جو شخص مسلمانوں میں فرقوں کا قائل نہ ہو وہ کرشن جی تک کو اوتار مانتا اور اس کی شان میں نظمیں کہتا ہو اس کو متعصب کہنا خود تعصب سے بھرے ہونے کی دلیل ہے۔ بات سیدھی سی ہے کہ حسرت اس ذہن کا پروردہ نہیں تھا جس ذہن کے پروردہ صاحب مضمون ہیں لہٰذا اس شخص میں جس کا تعلق ان کی زمیں سے نہ ہو اس میں کیڑے نکالنا ان کا فرض اولیں ہے اسی تعصب کی بنیاد پر حسرت کے متعصب ہونے کی بات کی گئی ہے۔ اگر ان کا اشارہ اردوئے معلی میں شائع ہونے والے مباحث کی طرف ہے جن میں اقبال اور خوشی محمد ناظر کو زبان

کی غلطی بتلائی گئی تھیں تو یہ تعصب کا ثبوت نہیں ہے، صرف علمی بحث ہے۔ اردوئے معلیٰ کے اعتراضات کے جواب اقبال اور ان کے ہم نوا حضرات نے بھی دیے ہیں۔ یہ علمی سطح پر تھیں۔ ان میں سے کسی نے حسرت کو یا ''پنجاب میں اردو'' لکھنے والے مضمون نگار کو متعصب نہیں کہا۔ تعصب تو یہ ہے کہ اقبال کی لفظی غلطیوں کی نشان دہی کر دی جائے تو اس کو قرآن میں تحریف کے برابر سمجھ کر الزامات کے ڈنڈے اٹھا لیے جائیں۔

حسرت انسان تھے۔ ان سے غلطیاں سرزد ہوئی ہیں جو بشریت کا تقاضا ہیں۔ ان کے مزاج میں تضاد بھی تھا وہ اسی زمین پر رہنے والے تھے نہ آسمانی مخلوق تھے نہ خیالی مخلوق تھے اور نہ کسی شاعر کی خیالی دنیا میں بسنے والے کوئی قلندر تھے!۔

## اقتباس

حکام جیل مطمئن تھے کہ کم از کم ڈیڑھ برس تک تو یہ شخص ہمارے قابو میں ہے، جتنی سختی اس کے ساتھ چاہیں کر لیں، چنانچہ ابتدا کی قید سے لے کر دس ماہ تک برابر چکی پسوانا غالباً اسی اطمینان کی بنا پر تھا۔ اگر یہ میعاد قائم رہتی تو ڈیڑھ سال برابر مجھ کو چکی پیسنا پڑتی، لیکن دوران قید میں والد مرحوم کے انتقال کی وجہ سے بھائی صاحب کو مجبوراً کسی نہ کسی صورت میں زر جرمانہ ادا کرنا پڑا، کیونکہ اگر ایسا نہ کیا جاتا تو جو قلیل جائداد وراثتاً مجھ کو پہنچی تھی، وہ مجسٹریٹ علی گڑھ کے حکم سے نیلام کر دی جاتی اور سرکاری نیلام جس بے دردی اور بے پروائی کے ساتھ کیا جاتا، اس کا نمونہ اسی مقدمہ میں لوگوں کے پیش نظر ہو چکا تھا کہ زر جرمانہ کے عوض میں ''اردوئے معلیٰ'' کا کل کتب خانہ جس کی مجموعی قیمت تین چار ہزار روپے سے کسی طرح کم نہ تھی، صرف ساٹھ روپے میں برباد کر دیا گیا۔

اہل حرفہ کے متعلق یہ قانون ہے کہ حکم نیلام سے ان کے پیشے کے اوزار مستثنیٰ سمجھے جاتے ہیں، پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ اخبار نویسوں اور ادیبوں اور شاعروں کے ساتھ اس درجہ سختی کیوں روا رکھی جاتی ہے کہ ان کی نایاب اور قیمتی کتابیں ناقدر دانوں کے ہاتھ کوڑیوں کے مول فروخت کر دی جاتی ہیں؟ جرمانہ اسی قدر ہونا چاہیے جس قدر ملزم سے ادا ہو سکے۔ علی گڑھ میں ہر شخص آگاہ تھا اور اس لیے غالباً مجسٹریٹ علی گڑھ بھی ناواقف نہ ہوں گے کہ ایڈیٹر اردوئے معلیٰ، ایک فقیرانہ زندگی بسر کرتا تھا، ایسی حالت میں اس پر پانچ سو روپیہ جرمانہ کرنا اصول انصاف و انسانیت کے کہاں تک موافق یا مخالف ہے، اس کا فیصلہ ہم ناظرین کے ذمہ چھوڑتے ہیں؟

''قید فرنگ'' از حسرت موہانی

# حفیظ ہوشیار پوری اور ہجرت

ڈاکٹر قرۃ العین طاہرہ

ہجر جدائی و مفارقت کا نام ہے اور ہجرت خدا کی راہ میں اپنی سرزمین، اپنے وطن کو چھوڑ جانا ہے۔ اپنے وطن اپنی مٹی اور اپنے پیاروں سے جدائی اور مفارقت کیا ہجر اور ہجرت دونوں کو ایک دوسرے سے قریب نہیں کر دیتی؟ حضرت آدم کے جنت سے ہجرت کرنے میں ان کی خوشی شامل نہ تھی لیکن حکم بہر حال حکم تھا۔

اسلامی تاریخ میں اولین ہجرت، حضور کا مشرکین مکہ کی بدسلوکی سے تنگ آ کر خدا کی رضا سے مدینہ کی طرف ہجرت کرنا بے حد اہمیت رکھتا ہے۔

جہاں کہیں بھی گیا عشق سرفراز رہا　　کچھ اس طرح سے مٹا فرق مکی و مدنی (حفیظ)

قومی تاریخ میں پیام پاکستان کے موقع پر مسلم قومیت کا ہندوستان سے ہجرت کرنا ان کے لیے بیک وقت ایک خوش آئند اور اذیت ناک تجربہ تھا۔ ہجرت کے اس تجربے نے مسلمانوں کو خوش گوار مستقبل کی نوید دی کہ اس سے پہلے غیر منقسم ہندوستان میں مسلمانوں کی اکثریت کی اقتصادی و معاشی بدحالی ناگفتہ بہ تھی۔ صنعت و حرفت و انتظامی ادارے و سرکاری دفاتر، ہر مقام پر غیر مسلموں کی اجارہ داری تھی، اگر مسلمان سرکاری ملازمت کے لیے اپنا حق مانگتے تو اسے فرقہ واریت سے تشبیہ دی جاتی۔ مسلمان گھرانے غربت اور بھوک کا شکار تھے کہ ہندوؤں نے کبھی بھی قومی وسائل پر ان کا حق تسلیم نہ کیا۔ معاشی حقوق، معاشرتی اقدار اور دینی حمیت و غیرت پر مسلسل حملے کیے جاتے۔ تعلیمی اداروں میں دن کا آغاز کانگریس کے جھنڈے کو سلامی دینے اور مسلم دشمن گیت بندے ماترم اور گاندھی کی تصویر کے درشن کے بعد ہوتا تھا۔ اردو زبان کو مسلم قومیت کی علامت سمجھ کر اسے رد کر کے ہندی زبان کو رواج دینے کی کوشش کی گئی۔ رسم الخط کو دیوناگری رسم الخط میں بدلنے کے ارادے کیے گئے۔ پھر ہندو چار ذاتوں میں بٹے ہوئے تھے۔ دو ذاتیں اعلیٰ اور دو ذاتیں ادنیٰ ترین درجے پر فائز تھیں۔ مسلمان بھی اسی کمترین طبقے میں شامل تھے کہ جن کے ساتھ اچھوتوں کا سا سلوک کیا جاتا۔ مسلمان کا چھو جانا انہیں ناپاک کر دیتا۔ ایک ہی کنویں سے مسلمان اوک سے اور ہندو گلاس سے پانی پیتے۔ ہندو مہاجن بڑی بے رحمی سے غریب مسلمانوں کی کمائی ہتھیانے کی فکر میں رہتے۔ دس کروڑ مسلمان اسی بے انصافی کا شکار تھے۔

اس پس منظر کے ساتھ آزاد وطن کا قیام ان کے لیے ایک اچھے مستقبل کی خوشخبری کا درجہ رکھتا تھا، جہاں وہ مذہبی، سیاسی، معاشی و اقتصادی آزادی کے ساتھ اپنے خوابوں کی تعبیر پا سکیں گے۔

ماضی کی ان چیرہ دستیوں کے بعد جب انہوں نے ایک نئے وطن کی سرزمین پر قدم رکھا تو انہیں متعدد اذیت ناک تجربوں سے گزرنا پڑا۔ ماضی کے یہ دن مسلمان کی تاریخ کا وہ باب ہے کہ جسے فراموش کرنا کسی بھی پاکستانی کے لیے، خواہ وہ براہ

راست اس میں شریک نہ بھی ہوا ہو، ممکن نہیں۔ نئی نسل بزرگوں کی زبان سے یا تاریخ کی کتاب کی مدد سے اس بات سے آگاہ ہے کہ اس قوم نے خطۂ پاک کے حصول کی کیا قیمت ادا کی ہے۔

مسلمان اپنی جرأت بے مثل عزم و یقین حوصلے اور ولولے سے کام لے کر ہندوؤں اور سکھوں کے ہاتھوں ہونے والی تباہی و بربادی مسلم کش فسادات اور قتل و غارت گری کا سمندر عبور کر کے یہاں پہنچے تو زبان پر شکوہ و شکایت نہیں بلکہ شکر کے کلمات تھے۔ خلوص، ایثار اور بلند ہمتی نے ساتھ نہ چھوڑا تھا۔ نئے وطن کی بنیاد رکھنے، اسے رواں دواں رکھنے اور ترقی دینے کا جو عزم ان کے دلوں میں تھا، اس عزم کو عمل میں تبدیل کرنے کی خواہش بدرجہ اتم تھی اور جب مسلمان عملی طور پر آزاد وطن کے نظم و نسق کی طرف متوجہ ہوئے انہیں احساس ہوا کہ آبادی کی ایک کثیر تعداد کو روزگار، رہائش اور بنیادی ضروریات کی فراہمی آسان کام نہیں۔ ہر پاکستانی اس تجربے سے متاثر ہوا۔ نئے ملک کے مسائل سے ہر ایک کا سابقہ پڑا۔ شاعر معاشرے کا حساس ترین فرد ہے۔ اس عہد کی شاعری سے ہم ہجرت کے تجربے اور ہجرت کے بعد پیدا ہونے والی صورت حال کی تاریخ مرتب کر سکتے ہیں۔ قیام پاکستان کے بعد لکھے گئے ادب میں اس تجربے کی بازگشت دور دور تک اور دیر تک سنائی دیتی ہے۔ اس دور سے پہلے یعنی ۱۹۳۰ سے ۱۹۴۷ء تک لکھے گئے ادب میں حصول آزادی کی کشمکش نظر آتی ہے۔ اس میں صرف ایک آزاد خطے کی ہی جستجو نہیں بلکہ سیاسی سماجی نفسیاتی سطح پر آزادی کی خواہش موجود ہے۔

اس دور کی شاعری مختلف رویے اور مزاج رکھتی ہے۔ ہر شاعر نے اپنے انداز اور لہجے میں بات کی۔ کبھی اس نے سیاسی رہنما کا لہجہ اختیار کیا تو اس میں براہ راست بیان اور اس کا مقصد نمایاں نظر آنے لگا اور کہیں یہ لہجہ اس برہم نوجوان کا ظاہر ہوا کہ جو تحریک آزادی کا سرگرم رکن تھا لیکن جس کا طرز عمل اور طرز گفتگو پیچیدہ تھا۔ کبھی یہ نوجوان انگریز کی غلامی سے نجات حاصل کر کے انتقام کی آگ سرد کرنا چاہتا تھا اور کبھی جاگیرداری نظام کے مکمل خاتمہ کی خواہش کرتا تھا۔ دراصل سماجی سطح پر تبدیلی کی خواہش شاعر کے دل میں موجود تھی اور یہ اتنی آسانی سے ممکن نہ تھا۔ اس دور کی شاعری میں ظلم جبر و استبداد اور معاشی مسائل بھی نمایاں ہیں۔

قیام پاکستان کے بعد ہجرت کے تجربے کو مختلف شعرا نے مختلف انداز میں قبول کیا۔ بعض کے نزدیک یہ خالص مذہبی معاملہ تھا۔ بعض شعرا نے قیام پاکستان کو روحانی واردات کے طور پر قبول کیا۔ کچھ نے اسے تمام مصائب و آزار سے نجات کا ذریعہ جانا۔ کئی شعرا نے اسے خالص انفرادی تجربے کی حیثیت دی۔ کچھ نے اجتماعی تجربے کی حیثیت سے اس کا تجزیہ کیا۔ کسی نے اسے امید بہار کا پیغام سمجھا تو کچھ نے بھیانک تیرگی کا نوحہ سنایا۔ ہجرت ذہنی و روحانی عمل کی حیثیت بھی رکھتی ہے۔ بہت سے لوگ ایسے تھے جنہوں نے عملاً ہجرت نہ کی، لیکن اس تجربے میں اس طرح شریک ہوئے اور ہجرت سے اس طرح متاثر ہوئے کہ ان کے مشاہدے میں تجربے کی جھلک نظر آنے لگی۔ کچھ ایسے بھی تھے جو دل سے پاکستان آنا چاہتے تھے لیکن ظاہر یہ کرتے تھے کہ انہیں ہجرت کی صعوبتیں مجبوراً اپنی مرضی کے خلاف اٹھانا پڑ رہی ہیں۔ کچھ علی الاعلان پاکستان نہ آنے کی خواہش کے باوجود پاکستان آئے اور اسے ہجرت کے بجائے جلاوطنی سے تعبیر کرتے رہے۔ کچھ شاخوں پر جلے ہوئے بسیروں کے مناظر تاعمر نہ بھول پائے۔ یوں ان کی شاعری میں ہجر اور ہجرت کے تجربے مربوط ہو کر مفارقت کی فضا تشکیل دیتے نظر آتے ہیں۔ کچھ کے نزدیک ہجرت کا تجربہ ایک تہذیبی و ثقافتی عمل کی حیثیت رکھتا ہے۔ کہیں ہجرت کا یہ عمل ایک نئے جہان کی تخلیق میں ڈھل جاتا ہے۔ بعض کی شاعری میں NOSTALGIA کی کیفیت پیدا ہوئی کسی نے اداسی کی ایک مخصوص فضا اپنی شاعری میں پیش کی۔

یوں اس عہد کی شاعری کا منظر نامہ، خیر و شر، مثبت و منفی جذبہ و احساس، کامیابی کی کرن اور ناکامی کے اندھیرے سے تشکیل پاتا ہے۔ شاعر کے دوش پر ہجرت کے مراحل سے گزرتے ہوئے تجربات کی گٹھڑی بھی ہے اور ہجرت کے بعد پیدا ہونے والے لاتعداد مسائل کا پنڈورہ باکس بھی۔

''تقسیم کے بعد کے حالات و واقعات تک اب شاعری میں داخلی تجربے بن کر آئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ فسادات پر ہمارے ہاں کئی ایک اچھی غزلیں ملتی ہیں۔ حفیظ ہوشیار پوری اس وقت پاکستان کے گنے چنے اچھے غزل گو شاعروں میں ہیں۔ اس سلسلے میں ان کی غزلیں خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ایک غزل کے صرف ایک شعر میں کیا کچھ نہیں۔

کچھ اس طرح سے بہار آئی ہے کہ بجھنے لگے ہوائے لالہ و گل سے چراغ دیدہ و دل!

ڈاکٹر آفتاب احمد اس عہد کی شاعری کا تجزیہ یوں کرتے ہیں کہ ہمارے شاعروں نے حالات و واقعات میں پیدا ہونے والے تغیر و تبدل کو نہ صرف قبول کیا بلکہ اپنے اشعار میں نمایاں جگہ دی وہ لکھتے ہیں:

''..... میں نے جو کچھ عرض کیا اس کے ثبوت میں حفیظ ہوشیار پوری کی وہ غزلیں یاد کیجیے جو اس احساس کی آنچ میں تپ کر نکلی ہیں، خصوصیت سے ان کی وہ غزل تو ایک تخلیقی کارنامہ ہے جس کا مطلع ہے:

جنوں میں شیخ و برہمن میں کس قدر کامل ہزار قافلۂ بے نشاں و بے منزل

اسی غزل کا ایک اور شعر سنیے اور غور کیجیے کہ یہ اختصار اور رمزیت کتنی نظموں پر بھاری ہے۔

کچھ اس طرح سے بہار آئی ہے کہ دیکھنے لگے ہوائے لالہ و گل سے چراغ دیدہ و دل[۲]''

حفیظ کی شاعری میں ہجرت کے تجربے کی بازگشت بہت عرصے تک سنائی دیتی رہی۔ حفیظ غزل گو شاعر کی حیثیت سے بڑا معتبر مقام رکھتے ہیں۔ یہ بات ان کے معاصرین و متاخرین سبھی مانتے ہیں۔ ''حفیظ کی غزل، غزل کی تعریف پر پوری اترتی ہے''۔ اس رائے کو مدنظر رکھتے ہوئے ڈاکٹر سید عبداللہ مقام غزل کے دیباچے میں لکھتے ہیں:

''حفیظ کے سلسلے میں یہ نقطہ خاص طور پر قابل ذکر ہے کہ ان کی غزل میں سماجی اور سیاسی احوال و نظریات کے اشارے بمنزلہ صفر ہیں۔ یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ وہ اپنے گرد و پیش سے غافل اور ماحول کے بارے میں بے حس تھے اور یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ باآں ہمہ دانش، جوان کی تعلیم و اکتساب کا (فلسفے کے طالب علم ہونے کی وجہ سے) حصہ تھی۔ وہ زمانے کے مروج افکار و تصورات سے بالکل بے خبر تھے اور یہ بھی مدنظر رہے کہ وہ شب و روز جن احباب کے ہم نشیں تھے، کبھی ادب کے سماجی نظریے کے قائل بلکہ اس کے سرگرم کارکن تھے (مثلاً تاثیر، فیض وغیرہ) لہٰذا اس بارے میں ان پر بے خبری کا گمان نہیں ہو سکتا۔ درحقیقت بات یہ نہ تھی۔ معاملہ صرف یہ تھا کہ حفیظ کے نزدیک شاعری ذوق پیام اور شوق سلام کے سوا کچھ نہیں۔ چنانچہ اسے کسی اور چیز کا ترجمان نہیں بنایا جا سکتا۔ جس طرح پرانے شاعروں نے ''جنگ ہفتاد و دو ملت'' سے کنارہ کشی کی تھی، حفیظ نے بھی نظریات کی جنگ سے علیحدگی اختیار کی ہوئی تھی''[۳]۔

لیکن حفیظ کے مجموعے، مقام غزل کا شماریاتی جائزہ لیا جائے تو غزلوں کے اشعار میں غم جاناں کے ساتھ ساتھ غم دوراں کی جھلک بھی نمایاں ہے اور جب بات ہجرت کے حوالے سے سیاست کی کی جائے، تو ان کی شاعری کے اس پہلو کو کسی طرح بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا جس میں ہجرت اور ہجرت کے بعد نئے وطن میں پیدا شدہ مسائل اور رہنماؤں کے طرز عمل کو موضوع بنایا گیا ہے۔

شماریاتی جائزے کے مطابق حفیظ کے لگ بھگ ۱۵۷ اشعار میں منزل (صفحہ نمبر ۳۵۔۴۴۔۵۲۔۶۴۔۶۵۔۶۶۔۷۶۔۸۱۔۸۵۔۸۷۔۹۶۔۹۸۔۱۰۰۔۱۰۲۔۱۰۴۔۱۰۸۔۱۱۰۔۱۱۶۔۱۲۳۔۱۲۴۔۱۲۵۔۱۳۱۔۱۷۹۔۱۸۲۔۱۸۹۔۱۹۱۔۲۰۸۔۲۱۶۔

۲۲۶-۲۳۲-۲۳۵-۲۳۹-۲۵۲-۲۵۳-۲۶۹-۲۸۶-۲۸۴-۲۹۱-۲۹۳-۲۹۵-۱۰۲-۳۰۷) ۳۵-اشعار میں راہنما و رہبر (صفحہ نمبر ۳۵-۱۰۳-۱۰۵-۱۰۹-۱۲۱-۱۲۴-۱۲۵-۱۳۱-۱۵۰-۱۶۲-۱۷۸-۱۸۶-۱۸۹-۱۹۶-۱۹۷-۲۰۸-۲۲۶-۲۳۹-۲۴۲-۲۵۰-۲۵۳-۲۶۷-۲۶۹-۲۷۱-۲۷۵-۲۷۶-۲۹۳-۲۹۵-۳۰۷) لگ بھگ ۱۱۲ اشعار میں راہزن جو دراصل راہبر کا لبادہ اوڑھے عوام کو فریب دے رہے ہیں (صفحہ ۱۰۳-۲۰۸-۲۲۶-۲۳۳-۲۴۲-۲۶۷-۲۷۱-۲۹۳-۲۹۵-۳۰۷) تقریباً ۲۵ اشعار میں سفر ہم سفر اور اس کی مختلف شکلیں (صفحہ ۱۰۳-۱۰۴-۱۰۹-۱۱۴-۱۲۰-۱۶۲-۱۷۸-۱۸۲-۱۸۴-۱۹۷-۲۰۸-۲۲۸-۲۳۹-۲۵۳-۲۷۱-۲۸۰-۲۸۵-۲۸۹-۲۹۳-۲۹۶-۳۰۲) ۱۳ اشعار میں رسن و دار (صفحہ نمبر ۵۹-۱۲۸-۲۹۱) ۱۳ اشعار میں قفس و دوام (صفحہ ۶۶-۱۱۳-۱۱۸) ۱۵ اشعار میں سحر (صفحہ نمبر ۱۷۲-۱۷۸-۲۰۲-۲۷۲)

اس بات کو بہر حال نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ حفیظ کی غزل کے سیاسی پہلو کے اس شماریاتی جائزے میں راہبر، رہزن، منزل، سفر، مسافر، رات، سحر، بہار، زندان، قافلہ، کارواں کے ہر استعارے یا ہر علامت کا ہجرت یا سیاست کے تجربے پر منطبق کرنا درست نہیں کہ منزل کوئی اور بھی ہو سکتی ہے۔ سفر کہیں اور کا بھی ہو سکتا ہے، لیکن ایک بڑی تعداد میں ان مذکورہ بالا علامات کا تعلق سیاست، ہجرت اور اس کے بعد کی پیدا شدہ صورت حال سے ہے۔

یہ تمام استعارے و علامات حفیظ کی سیاست سے لاتعلقی کو نہیں بلکہ تعلق کی وضاحت کرتے ہیں۔ یوں ڈاکٹر سید عبداللہ کی حفیظ کی شاعری کے سیاسی یا سماجی پہلو پر رائے معتبر نہیں رہتی۔ جناب فضل حق فاروقی بھی اپنے مقالے (ایم۔اے اردو ۱۹۷۳) میں حفیظ ہوشیار پوری کے بارے میں ڈاکٹر سید عبداللہ کی رائے سے انحراف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''...... حفیظ کی شاعری کا دوسرا دور تقسیم ہند کے بعد سے شروع ہوتا ہے۔ جس میں حفیظ کی شاعری کہیں رومانی جذبات اور کہیں سیاسی رجحانات کی ایک ارتقائی صورت نظر آتی ہے اس میں کوئی شک نہیں کہ حفیظ کی شاعری ایک تدریجی سفر کی صورت اختیار کرتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ شروع میں رومانی جذبات اور سیاسی رجحانات کا ذکر ملتا ہے اور جذبات محبت کا بھی اظہار ملتا ہے اور پھر آہستہ آہستہ اس میں تفکر نمایاں ہونا شروع ہوا........ ڈاکٹر سید عبداللہ صاحب نے حفیظ کی غزل گوئی کی خصوصیات گنواتے ہوئے ایک خاصیت یہ بھی بیان کی ہے کہ انہوں نے اپنی غزل کو کسی سماجی وعظ و تلقین اور کسی سیاسی نظریے سے خلط ملط نہیں ہونے دیا اور یہ کہ ان کی غزل خالص واردات قلب کی ترجمان ہے۔ ڈاکٹر سید عبداللہ کی اس رائے سے متفق نہیں ہوا جا سکتا، کیونکہ حفیظ کی دوسرے دور کی شاعری کا مطالعہ کرنے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ حفیظ کی شاعری میں سیاست کا تجربہ بھی موجود ہے۔ اس طرح یہ کہنا کہ حفیظ کی غزل میں سماجی اور سیاسی نظریات نہیں ملتے کسی طرح بھی قابل قبول نہیں''۔ ۴

جناب فضل حق فاروقی نے حفیظ کی شاعری کے دوسرے دور میں سیاسی اشعار کی موجودگی کا تذکرہ کیا ہے، لیکن اگر ہم حفیظ کے ابتدائی دور کی شاعری کا جائزہ لیں تو اس میں واردات قلبی سے مرصع غزلیات کے ساتھ ساتھ سیاسی نظموں کی موجودگی بھی ظاہر ہوتی ہے۔

''میٹرک اور انٹرمیڈیٹ کی تعلیم کے دوران میں شعر و ادب کے ساتھ ساتھ آپ کو سیاسی جلسوں میں شرکت اور ہنگامی موضوعات پر نظمیں پڑھنے کا بھی شوق تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا۔ جب ہندوستان کے عوام اور طلبا نے انگریز کی غلامی سے نجات پانے کے لیے آزادی کی جدوجہد کو تیز کر دیا تھا۔ ہوشیار پور کے طلبہ کے ایک جلوس کی قیادت کے نتیجے میں آپ کی گرفتاری کے وارنٹ بھی جاری ہوئے۔ ان دنوں خان قربان علی خان ہوشیار پور کے سپرنٹنڈنٹ پولیس تھے۔ انہوں نے آپ کو سخت تنبیہ کر کے چھوڑ دیا اور قید و بند کی نوبت نہ آئی۔ پنڈت موتی لال نہرو اور مولانا محمد علی جوہر کے انتقال پر بھی طالب علموں کے جلوس میں حفیظ نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ جتندر ناتھ داس کے انتقال پر حفیظ نے جو نظم کہی تھی اس کا پہلا شعر انہیں آج تک یاد ہے۔

رنگ لائی ہیں حکومت کی تغافل کیشیاں　　چل دیا افسوس دنیا سے جتندر ناتھ داس ۵

ان کی شاعری، خصوصاً غزل میں قابل گرفت موضوع بھی علامتی انداز میں بیان کیا گیا نظر آتا ہے۔

''وہ سرکاری ملازمت کی وجہ سے سیاسی شاعری نہیں کر سکتے تھے، لیکن غزل میں ایسے مضامین بڑی خوبصورتی سے لے آتے تھے''۔ ۶

یہ درست سہی کہ حفیظ کی غزلوں میں سیاسی نعرہ بازی یا انقلابی لہجہ نمایاں نہیں ہے، لیکن شاعر اپنے گردوپیش کے حالات سے کس طرح بے خبر اور بے اثر رہ سکتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ لہجے کو دھیما رکھنے میں کچھ ان کی اپنی فطرت اور کچھ مجبوری کا بھی دخل ہے۔

''ان کے لہجے کو دھیما رکھنے میں شاید بیرونی بندش یا منصبی ڈسپلن کو بھی دخل رہا ہو۔ اس بات کو مجھ جیسے سرکاری ملازم بخوبی محسوس کر سکتے ہیں۔ خصوصاً وہ جن کے گلے میں اڑنے کے ساتھ ہی کوئی پھندا آ لگا ہو۔ حفیظ نے شاعری بڑے طمطراق سے قومی نعرہ بازیوں سے شروع کی تھی، لیکن جلد ہی اس کے عواقب سے دوچار ہونا پڑا۔ اس روایت پر ان کی اپنی تصدیق موجود ہے کہ زمانہ طالب علمی میں لڑکوں کے جلوس میں پیش پیش رہے اور باغیانہ نظمیں لکھنے پر ان کی گرفتاری قریب تھی کہ ان کے پرنسپل کی پشت پناہی نے انہیں بچا لیا اور خان قربان علی نے جو اس وقت ہوشیار پور میں سپرنٹنڈنٹ پولیس تھے، ان کو نصیحت فضیحت کر کے چھوڑ دیا۔ وہ جوش و خروش جو شاید ان کی ابتدائی نظموں میں (جواب ناپید ہیں) ایک پہاڑی چشمے کی طرح سر پٹکتا ہوا ابلا ہوگا اور لڑھکتا چلا ہوگا۔ عمر بھر ان کے کلام سے قطرہ قطرہ تراوش کرتا رہا۔ آبشار اور جوئے بار میں بس یہی طرز خرام کا فرق ہوتا ہے۔ یہ چٹانوں کو نہیں توڑتی مگر خشک زمینوں کو سیراب کر سکتی ہے''۔ ۷

غم صدمہ، خوشی و انبساط وہ جذبے ہیں کہ ہر فرد ضروری خیال کرتا ہے کہ اس کا اعلان کیا جائے۔ انسان زندگی میں مختلف کیفیات سے دوچار ہوتا ہے۔ یہ اس کے اپنے ظرف اور طبعی رجحان پر منحصر ہے کہ وہ کس واقعے کو کس انداز میں قبول کرتا ہے۔ قیام وطن کا اجتماعی تجربہ ہر شاعر کی داخلی واردات کے طور پر ابھر کر سامنے آتا ہے۔ حفیظ نے اسے اپنے انداز سے محسوس کیا۔

''حفیظ ہوشیار پوری کی شاعری میں سیاست کا تجربہ بھی موجود ہے۔ برصغیر کے جن مسلمانوں نے ۱۹۴۷ء سے قبل آزادی کا خواب دیکھا تھا ان میں حفیظ ہوشیار پوری بھی شامل تھا اور اس خواب سے اس کی شام و سحر کی دلکشی بڑھ گئی تھی۔ اس کا بالواسطہ تذکرہ اس کے اشعار میں موجود ہے۔

یہ دلکشی کہاں مرے شام و سحر میں تھی　　دنیا تری نظر کی بدولت نظر میں ہے

لیکن جب یہ خواب شرمندہ تعبیر ہوا تو اس کے شام و سحر پر سنولاہٹ پھیل گئی اور چراغ دیدہ و دل بجھنے لگے۔

تمام عمر کیا ہم نے انتظار بہار　　بہار آئی تو شرمندہ ہیں بہار سے ہم
کچھ اس طرح سے بہار آئی کہ بجھنے لگے　　ہوائے لالہ و گل سے چراغ دیدہ و دل

حفیظ کی اس قسم کی شاعری میں پاکستانی قوم کا مزاج ہی محفوظ نہیں بلکہ اس قوم کے بننے بگڑنے کی پوری داستان بھی مرقوم ہے اور وہ آسیبی خوف بھی پرفشاں ہے جو سیاست کے زخموں کی بدولت ہر محب وطن کو اندر ہی اندر چاٹ رہا تھا، چنانچہ حفیظ نے ایسی شاعری

بھی کی ہے کہ جب شاعر لاشعوری طور پر پیغمبری کا منصب ادا کرتا ہے اور وہ اپنے تخلیقی رموز و علائم کے وسیلے سے قوم کو حقیقتوں کا آئینہ دکھاتا ہے اور اپنے اشعار میں ماضی حال اور مستقبل تینوں ابعاد کا احاطہ کرتا ہے۔

کوئی طوفان نہ ہو آنے والا — موج کہنے چلی کچھ ساحل سے
ہم کو منزل نے بھی گمراہ کیا — راستے نکلے کئی منزل سے
کام آیا نہ خون صد منصور — دار کا نخل بے ثمر ہی رہا
ہم بدلتے رہے رہنما رات دن — اور بدلتے رہے رہنما راستے
میں اپنے حال کو ماضی سے کیوں کہوں بہتر — اگر وہ حاصل غم تھا تو یہ غم حاصل
نہ آسماں پہ نہ مژگاں پہ ہے ستارہ کوئی — شب سیاہ میں اندازہ سحر کے لیے
خوف تقلید راہبر ہی رہا — اک قدم اس سے پیشتر ہی رہا
نظر سے حد نظر تک تمام تاریکی — یہ اہتمام ہے اک وعدہ سحر کے لیے
آہ یہ انسانوں کی بستی آہ کہاں انسان — چلتے پھرتے سایوں سے ہیں بام و در آباد

قوموں اور ملکوں پر جب ایسا وقت آتا ہے تو ہاتھ بے اختیار دعا کے لیے اٹھ جاتے ہیں۔ چنانچہ حفیظ جب اس منزل پر پہنچا تو اس کی کیفیت کچھ یوں تھی:

قرار دل کو نہ آسودگی نظر کے لیے — یہ آزمائش قلب و نظر بشر کے لیے
خدا دراز کرے عمر اہل شوق حفیظ — کہ جی رہے ہیں کسی دور منتظر کے لیے
دل کی بستی سونی سونی نگر نگر آباد — اجڑے گھر آباد ہوں یارب اجڑے گھر آباد
کوئی زمیں سے بھی پہنچائے آسماں کو پیام — پیام اہل زمیں کو تو آسماں کے ملے[8]

آزادی مسلم قوم کا واحد خواب تھا جس کی تعبیر انہوں نے ایک بڑی قیمت دے کر حاصل کر لی تھی۔ ڈیڑھ کروڑ مسلمانوں کا ہجرت کرنا۔ دوران ہجرت غیر مسلموں کا حملہ کر کے ہزاروں کی تعداد میں لوگوں کو شہید کرنا۔ دوران سفر بے شمار مسلمان مردوں عورتوں اور بچوں کا بھوک، بیماری، خوف اور تھکان سے دم توڑ دینا۔ دنیا کی تاریخ میں اپنی مثال آپ ہے۔

انسانی نفسیات کا یہ اصول ہے کہ جب کوئی شے میسر نہ ہو تو اس کی طلب میں شدت پیدا ہوتی جاتی ہے اور جب سعی بسیار کے بعد گوہر مقصود ہاتھ آ جاتا ہے تو رفتہ رفتہ اور بسا اوقات جلد ہی ذہن و دل میں اس کی خواہش اور کشش ماند پڑ جاتی ہے۔ ایک نئے ملک کی انفرادی و اجتماعی خواہش کی تکمیل نے دوران تکمیل ملک کو جنت نظیر بنانے کے جو ارادے کیے تھے وہ بہت جلد ٹوٹنے لگے اور اس کے لیے طرح طرح کے عذر اور تاویلیں پیش کی جانے لگیں۔ قیام ملک کے فوراً بعد کا دور ایسا تو نہ تھا کہ انسان اپنی ہی اس جدوجہد اور قربانیوں کو بھول کر اور ملک کے مفاد کو پس پشت ڈال کر انفرادی کامیابیوں کے لیے کوشاں ہو جائے۔ اور احسان فراموش اور عذر خواہی کا رویہ اپنا لے، لیکن یہ تکلیف دہ صورت حال روز بروز بڑھتی گئی۔ آزاد وطن میں بغیر کوشش اور محنت کے راتوں رات امیر بننے کے خواب نے انسان سے صبر و استقامت کی صفات چھین لیں۔

راہ کوئی واصل منزل نہیں — راہ صبر و استقامت کے بغیر

ملک کے بہتر مستقبل کے لیے جوش و جذبے اور آگے بڑھنے کی لگن پر ایک اور طلب سایہ فگن ہوئی اور وہ طلب اجتماعیت کو رد کر کے انفرادیت کو نمایاں کرنے کی تھی۔ خود غرضی و زر پرستی نے انسان کو ایک دوسرے سے جدا کر دیا۔

''اگرچہ آبادکاری کے سلسلے میں بعض مہاجرین مسلمانوں نے غیر مستحق طور پر ناجائز طریقے سے متروکہ جائیدادوں کے غلط دعوے پیش کر کے تبادلہ میں املاک اور جائیدادیں حاصل کیں اور چند مستحق دولت مند خوددار مہاجروں نے دعوے پیش کرنے کو اپنی عزت نفس کے خلاف سمجھا۔ اس طرح بعض غریب بہت امیر بن گئے اور کچھ امیر بہت غریب ہو گئے''۔[9]

اقربا پروری نے زور پکڑا۔ نتیجتاً حق دار اور مستحق لوگ منتظر ہی رہے۔

مخصوص میرے ساقی خلوت کا ہے کرم — کب سے ترس رہے ہیں سرانجمن کئی

ان حالات میں حفیظ کا لہجہ تلخ اور انداز طنزیہ ہو جاتا ہے۔ طنز انسان کے لبوں پر اس وقت ہی آتا ہے کہ جب وہ حق دار ہو کر بھی اپنا حق نہ پا سکے۔ محروم انسان ہی اس بات کا گلہ کر سکتا ہے کہ منزل انہیں ملی جو شریک سفر نہ تھے۔ یہ نہایت تکلیف دہ امر ہے کہ قربانیاں کسی اور نے دیں، صلہ کسی اور نے پایا۔ ذہن میں پیدا ہونے والے سوالات کے جواب وہ کس سے مانگے۔

نہ جانے ان کے مقدر میں کیوں ہے تیرہ شبی — وہ ہمسفر جو سحر کو قریب تر لائے

حفیظ آزادی کی خوشی میں ان دلخراش مناظر کو لمحہ بھر کے لیے بھی فراموش نہیں کر پائے جو ہجرت کے نتیجے میں رونما ہوئے۔ وہی کام جو امن و صلح سے بھی ہو سکتا تھا، پندرہ لاکھ افراد کی جان کے نذرانے لے کر ہوا۔ وہ قومیں جو تقسیم کے خلاف تھیں انہوں نے اسے اپنی شکست سمجھا اور اس ہار کا بدلہ بے گناہ مسلمانوں پر وحشت و بربریت کی انتہا کر کے لیا۔ ذلت آمیز اور وحشیانہ مظالم، قتل و غارت گری، لوٹ مار اور سفاکی و درندگی کے یہ مظاہر چشم فلک نے کبھی نہ دیکھے تھے۔ حساس انسان ان مناظر کو دیکھ کر کبھی چیخ اٹھتا ہے اور کبھی اس پر سکتہ طاری ہو جاتا ہے۔

حفیظ آج تک مہر حیرت بلب ہوں — کچھ ایسے مناظر نگاہوں سے گزرے
ہر اک قدم تھا جہاں موج خوں سے ہم آغوش — گزر کے آئے ہیں ایک ایسی رہ گزر سے ہم
جس راہ میں بھی قدم اٹھایا لٹتا ہوا قافلہ تھا درپیش

یہ دکھ اور اذیتیں تو وہ تھیں کہ جو کسی حد تک متوقع تھیں۔ مسلمان جانتے تھے کہ ہندوستان کی دیگر اقوام اس صورت حال کے لیے کبھی تیار نہ ہوں گی، لیکن کچھ دکھ عوام کو غیر متوقع طور پر بھی پہنچے۔ اپنوں کے ستم ویسے بھی زیادہ شدت سے محسوس ہوتے ہیں اور پھر اپنے بھی وہ کہ جنہیں عوام نے خود سے بہتر اور برتر سمجھتے ہوئے راہبری کے فرائض سونپے۔ قیام پاکستان اور اس کے کافی بعد بھی عوام اپنے رہنماؤں کے طرز عمل سے دلبرداشتہ رہے۔

۱۹۵۸ء کی شاعری کا جائزہ لیتے ہوئے وزیر آغا لکھتے ہیں:

''..... پچھلے برس کی غزل کا ایک محبوب تصور رہبر اور رہزن سے متعلق ہے۔ اس ایک بات کو کہ ہمارے رہبروں نے ذاتی اغراض پر قومی اغراض کو قربان کیا۔ غزل کے ان گنت اشعار میں موضوع سخن بنایا گیا ہے۔ حتیٰ کہ قریب قریب غزل کا ایک آدھ شعر اس تصور کے لیے وقف نظر آتا ہے''۔[10]

حفیظ کی غزل بھی رہبر و راہزن کے کردار کا تفصیلی تجزیہ پیش کرتی ہے۔ رہنما ایک مثبت سوچ کا مالک، پر اعتماد، قابل ترین قوت فیصلہ رکھنے والا، لیکن جس کے فیصلوں میں لچک بھی ضروری ہے کہ وہ عوام کی مرضی کے مطابق ان میں ردوبدل کر سکے۔

ذہنی وجسمانی طور پر صحت مند، منفی خصوصیات سے مبرا اور ایک عام انسان سے کسی قدر بلند ہونا چاہیے کہ جب وہ راہنمائی کے فرائض سنبھال لیتا ہے تو اسے انفرادی سطح سے بلند ہو کر اجتماعیت کے لیے کام کرنا ہوگا۔ اپنی ذات کی نفی کر کے اپنے آرام وسکون کو تج کر قوم کی بہتری اور بھلائی کو مدنظر رکھنا ہوگا، لیکن حفیظ کی غزل میں رہنما کی جو شکل ابھرتی ہے وہ رہزن سے کچھ زیادہ مختلف نہیں۔ راہبر کو قوم کے مسائل سے کوئی دلچسپی نہیں وہ بڑی آسانی سے اپنے فرائض سے کنارہ کر لیتا ہے۔

یہ بات کہہ کے ہوا ناخدا الگ مجھ سے　　یہ ہے سفینہ یہ گرداب ہے وہ ہے ساحل

راہنما غافل ہیں اسے خود علم نہیں کہ وہ کہاں سے چلا تھا کہاں آ نکلا۔ منزل کا تعین اور اس تک پہنچنے کی آرزو اور لگن اس میں موجود ہی نہیں۔ فرائض سے لاپروائی اس کا شعار ہے تو ایسے میں عوام عالم غیب سے صداؤں سے رہنمائی کے منتظر رہے ہیں اور رہنما سے بددل ہی نہیں خوفزدہ رہنے لگتے ہیں۔

کوئی رہبر نہ کہیں مل جائے　　نقش پا دیکھ کے ڈر جاتے ہیں

رہبر کے قدم سے ہے قدم پیشتر اپنا　　منزل پہ بھی ہو ختم نہ شاید سفر اپنا

خوف، اندیشہ، وسوسہ اور ڈر یہ جذبے کیوں اس کے دل میں گھر بنانے لگے ہیں۔ صرف ان حالات کی بنا پر جو کہ راہبر نے اپنے فرائض کی نفی کرتے ہوئے پیدا کیے ہیں۔ رہبر کم ذوق خود ہی منزل کا تعین نہیں کر سکا تو دل میں منزل تک پہنچنے کا جوش وحوصلہ کیسے پیدا ہو۔ خوف واندیشہ، امید ورجائیت پر آغاز سفر سے پہلے ہی حاوی ہوں تو کامیابی کی توقع کیا ہوگی۔

خوف رہزن بھی ہے اندیشہ رہبر بھی حفیظ　　منزلیں سخت ہیں آغاز سفر سے پہلے

اس کا حل حفیظ نے بے حد خوبصورت سوچا ہے اور اس پر عمل پیرا ہوئے ہیں۔

یہ راہ سخت ہے اے راہبر خدا کے لیے　　تجھے عزیز ہے جاں تو ہمارے ساتھ نہ چل

نہ ملتی ایک بھی منزل جو کوئی رہنما ہوتا　　ہزاروں منزلیں دیکھیں بشان گمرہی ہم نے

نہیں ایک منزل بھی رہبر کے پاس　　میری گمرہی کے ہزاروں مقام

راہبری راہزنی کے مترادف ہو چکی ہے۔ ذکر راہبر وراہزن اب ساتھ ساتھ کیا جاتا ہے۔ راہبری راہزنی ہو تو منزل کے دیوانے جان ومال کی پروا کرنا چھوڑ دیتے ہیں، لیکن منزل پر پہنچنے تک اندیشے ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔

ہجرت کا تجربہ اجتماعی طور پر اہم تھا۔ سبھی شاعران مراحل سے گزرے۔ اردو شاعری کی فضا میں تبدیلی پیدا ہوئی۔ الطاف گوہر چند تحریریں میں اردو شاعری کے انہی بدلتے ہوئے رجحانات کا تجزیہ فیض کی شاعری کے حوالے سے کرتے ہیں۔

ع　''لوٹ جاتی ہے ادھر کو بھی نظر کیا کیجئے'' اس مصرع میں ایک عجیب تڑپ اور بے اختیاری ہے۔ نظر جس پر بھی ہو اس سے ہمانا وفا کی روایت کو تاراج کرنا ہے لیکن یہاں صورت یہ ہے کہ نظر پہلے سے کسی اور شے پر تھی۔ محبوب کی کشش اسے اپنی طرف کھینچ لائی مگر نظر خود بخود اسی شے کی طرف لوٹ گئی جو شاعر کی حمایت کا محور بن چکی تھی ..... حفیظ ہوشیار پوری نے اور گہری بات کہی۔

رواں ہے قافلہ بے در اور بے مقصود　　جو دل گرفتہ ہے راہی تو رہنما غافل

یہ اضطراب، یہ شوق عروس آزادی　　اٹھا کے دیکھ تو لینا تھا پردۂ محمل

حساس طبیعتوں پر جو گزری یہ شعر اس کی خبر دیتے ہیں مگر معاملات فسادات کی ہلاکت خیزیوں یا رہبروں کی غفلت سے زیادہ سنگین تھے''۔[11]

یہ سنگینی ملک کے متذبذب مستقبل کی وجہ سے پیدا ہوئی تھی۔ ملک کی آزادی عوام کا مشترکہ خواب تھا۔ جس کی تعبیر بھی سبھی کو مشترک ملنا چاہیے تھی، لیکن ایسا نہ ہوا۔ آزادی کے اعلان کے بعد فسادات، آبادی کا تبادلہ، راہنما کے ساتھ ساتھ عوام کا اپنے فرائض سے غفلت برتنا۔ ایک جگہ رہتے ہوئے بھی اجنبیت کی فضا کا دم بدم پھیلتے جانا۔ اقتصادی بدحالی اور مہنگائی نے ہر فرد کو اپنی ذات تک محدود کر دیا۔ مشترکہ مفاد کو پس پشت ڈال کر صرف اپنی کامیابی اور ترقی کے لیے کوشاں رہنا، فرد کی سماجی معاشرتی و معاشی زندگی کو اور زیادہ بے ترتیبی اور بدنظمی دے گیا۔ عوام کا معیار زندگی انتہائی حد تک گر گیا اور وہ چند خاندان جو شاید عوام کے طبقے سے تعلق نہ رکھتے تھے۔ ہر گزرتا دن ان کے معیار زندگی کو بلند تر کرتا گیا۔ امیری وغریبی کے اس تفاوت نے بدعنوانیوں، خانہ جنگیوں، رشوت ستانی اور راتوں رات امیر بننے کی لگن کو جنم دیا۔ حالات کی یہ سنگینی گھٹنے کی بجائے بڑھتی گئی۔ قوم پر بے حسی اور مردنی چھانے لگی۔ نئے وطن کے مصائب نے ان کی کمر جھکا دی۔ جدوجہد کا ثمر انہیں آزادی کی صورت میں ملا، لیکن عوام بول اٹھے کہ جس منزل پر وہ پہنچے ہیں، اس کی آرزو تو انہوں نے نہ کی تھی۔ منزل پر پہنچ کر بھی وہ یہ کہنے پر مجبور ہو گئے کہ

ع　چلے چلو کہ وہ منزل ابھی نہیں آئی

روشنی کے متلاشی پھر بھیانک تیرگی کا شکار ہو گئے۔ امید صبح بہاراں خیال خام ثابت ہوئی اور شاعر پشیمان ہے کہ وہ کیوں حسین بہار کے دھوکے میں اپنے گلستان کو چھوڑ کر آ گیا۔

منزل حفیظ کی غزل کا ایک اور استعارہ، لیکن حفیظ بھی ہمراہان سفر کی مانند اس منزل کے متلاشی نہ تھے جو انہیں ملی۔

تمام عمر کیا ہم نے انتظار بہار　　بہار آئی تو شرمندہ ہیں بہار سے ہم

پہنچ گئے سر منزل مگر سکوں نہ ملا　　ہم اپنے ساتھ وہ ہنگامہ سحر لائے

آزاد وطن کا حصول یقیناً کٹھن مرحلہ ہے۔ لیکن آزاد ملک کو قائم ودائم رکھنا، اس کی آبرو برقرار رکھنا، اس کی ترقی وکامیابی کے لیے جوش ولگن سے کام کرنا صرف رہنما کا ہی فرض نہیں عوام بھی اس میں برابر کے شریک ہیں۔ ہم رہنماؤں کو ان کی غفلت پر ملامت کرتے رہے۔ ان کی سرشت وکردار کی بنا پر مسترد کرتے رہے اور نصف صدی گزرنے کے بعد تک ہمارا یہی شعار ہے۔

ہم بدلتے رہے رہنما رات دن　　اور بدلتے رہے رہنما راستے

ہمارا انہیں سرزنش کرنا جائز، لیکن کیا ہم نے اپنے فرائض تن دہی اور ایمان داری سے انجام دیے۔ کیا ہم نے تن آسانی کی عادت چھوڑی۔ وہ شوق اور وہ حوصلہ وہمت ہمارے جسم وجان میں موجود ہے جس کا متقاضی یہ ملک ہے۔

ہزاروں کارواں گم ہو گئے دشت تمنا میں　　سبک ساران منزل کی تن آسانی نہیں جاتی

شوق منزل ہے مگر ہمت یک گام نہیں　　مجھ سا رسوا کوئی تقدیر سا بدنام نہیں

اگر انسان اپنی اس خامی کو، جس کا اسے خود بھی احساس ہے، دور کر لے ہمت پیدا کر لے تو منزل کی طلب اور شوق اس میں وہ حوصلہ پیدا کرے گا کہ جس کی بنا پر کٹھن مراحل بھی مشکل معلوم نہ ہوں گے۔ منزل تک رسائی کے لیے وسیلے اور طریقے ہیں۔ انسان ہر طریقہ آزماتا ہے کہ شاید یوں وہ منزل کے قریب ہو جائے۔ کبھی عقل وشعور کو رہنمائی کے فرائض سونپتا ہے تو کبھی جذب وجنوں کو۔ منزل کی طلب میں کبھی وہ یوں بے خود ہو جاتا ہے کہ کارواں سے بچھڑ جاتا ہے قافلہ کو گم کر دیتا ہے۔ لیکن راہبر و کارواں سے دوری اسے ہراساں نہیں کرتی۔ وہ اپنی راہیں خود تلاشتا ہے۔ پیروی دنیا سے گریز اسے زیادہ اعتماد بخشتا ہے۔

گئی وہ پیروی رسم و راہ منزل بھی　　اصول جادہ و منزل بدلتے جاتے ہیں

اور جب اصول جادہ و منزل بدلتے جائیں تو یوں بھی ہوا ہے کہ:

ایک رستے کی بے انتہا منزلیں　　ایک منزل کے بے انتہا راستے
گم رہان منزل مقصود کو　　روز اک منزل نئی بخشی گئی
ہم کو منزل نے بھی گمراہ کیا　　راستے نکلے کئی منزل سے

قیام پاکستان کے حوالے سے کی جانے والی شاعری میں حفیظ کے کردار سے متعلق مظفر علی سید لکھتے ہیں:

''حفیظ کی ایک پوری غزل دیکھیے تاکہ اندازہ ہو کہ اس صنف سخن سے وہ کیا کام لینا چاہتا تھا۔

خوف تقلید راہبر ہی رہا　　اک قدم اس سے پیشتر ہی رہا
یوں ستارے شریک درد رہے　　دل کو اندیشہ سحر ہی رہا
کام آیا نہ خون صد منصور　　دار کا نخل بے ثمر ہی رہا
دل میں اک شور سا اٹھا تھا کبھی　　پھر یہ ہنگامہ عمر بھر ہی رہا
جلوہ در جلوہ حسن تھا مستور　　ماتم خفت نظر ہی رہا
آنسوؤں کو ملی نہ راہ خرام　　دامن چشم تھا کہ تر ہی رہا
کوئی بار وفا اٹھا نہ سکا　　یہ بھی الزام میرے سر ہی رہا
غم آفاق کا بیاں تھا حفیظ　　گرچہ روئے سخن ادھر ہی رہا

جس کسی کو لفظوں کی قدر و قیمت سے تھوڑی بہت آگہی میسر ہو، بہت جلد محسوس کرے گا کہ یہ غزل محض قافیے ردیف کا کھیل نہیں بلکہ اپنی جگہ مستحکم اور مربوط کلام کا نمونہ ہے۔ جس میں کسی ایک لفظ کو بھی ادھر سے ادھر کرنا بے حد مشکل ہے۔ اس کا اندرونی استحکام محض لفظوں اور آوازوں کے بل پر بھی قائم نہیں۔ اس میں سوچ بچار مشاہدے اور اس چیز کا پورا دخل ہے جسے تنقید حیات کا نام دیا گیا ہے۔ اگر ہم جانتے ہیں کہ یہ غزل قیام پاکستان کے چند برس کے بعد لکھی گئی ہے تو ہم اس کی عصری معنویت سے بیگانہ نہیں رہ سکتے ہیں مگر کیا یہ غزل اب بھی رک رک کر ہم سے کچھ کہتی ہوئی محسوس نہیں ہوتی؟ راہبر کی تقلید کا خوف اہل کارواں کا میر کارواں سے ایک قدم آگے چلنا۔ ان دیکھی صبح کا دھڑکا اور قربانیوں کے رائیگاں جانے کی اذیت۔ شاید یہ باتیں اس وقت کی باتیں نہیں۔ جب یہ حفیظ کے قلم سے نکلیں تھیں۔ اچھی شاعری ہمیشہ اپنے وقت کی کوکھ سے نکلتی ہے مگر اس میں جو اک قدم پیشتر جانے کی صلاحیت موجود ہوتی ہے۔ کسی باشعور لکھنے والے کے ہاتھوں آنے والے وقتوں کو بھی اپنے دامن میں سمیٹ سکتی ہے''۔ [۱۲]

ناامیدی اور مایوسی کی وجہ سے قوم پر بے حسی اور مردنی چھانے لگی۔ ماحول میں گھٹن بڑھنے لگی۔ انہیں احساس ہونے لگا کہ شاید وہ غلطی پر تھے۔ شاید انہوں نے اپنے آپ کو دھوکہ دیا ہے اس احساس نے افسردگی کی لہر کو اور تیز کر دیا۔ خون کی ہولی کے باوجود، ایک ہی خاندان کے افراد ایک دوسرے کے لیے غیر ملکی قرار پانے کے باوجود، بے شمار صدموں کی یلغار کے بعد کیا ان کا حق نہیں بنتا تھا کہ وہ اب سکھ کا سانس لیں، لیکن حالات کی روش یہی رہی۔ نظام اقتدار میں ناہمواری، طبقات میں تفاوت دلوں میں نفرتیں ذہنوں میں مسائل کا ہجوم۔ ان حالات نے عجب طرح کا سکوت پیدا کر دیا۔ لب خاموش ہیں دلوں میں الاؤ دہک رہے ہیں اور اگر کبھی کوئی بات کی بھی جاتی ہے تو لہجے کی تھکن اور بے چارگی نمایاں ہے۔

قفس بھی توڑ چکے ہیں، ستم نصیب حفیظ　　چمن میں شاخ کوئی بہر آشیاں بھی نہیں

اس آزادی کے لیے شعرا نے ترانے گائے تھے، لیکن جب وہ انہیں ملی تو اس تصور سے یکسر مختلف تھی جو ان کے ذہنوں میں موجود تھا۔ خوشی اور دکھ، کامیابی و ناکامی، آبادی و بربادی، شگفتگی و شکستگی، فخر و شرم سارے جذبے ایک دوسرے میں مدغم ہوتے نظر آنے لگے۔ مستقبل میں ایک نئی دنیا کی تعمیر کی خواہش متزلزل ہونے لگی۔ منزل تک رسائی ایک فرحت بخش لمحہ ہونا چاہیے تھا لیکن ایسا نہ ہو سکا۔ صبح امید کا انتظار اب بھی باقی رہا۔

بہت دنوں سے فسردہ سی ہے فضائے چمن　　صبا کہیں سے کوئی تازہ اب خبر لائے

زندگی راحت و رنج اور امید و یاس کا مجموعہ ہے انسان کبھی خوش ہوتا ہے تو کبھی گریہ کناں۔ یہ الگ بات کہ ہنسنے کے مواقع کم خواہ وہ طنزیہ ہنسی ہی کیوں نہ ہو اور حسرت و یاس کے لمحے اس کی زندگی میں زیادہ آتے ہیں۔

جدائی کا سماں ہے آج تک اپنی نگاہوں میں　　نہ کوئی بات کی تم نے، نہ کوئی بات کی ہم نے

یہ غزل ۱۹۴۷ء کے فسادات اور ہجرت کے پس منظر میں کہی گئی تھی۔ اور اس زمانے کی غزلوں کے انبار سے یہ ان چند غزلوں میں سے ہے جن میں اس عہد کا یہ تجربہ تخلیقی سطح پر گرفت ہوا ہے۔ تقسیم کے وقت حفیظ صاحب لاہور ہی تھے۔ ان کے اہل خاندان ہوشیار پور میں تھے اس قیامت میں اپنا سب کچھ کھو کر یہ خاندان لاہور پہنچا۔ [۱۳]

وہ فکر اور پریشانی، جو ان دنوں حفیظ نے جھیلی، ان کے لاشعور میں رچ بس گئی اور اسی باعث حفیظ نے وہ اشعار کہے جو آج بھی ذہنوں میں تازہ ہیں۔

ہجرت کے مصائب، نئے وطن کے نامساعد حالات اور درپیش مشکلات کبھی شعرا کا موضوع رہے، لیکن ایک پہلو نظروں سے اوجھل رہا۔ تقلیدی روش یا حالات کے تقاضوں کے پیش نظر شعرا نئے وطن کے حصول کے باوجود شکوہ کناں رہے اور شکر ادا کرنا بھول گئے۔ انہیں یہ احساس بھی نہ رہا کہ ان مشکلات پر اپنی محنت ریاضت اور دیانت سے قابو پانا ہے اور مسائل کو انہیں ہی حل کرنا ہے۔ انہیں یہ بھی یاد نہ رہا کہ آسمان سے من و سلویٰ اترنے کا وقت گزر چکا ہے اور وہ اپنی کوشش سے ہی اس سرزمین اور اس کے حالات کو سازگار بنا سکتے ہیں اور اگر ان کا عمل اس کے برعکس ہوگا تو وہ خود اپنی بربادی کو آواز دیں گے۔

''ہجرت کے ذریعے جن لوگوں کو فتح و نصرت دی جاتی ہے وہ سرزمین ہجرت میں شعائر اسلام کا نفاذ کرتے ہیں۔ اور اس وعدے پر انہیں اقتدار سونپا جاتا ہے۔ اگر وہ ہجرت کے تقاضوں کے پابند نہ رہیں تو اللہ انہیں بھی ایک دوسرے کے ذریعے معدوم کر دیتا ہے''۔ [۱۴]

ہجرت کے مفہوم کو منفی انداز میں اپنانے کے باعث مذہبی اصولوں کو فراموش کر دینے کی بنا پر ہم کئی بعد دیگرے عذابوں سے گزرتے رہے اور شکست و ریخت کی فضا میں جیتے رہے اور یہی فضا ہمارے شعر و ادب کا حصہ بنی۔

''...... پاکستانی ادیب ہجرت کے مفہوم کو یکسر سمجھ ہی نہیں سکا۔ وہ خون کا دریا دیکھ کر آنسوؤں کا دریا تو بہاتا رہا، لیکن خدا سے کیے ہوئے عہد کی خلاف ورزی پر اس کی آنکھ سے ایک آنسو نہ ٹپک سکا اور ہجرت نصرت کی بشارت کے طور پر ادب کا موضوع نہ بن سکی''۔ [۱۵]

حفیظ کے اشعار میں بھی نصرت کی بشارت بھرپور اور واضح انداز میں جا بجا سامنے نہیں آتی، لیکن مایوسی و یاسیت کی اس فضا میں جہاں حرص و ہوس کا رواج ہو ہر طرف تاریکی کے بادل چھائے ہوں حفیظ امید و رجائیت کا دامن ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔ مارچ ۱۹۴۹ء میں کہی گئی حفیظ کی غزل ملاحظہ کیجیے۔ ملکی حالات ابھی تک سنبھل نہیں پائے ہیں۔ مایوسی اور مسائل دونوں

میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے۔ حفیظ کی اس غزل میں ملک کو درپیش حالات کا تجزیہ بھی ہے۔ مایوسی، ناامیدی اور شرمندگی بھی ہے، اس کے ماضی، حال کا تذکرہ بھی اور مستقبل میں اپنی ہی کوشش اور محنت کی بنا پر خدا کی مدد کے ساتھ نصرت کی بشارت بھی۔

گزر رہے ہیں یہ کس موسم بہار سے ہم — الجھ رہے ہیں گریبان روز گار سے ہم
جبیں پہ گرد سفر ہے نظر میں عزم جواں — یہ کس دیار میں پہنچے ہیں کس دیار سے ہم
ہر اک قدم تھا یہاں موج خوں سے ہم آغوش — گزر کے آئے ہیں ایک ایسی رہ گزار سے ہم
فضا پہ چھائیں گے طوفان رنگ و بو بن کر — بہار بن کے جو نکلے ہیں شعلہ زار سے ہم
فروغ صبح کا ہے منتظر ابھی یہ جہاں — کہ سرگراں ہیں ابھی کلفت خمار سے ہم
تمام عمر کیا ہم نے انتظار بہار — بہار آئی تو شرمندہ ہیں بہار سے ہم
ستا سکے گی نہ پھر تلخی غم ہجراں — وہ عہد تازہ کریں گے نگاہ یار سے ہم
افق پہ حد نظر تک غبار چھایا ہے — حفیظ ابھریں گے آخر اسی بہار سے ہم

ہجرت کے بعد بھی ملک کے حالات سیاسی سطح پر متوازن نہیں رہے۔ انسان دوستی کی خواہش، ظلم و جور کے خلاف جدوجہد اور حق پرستی کی طلب ہر فرد کو تھی۔ تاریخ پاکستان کے ابتدائی دور میں خوابوں کی کرچیاں پاؤں اور دل زخم زخم کر رہی تھیں۔ آزادی فکر اور آزادی رائے کے متوالے کوئی آبلہ پا اس وادی پرخار میں آوے کے انتظار کے بجائے خود اس وادی پرخار میں کود پڑے تھے، جس کی انہیں کڑی سزائیں بھگتنی پڑی تھیں۔

''فیض کی گرفتاری اور ان پر سازش کے مقدمے، شعر و ادب سے متعلق افراد کے لیے ہی نہیں بلکہ ہر باشعور شہری کے لیے صدمے اور افسوس کا باعث ہوئے۔ ان کے ساتھی اس پر دل گرفتہ بھی تھے اور مضطرب بھی۔ سماجی انصاف اور امن عامہ کی حمایت میں اٹھائی جانے والی آوازوں میں غم بھی تھا اور غصہ بھی۔ احتجاج بھی تھا اور مزاحمت بھی۔ ممکن ہے اس وجہ سے حفیظ نظم کی بجائے غزل کی طرف آیا ہو کہ غزلیہ شاعری کے مدہم لہجے پر قانون کی گرفت بھی کسی حد تک کمزور ہو جاتی ہے۔ مگر نہیں۔ یہ لہجہ صرف غزل سے مخصوص نہیں۔ ادب اور تہذیب کی بنیادی خصوصیات میں سے ہے جبکہ بلند بانگ قسم کا جذبہ نفسیاتی کچے پن کی دلیل ہوتا ہے۔ پھر بھی پنڈی سازش کیس کے سلسلے میں فیض کی گرفتاری کے بعد گورنمنٹ کالج کی سالانہ نشست میں جب اس نے وہ غزل پڑھی:

نہیں پیام، رہ نامہ و پیام تو ہے — ابھی صبا سے کہو ان کے دل کو بہلائے
خدا دراز کرے عمر نالہ ہائے فراق — جو بار بار در زنداں سے جا کے ٹکرائے
غرور جادہ شاہی بجا سہی لیکن — سراغ منزل مقصود بھی کوئی پائے
گزر گیا کوئی درماندہ راہ یہ کہتا — اب اس فضا میں کوئی قافلے نہ ٹھہرائے
نجانے ان کے مقدر میں کیوں ہے تیرہ شبی — وہ ہمنوا جو سحر کو قریب تر لائے

تو مجھے یاد ہے کہ سارے ہال میں ایک ایسا سناٹا چھا گیا تھا جس میں نوجوان سامعین کے سہم جانے کی آواز صاف سنی جا سکتی تھی۔ سب لوگ دم بخود اور ہراساں تھے کہ فیض صاحب کا کچھ بگڑے نہ بگڑے اس غریب کی نوکری اور بچوں کا مستقبل کیا ہوگا۔ خدا کا شکر ہے کہ بات کو دل میں رکھ کر نشتر بنانے والا یہ شاعر جو اپنے الفاظ میں اذن کلام سے محروم تھا۔ اس طرح پٹ پڑنے کے باوجود محفوظ رہ گیا۔ اگرچہ یہ معلوم نہیں کہ نوکری میں پالیسی کی سطح کو جو اس سے دور رکھا گیا یا بہت سے نروس بریک ڈاؤن جو اس نے جھیلے اور طویل عالم نزع میں کوتاہی نفس کے جس عذاب کا اس نے مقابلہ کیا، اس کے لیے کس کس کا شکریہ ادا کیا جائے''۔[16]

حفیظ ترقی پسند تحریک کے متوازی چلنے والے حلقے ارباب ذوق سے متعلق تھے۔ ترقی پسند تحریک نے اپنے اصول و نظریات میں شدت کے باعث ایک طرف تو تخلیق کاروں کے ایک بڑے حصہ کو اپنے دائرہ اثر میں لیا ہوا تھا تو دوسری طرف وہ شاعر و ادیب بھی تھے جو اس کی شدت پسندی کی بنا پر اس سے گریزاں تھے۔ اس بات سے انکار ممکن نہیں کہ ترقی پسند تحریک زندگی کے حقائق کو جو تند بھی تھے اور تلخ بھی، بے نقاب کرنے میں کوشاں رہی۔ اور ہر تخلیق کار خواہ وہ کسی بھی تحریک یا نظریے سے تعلق رکھتا ہو زندگی کے حقائق کو نظر انداز نہیں کر سکتا۔ خواہ ان حقائق کا تعلق معاشی حالات سے ہو یا سیاسی انحطاط سے، چنانچہ حفیظ کی غزل میں بھی مقتدا اعلیٰ کے ظلم و جبر، استحصال و ناانصافی کے خلاف واضح اشارے موجود ہیں۔

'' شاید اسی قسم کے اشتراک نظر کے پیش نظر سردار جعفری صاحب نے حفیظ ہوشیار پوری کا نام ترقی پسندوں کی فہرست میں لکھ رکھا اور اس سے پہلے کچھ ایسے ہی اسباب کی بنا پر کرشن چندر نے ترقی پسند غزل گوئی کے نمائندہ شاعروں میں فراق، ندیم اور جذبی کے ساتھ نئے زاویے کی دوسری جلد میں حفیظ کی بھی ایک غزل شامل کی تھی۔ مگر یہ سوال کرنا بے محل نہ ہوگا کہ فیض کی گرفتاری پر بنچر (Explode) ہونے کا مفہوم کیا ہے۔ کیا واقعی حفیظ ہوشیار پوری فیض کی پارٹی لائن میں اپنے ''ہمنوا'' سے متفق تھا؟ کوئی بھی آدمی جو حفیظ یا اس کے کلام سے آشنا ہو اس کے ترقی پسندانہ خیالات و جذبات کے باوجود بلکہ انہی کی گہرائی کی وجہ سے یہ تسلیم نہیں کر سکتا کہ اجتماعی بقا اس کا مسئلہ نہیں تھا..... فیض صاحب کی زندانی خطوط دوستوں کے تغافل کی شکایتوں سے بھرے ہیں اور اس پس منظر میں جب فیض صاحب کو حفیظ کی غزل کا پتہ چلتا ہے تو ان کو ایک ایسی خوشی حاصل ہوتی ہے جس کا انہیں انتظار تھا''۔[17]

(پی ایچ ڈی کے مقالے ''حفیظ ہوشیار پوری، بیسویں صدی کی اردو غزل کے تناظر میں'' کے ایک باب سے اقتباس)

## حواشی


۱۔ ممتاز شیریں، نیا ادب، ماہ نو، چالیس سالہ مخزن، ۱۹۸۷، ص ۱۹۷
۲۔ ڈاکٹر آفتاب احمد، اشارات تنقید، کراچی، مکتبہ دانیال، اگست ۱۹۹۶ء
۳۔ ڈاکٹر سید عبداللہ، مقام غزل، دیباچہ۔ اردو اکیڈمی سندھ ۱۹۷۳ء، ص ۲۷۔۲۸
۴۔ فضل حق قارونی، مقالہ ایم اے اردو ۱۹۷۳ء۔ پنجاب یونیورسٹی، ص ۷۴۔۷۵
۵۔ حفیظ، حالات زندگی، فن اور فنکار۔ افکار حفیظ نمبر مارچ ۱۹۷۳ء، ص ۹۵
۶۔ ضیا جالندھری، افکار، حفیظ نمبر ۱۹۷۳ء، ص ۱۰۰
۷۔ شان الحق حقی، مقام غزل، کراچی، اردو اکیڈمی سندھ ۱۹۷۳ء، ص ۹۰۸
۸۔ انور سدید، حفیظ ہوشیاری پوری کی غزل۔ اوراق، ستمبر، اکتوبر ۱۹۷۳ء، ص ۷۷۔۷۸
۹۔ عشرت رحمانی، پاکستان سے پاکستان تک، مقبول اکیڈمی ۱۹۸۸ء، ص ۳۷۴۔۳۷۵
۱۰۔ وزیر آغا، ۱۹۵۸ء کی اردو شاعری، نقوش ۱۹۵۹ء، ص ۱۲۵
۱۱۔ الطاف گوہر، چند تحریریں، اسلام آباد، مطبوعات حرمت، ۱۹۸۸ء، ص ۲۲۷
۱۲۔ مظفر علی سید، نئے زاویے کا پرانا غزل گو، نقوش ستمبر ۱۹۷۴ء، ص ۳۷۶
۱۳۔ انتظار حسین، افکار حفیظ نمبر مارچ ۱۹۷۳ء، ص ۷۷
۱۴۔ امین راحت چغتائی، داخل، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۳ء، ص ۳۱
۱۵۔ مظفر علی سید، نئے زاویے کا پرانا غزل گو، نقوش، ستمبر ۱۹۷۴ء، ص ۳۷۸
۱۶۔ ایضاً
۱۷۔ ایضاً، ص ۳۷۹

# بابائے اردو کی نودریافت تحریر

## ''تہذیب الاخلاق کے فرائض''

طاہر مسعود

بابائے اردو مولوی عبدالحق (۲۰ راگست ۱۸۷۰ء۔ ۱۶ راگست ۱۹۶۱ء) کا شمار اردو کے شیدائیوں میں ہوتا ہے۔ انہوں نے ساری زندگی اردو زبان اور ادب کی جو بےلوث خدمت کی، اس کا اندازہ ان کی مستند تصانیف ''قواعد اردو''، ''اردو صرف ونحو''، ''قدیم اردو''، ''اردو زبان میں اصطلاحات کا مسئلہ''، ''اردو کی ابتدائی نشوونما میں صوفیائے کرام کا حصہ''، ''مرحوم دہلی کالج''، ''سرسید احمد خاں۔ حالات وافکار''، ''نصرتی''، ''تنقیدات عبدالحق''، ''مقدمات عبدالحق''، ''خطبات عبدالحق'' کے علاوہ اردو لغت، کلاسیکی ادب کے اعلیٰ نمونوں کو منظر عام پر لانے جیسے منصوبوں اور مختلف موضوعات پر سینکڑوں قابل قدر مضامین سے بخوبی ہو جاتا ہے۔ اصل میں علی گڑھ کی فضا نے ان کے ادبی ذوق کو خوب جلا بخشی۔ اپنے ایک خطبے میں علی گڑھ کالج کے بانی سرسید احمد خاں کے احسانات کا ذکر کرتے ہوئے مولوی عبدالحق نے اس پوری فضا کا نقشہ کھینچا ہے، جس کے اثرات خود ان کی ذات پر مرتب ہوئے۔ فرماتے ہیں کہ ''... سید کے احسانات سے کون انکار کر سکتا ہے۔ یہ گوناگوں ہیں۔ لیکن ان کا سب سے بڑا احسان اردو زبان پر ہے۔ اس نے زبان کو پستی سے نکالا، انداز بیان میں سادگی کے ساتھ قوت پیدا کی، سنجیدہ مضامین لکھنے کا ڈول ڈالا، سائنٹیفک سوسائٹی کی بنیاد ڈالی، جدید علوم وفنون کے ترجمے انگریزی سے کرائے، خود کتابیں لکھیں اور دوسروں سے لکھوائیں، اخبار سائنٹیفک سوسائٹی (علی گڑھ انسٹیٹیوٹ گزٹ) جاری کر کے اپنے انداز تحریر، بےلاگ تنقید اور روشن خیالی سے اخبار نویسی کا پایہ بڑھایا، تہذیب الاخلاق کے ذریعے اردو ادب میں انقلاب پیدا کیا، ٹائپ کو رواج دیا۔ ان بزرگوں کی سعی وعمل سے علی گڑھ اردو ادب اور روشن خیالی کا ایسا مرکز ہو گیا تھا جس کی فضیلت اور برتری سب نے تسلیم کی تھی۔ یہ اردو زبان کے فروغ اور اوج کا زمانہ تھا۔''[۱] سرسید اور رفقائے سرسید کی صحبت کا فیضان سمجھیے کہ مولوی عبدالحق میں بہت جلد قلم تھام لینے کا حوصلہ پیدا ہو گیا۔ ان کی ابتدائی تحریروں میں پہلے نمبر پر ''گندم'' نامی مضمون بیان کیا جاتا ہے، جو ۱۸۹۲ء کے ''سرمور گزٹ'' میں اس وقت چھپا، جب مولوی عبدالحق علی گڑھ کالج میں گیارھویں جماعت کے طالب علم تھے۔ دوسرے نمبر پر ستمبر ۱۸۹۳ء کے ''محمڈن ایجوکیشنل میگزین'' میں ''مذاق'' کے عنوان سے چھپنے والا مضمون آتا ہے اور ان کے بعد ''اوپر کی آمدنی''، ''سنہ ہجری''، ''اب مردوں کی ضرورت نہیں رہی''، ''ہلال اور تارا'' اور ''اردو اخبارات کے ایڈیٹروں کو نیک صلاح'' نامی مضامین بیان کیے جاتے ہیں[۲]۔

مقام افسوس کہ بابائے اردو کی تحریر ''تہذیب الاخلاق کے فرائض'' (۲۹ دسمبر ۱۸۹۴ء) ابتدائی تحریر ہونے کے باوجود نگاہوں سے اوجھل رہی اور مولوی عبدالحق کی تحریروں کو کھنگالنے والوں کی رسائی اس تک نہ ہو سکی، حالانکہ مولوی عبدالحق کے ہونہار شاگرد شیخ چاند مرحوم[۳] اس تحریر کے بارے میں پورا علم رکھتے تھے اور ۱۹۳۰ء کی پہلی سہ ماہی میں مولوی عبدالحق پر ایک مضمون لکھتے ہوئے، اس کی نشاندہی واضح طور پر کر چکے تھے۔ طالب علمی کے زمانے سے مولوی عبدالحق کی اردو سے وابستگی اور دلبستگی کا ثبوت فراہم کرتے ہوئے شیخ چاند لکھتے ہیں کہ ''... جس زمانہ میں مولوی صاحب بی۔ اے میں تعلیم پاتے تھے آپ نے تہذیب الاخلاق کے لئے ایک مضمون لکھا تھا جس میں ہندوستان کے اس مشہور انقلاب انگیز رسالہ کو بڑی آزادی سے یہ بتایا تھا کہ اس کے فرائض کیا ہیں ان میں ایک ضروری اور ناگزیر فرض ''اردو کو ترقی دینا'' بھی تھا[۴]۔'' اسی طرح اخلاق الرحمٰن قدوائی نے بھی ایک مقام پر اپنے موقف کی تائید کے لیے اس طرف ہلکا سا اشارہ کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ ''... حالی اور سرسید کی خدمات اردو کے سلسلے میں اس عظیم الشان کارنامے کو بھی شامل کرنا پڑے گا کہ انھوں نے مولانا عبدالحق جیسا اردو کا محسن ادیب اور نقاد پیدا کیا۔''

ہمارا یہ خیال محض قیاس آرائی پر نہیں بلکہ واقعات پر مبنی ہے۔ چنانچہ دوران تعلیم میں مولانا کے جذبۂ خدمت میں ڈوبے ہوئے مضامین اردو زبان وادب کی ترقی کے متعلق ''تہذیب الاخلاق'' اور ''علیگڈھ میگزین'' میں شائع ہوتے رہے[۵]۔'' ان دونوں بیانات میں سے شیخ چاند کا بیان، اس لیے اہم ہے کہ وہ زیر بحث تحریر کے مندرجات پر ٹھیک ٹھیک روشنی ڈالتا ہے۔ اس سے یہ سمجھ لینا چاہیے کہ بابائے اردو کی مذکورہ تحریر ان کی نگاہوں سے گزر چکی تھی۔ شیخ چاند کی زندگی نے وفا نہ کی اور عین عالم جوانی میں ۱۹۳۶ء میں اس دنیا سے کوچ کر گئے، ورنہ ضرور تھا کہ وہ اپنے استاد گرامی بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق کی اس تحریر کو گوشۂ گمنامی کی نذر ہونے سے بچا لیتے۔

بعد کے زمانے کے محقق اور مدون جو بابائے اردو کی اور ان کے بارے میں لکھی گئی تحریروں کی غواصی کرتے رہے، نے شیخ چاند کے واضح اشارے کو صحیح طور پر نہ سمجھا شاید اس لیے کہ شیخ چاند نے تو بی۔ اے کے زمانے کا ذکر کیا تھا، لیکن اخلاق الرحمٰن قدوائی نے اس زمانے پر اصرار نہیں کیا اور شاید اس لیے بھی کہ مولوی عبدالحق پر کام کرنے والے محققین جن میں ''سرمایۂ اردو'' کے حوالے سے حافظ محمود شیرانی کا نام بھی آتا ہے، کافی عرصے تک علی گڑھ میں ان کے ورود اور خصوصاً بی۔ اے کرنے کا صحیح سن ہی متعین نہ کر سکے۔ اس سلسلے میں سب سے پہلی کوشش نرگس صادق نے ۱۹۶۹ء میں کی۔ انہوں نے ''محمڈن کالج ڈائرکٹری'' جیسے حوالے اور ''مضامین محفوظ علی'' پر مولوی عبدالحق کے مقدمے کو بنیاد بنا کر ان کے بی۔ اے کرنے کا سن ۱۸۹۵ء بیان کیا[۶]۔ اس ضمن میں بابائے اردو کے ہم جماعت مولانا ظفر علی خاں پر ۱۹۷۰ء میں پی۔ ایچ۔ ڈی کرنے والے محقق ڈاکٹر نظیر حسنین زیدی نے نرگس صادق کے نتائج سے اتفاق کرتے ہوئے معاملے کو ایک قدم اور آگے بڑھایا۔ انہوں نے مولوی عبدالحق کے سرسید پر تحریر کردہ خاکے، جو مولوی عبدالحق نے ۱۴ر فروری ۱۹۴۱ء کو شعبہ اردو، آل انڈیا ایجوکیشنل کانفرنس علی گڑھ میں خطبہ صدارت کے طور پر پیش کیا تھا، سے ۱۸۹۴ء کے بیان کردہ ایک واقعے کا تجزیہ کرتے ہوئے ثابت کیا ہے کہ اس وقت مولوی عبدالحق بی۔ اے کے سال اول میں تھے۔ اس طرح انہوں نے مولوی عبدالحق کے بی۔ اے کرنے کا سن ۱۸۹۵ء بیان کیا ہے۔ تاہم بہت سے محققین اور مدونوں نے ان تحقیقات کے نتائج سے صرف نظر کرتے ہوئے مولوی عبدالحق کا بی۔ اے کرنے کا سن بدستور ۱۸۹۴ء لکھنے کا سلسلہ جاری رکھا اور سابق تحریروں پر حاشیہ تک درج کرنے کی زحمت نہیں کی۔

اگر مولوی عبدالحق پر کام کرنے والے محققین اور مدون ان کے علی گڑھ کے زمانہ قیام کا واضح طور پر تعین کر لیتے تو شاید وہ اس دور کی گہرائیوں میں اترتے ہوئے اس تحریر تک پہنچنے میں کامیاب ہو جاتے، لیکن ایسا نہ ہوا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ان سے بڑی مضحکہ خیز غلطیاں سرزد ہوئیں۔ پروفیسر ڈاکٹر سید معین الرحمن نے اپنے زمانہ طالب علمی میں مولوی عبدالحق پر ایک مضمون لکھا، جو ''آخری بادل'' کے عنوان سے مرحوم مولوی عبدالحق کی پہلی برسی کے موقع پر ''ماہ نو'' کراچی میں شائع ہوا۔ اس زمانے میں ''ماہ

نو'' کے مدیر ظفر قریشی تھے۔ اس مضمون پر ادارے کی طرف سے تحریر کردہ نوٹ میں یہ بھی لکھا گیا ہے کہ'' ... ذیل کے مضمون میں ایک عقیدت مند طالب علم نے اس '' آخری بادل'' کو مختلف پہلوؤں سے دیکھنے کی کوشش کی ہے اور اس کی دلچسپی یہ ہے کہ خود بابائے اردو نے اپنی وفات سے تھوڑی دیر پہلے اسے ملاحظہ بھی فرمالیا تھا۔ (ادارہ)[۸]'' اس مضمون میں ڈاکٹر سید معین الرحمٰن بابائے اردو کی زیر بحث تحریر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ'' ... انہوں نے ابھی لوئر مڈل کا امتحان بھی پاس نہ کیا تھا کہ سرسید کے'' تہذیب الاخلاق'' میں ان کا ایک مضمون شائع ہو گیا جسے بہت سراہا گیا اور اس نوجوان صاحب قلم کے خیالات پر جو اردو کے مستقبل پر ظاہر کیے گئے تھے، ہر جگہ داد دی گئی[۹]۔'' پھر جب پروفیسر ڈاکٹر سید معین الرحمٰن نے اپنے اس مضمون کو ۱۹۶۸ء میں اپنی مرتب کردہ کتاب '' نقد عبدالحق'' میں '' مولوی عبدالحق کی علمی اور ادبی خدمات'' کے عنوان سے شامل کیا، تو مولوی عبدالحق کے ملاحظے کی سند پانے والی اس تحریر میں وجہ بتائے بغیر '' لوئر مڈل'' کو'' انٹرنس'' میں تبدیل کرتے ہوئے لکھا کہ'' ... انہوں نے ابھی انٹرنس کا امتحان بھی پاس نہیں کیا تھا کہ سرسید کے'' تہذیب الاخلاق'' میں اردو زبان کے مستقبل کے موضوع پر ان کا ایک مضمون شائع ہوا جس پر اس نوعمر اہل قلم کو ہر طرف سے داد ملی[۱۰]۔'' غور کیا جائے تو '' لوئر مڈل'' کو کسی سند کے بغیر '' انٹرنس'' میں تبدیل کرنے کا عمل محقق پر چھائی بے یقینی کی کیفیت کو عیاں کرتا ہے۔

دیگر باتوں سے قطع نظر موصوف کے بیان کے مطابق '' تہذیب الاخلاق'' کی تاریخ سے رجوع کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ '' تہذیب الاخلاق'' بوجوہ مختلف وقفوں سے تین بار شائع ہوا۔ پہلی بار ۲۵ر دسمبر ۱۸۷۰ء سے ۱۱ر اگست ۱۸۷۷ء تک شائع ہوا۔ پھر ایک سال ساڑھے آٹھ ماہ کے وقفے بعد دوسری بار ۲۴ر اپریل ۱۸۷۹ء سے ۲۶ر اگست ۱۸۸۱ء تک شائع ہوا۔ اس کے بعد پھر بارہ سال اور ساڑھے سات ماہ کے طویل وقفے بعد ۷ر اپریل ۱۸۹۴ء سے ۳ر فروری ۱۸۹۷ء تک سہ بارہ شائع ہوا۔ اس کے بعد اس کی انفرادی حیثیت ختم کر کے اسے '' علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ'' میں ضم کر دیا گیا[۱۱]۔ ان حقائق کی روشنی میں یہ مضحکہ خیز صورت حال سامنے آتی ہے کہ پروفیسر ڈاکٹر سید معین الرحمٰن کے بیان کردہ زمانے میں '' تہذیب الاخلاق'' کی اشاعت ہی بند رہی، نیز اس بار کا تعطل رسالے کی اشاعت کا سب سے بڑا وقفہ تھا یعنی ستمبر ۱۸۸۱ء سے مارچ ۱۸۹۴ء تک۔ اتنے بڑے وقفے کی زد میں تو قبل از '' لوئر مڈل'' ہو کہ قبل از '' انٹرنس'' دونوں ہی زمانے آجاتے ہیں۔ اس پر طرہ یہ کہ زیر بحث تحریر مولوی عبدالحق کی وہ اکلوتی تحریر ہے، جو'' تہذیب الاخلاق'' کی زینت بنی گویا اس بات کی قطعاً کوئی گنجائش نہیں کہ پروفیسر ڈاکٹر معین الرحمٰن کے بیان کو'' تہذیب الاخلاق'' میں شامل مولوی عبدالحق کی کسی دوسری تحریر سے متعلق سمجھ لیا جائے۔ یقیناً ان کا بیان زیر بحث تحریر ہی کے بارے میں ہے، جو لوئر مڈل یا انٹرنس سے قبل کے زمانے سے نہیں بلکہ بی۔ اے کے زمانے سے تعلق رکھتی ہے۔

یوں محسوس ہوتا ہے کہ پروفیسر ڈاکٹر سید معین الرحمٰن نے حافظ محمود شیرانی کے بیان سے حوالہ درج کیے بغیر استفادہ کیا ہے۔ حافظ محمود شیرانی چونکہ غلط طور پر مولوی عبدالحق کو علی گڑھ کے ابتدائی طلباء میں شمار کرتے تھے، اس لیے انہوں نے لکھا تھا کہ '' ... ۱۸۷۹ء میں آپ نے سرسید کے شہرہ آفاق رسالہ '' تہذیب الاخلاق'' میں پہلے پہل اردو زبان کے مستقبل پر مضمون لکھا[۱۲]۔'' حافظ محمود شیرانی کا بیان کردہ سن چونکہ قابل قبول نہیں تھا، اس لیے پروفیسر ڈاکٹر سید معین الرحمٰن زمانہ تحریر کو اپنے طور پر تبدیل کرتے رہے، جبکہ شیرانی کے بیان کردہ غلط موضوع پر انہیں کوئی شبہ نہ ہوا اور زیر بحث تحریر کو حقائق کے برعکس اردو زبان کے مستقبل سے وابستہ کرنے کے مرتکب ہوئے۔

زیر بحث تحریر '' تہذیب الاخلاق کے فرائض''، '' تہذیب الاخلاق'' کی تیسری اشاعت[۱۳] کی جلد اول، شمارہ نمبر ۱۰، یکم رجب سنہ ۱۳۱۲ھ بمطابق ۲۹ر دسمبر ۱۸۹۴ء میں مضمون نمبر ۵۶ کے طور پر صفحہ ۱۹۶۔۱۹۵ پر درج ہے۔ اگرچہ یہ تحریر'' تہذیب الاخلاق'' کی ۲۹ر دسمبر ۱۸۹۴ء کی اشاعت میں شائع ہوئی، تاہم یہ اکتوبر ۱۸۹۴ء کی محررہ ہے۔ اس بات کی شہادت خود اس تحریر سے مل جاتی ہے، مولوی عبدالحق نے اس تحریر میں ایک مقام پر لکھا ہے کہ'' ... پچھلے پرچہ میں ہمارے مکرم حبیب اللہ خاں صاحب نے اس پر ایک دلچسپ مضمون لکھا ہے'' مولوی عبدالحق نے جس مضمون کا تذکرہ کیا ہے، وہ '' تہذیب الاخلاق'' کے ساتویں شمارے میں شائع ہوا تھا، جو ۲ر اکتوبر ۱۸۹۴ء کی اشاعت ہے۔ دوسرے یہ وہی مضمون ہے، جس کے جواب میں مولوی عبدالحق کی زیر بحث تحریر سامنے آئی۔ اس ساتویں شمارے کے بعد '' تہذیب الاخلاق'' کا آٹھواں شمارہ ۳۱ر اکتوبر ۱۸۹۴ء کو شائع ہوا۔ مولوی عبدالحق نے ساتویں شمارے کو پچھلا پرچہ بیان کر کے ظاہر کر دیا ہے کہ اس تحریر کو لکھتے ہوئے ابھی آٹھواں شمارہ منظر عام پر نہیں آیا تھا۔ اس طرح یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ یہ تحریر ۲ر اکتوبر ۱۸۹۴ء کے بعد اور ۳۱ر اکتوبر ۱۸۹۴ء سے قبل لکھی گئی۔ گویا یہ تحریر اکتوبر ۱۸۹۴ء میں قلم بند ہوئی اور بوجوہ دسمبر ۱۸۹۴ء میں زیور طبع سے آراستہ ہوئی۔

ڈپٹی نذیر احمد کے اصرار پر جب '' تہذیب الاخلاق'' کی تیسری اشاعت کا سلسلہ شروع ہوا تو اس کے دوسرے شمارے میں نواب محسن الملک مہدی علی خاں نے '' مرحوم تہذیب الاخلاق کا دوبارہ زندہ ہونا[۱۴]'' کے عنوان سے قوم کی تمدنی اور اخلاقی زندگی پر اس کے متوقع اثرات پر گفتگو کرتے ہوئے، انگریزی تعلیم سے پیدا ہونے والی آزادی کی خرابی یعنی الحاد کا تذکرہ کیا، جس پر ایڈیٹر نے نوٹ تحریر کرتے ہوئے بزرگان قوم کو دعوت دی کہ وہ تجویز کریں کہ ملحدانہ خیالات پر بند کیسے باندھا جا سکتا ہے۔ پھر سرسید احمد خاں کو بعض احباب کے خطوط موصول ہوئے، جن میں شکایت کی گئی تھی کہ '' تہذیب الاخلاق'' کے مضامین اعلیٰ، مفید اور پر جوش نہیں ہوتے۔ ان خطوط کے جواب میں سرسید نے چھٹے شمارے میں '' تہذیب الاخلاق'' کے عنوان سے ایک مختصر سا مضمون لکھا، جس میں انہوں نے بتایا کہ انہیں حوصلہ افزائی کے خطوط بھی موصول ہوئے ہیں اور بحث کو سمیٹتے ہوئے لکھا کہ'' ... پس ہم اپنے دوستوں سے چاہتے ہیں کہ وہ ہم کو بتلاویں کہ حال کا تہذیب الاخلاق کس رنگ کا ہونا چاہیے۔ اور کس قسم کے مضامین اس میں مندرج ہونے مناسب ہیں اور قوم کے لیے مفید اور ضروری ہیں۔ جہاں تک ہماری سعی سے ممکن ہے ہم اس کی اصلاح پر کوشش کریں گے[۱۵]۔'' اس کے جواب میں ساتویں شمارے میں علی گڑھ کالج کے ایک سابق طالب علم حبیب اللہ خاں[۱۶] جو علی گڑھ کے تعلیم یافتہ اور عمدہ جواب مضمون لکھنے پر گولڈ میڈل پا چکے تھے، نے '' تہذیب الاخلاق کا کام[۱۷]'' کے عنوان سے ایک تفصیلی مضمون لکھا، جس میں انگریزی تعلیم کے ساتھ ساتھ تربیت کا بندوبست کرنے اور زمانے کے تقاضوں کے مطابق مذہبی تعلیم کا انتظام کرنے پر توجہ دلائی گئی تھی۔ حبیب اللہ خاں کے اس مفصل مضمون کے جواب میں مولوی عبدالحق نے دسویں شمارے میں '' تہذیب الاخلاق کے فرائض'' کے عنوان سے ایک جامع مضمون لکھا، جو زیر بحث ہے۔ یہ مضمون ایسا جامع و مانع تھا کہ '' تہذیب الاخلاق'' کے متعلق یہ بحث مزید آگے نہ بڑھ سکی یعنی مولوی عبدالحق کے زمانہ طالب علمی کے یہ خیالات حرف آخر تصور کیے گئے۔ یہ مضمون خیالات کے اعتبار سے مولوی عبدالحق کی بالغ نظری اور گہرے شعور کی نشاندہی کرتا ہے، جو ان کی دیگر ابتدائی تحریروں میں کم کم نظر آتا ہے۔ اس مضمون میں مولوی عبدالحق نے مسلمانوں میں قومی اتحاد پیدا کرنے، توہمات اور باطل خیالات کی بیخ کنی کر کے مسلمانوں کی سماجی حالت کو بہتر بنانے، مشاہیر کے سبق آموز حالات پیش کرنے اور اردو زبان کی اہمیت اور حیثیت کو انگریزی زبان کے برابر قرار دیتے ہوئے اسے ترقی دینے جیسے خوشگوار فریضے '' تہذیب الاخلاق'' کو یاد دلائے۔ بابائے اردو کی اس تحریر کو اس زمانے میں نہایت قدر کی نگاہ سے دیکھا گیا۔ غالباً اسی مضمون پر مولوی عبدالحق کو '' لارڈ لینسڈون وائسرائے[۱۸] سلور میڈل'' عطا کیا گیا کیونکہ '' محمڈن کالج ڈائرکٹری'' میں میڈل ملنے کا سن ۱۸۹۰ء[۱۹] اور بابت کے ذیل میں

وجہ بیان کرتے ہوئے ''عمدہ جواب مضمون لکھنے پر'' تحریر کیا گیا ہے۲۰۔ دوسری طرف سرسید احمد خاں نے سال کے آخر پر ''تہذیب الاخلاق'' کے تیسرے دور کی پہلی جلد کے مضامین کی فہرست مرتب کی تو اس میں عبدالحق کی طالب علمانہ حیثیت کو نمایاں کرتے ہوئے نام کے ساتھ ''طالب علم مدرسۃ العلوم علی گڑھ۲۱'' لکھا۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ مولوی عبدالحق کے علی گڑھ کے طالب علم ہونے کی حیثیت کو بنیاد بنا کر ''تہذیب الاخلاق'' میں چھپنے والی اس تحریر پر انہیں علی گڑھ کالج کی طرف سے سلور میڈل کا حق دار سمجھا گیا۔ بابائے اردو مولوی عبدالحق کے ایک سو آٹھ سال قبل شائع ہونے والے مضمون ''تہذیب الاخلاق کے فرایض'' کا متن۲۲ ملاحظہ فرمائیں:

''تہذیب الاخلاق نے جو بڑا اثر مسلمانوں پر ڈالا اس سے کوئی انکار نہیں کرسکتا۔ کسی میگزین، کسی اخبار، کسی رسالہ نے ہماری قوم کے خیالات میں اتنا بڑا تغیر نہیں پیدا کیا ہے۔ اس کا اور اس کے اڈیٹر کا احسان ان ممالک کے مسلمانوں پر ہمیشہ رہے گا۔ اگر تہذیب الاخلاق برابر جاری رہتا اور بند نہ ہو جاتا تو اس میں کچھ شک نہیں کہ اس میں وہ غیر معلوم تبدیلیاں واقع ہو جاتیں جس کی آج ہمیں ضرورت معلوم ہوتی ہے۔ یا جس کی وجہ سے یہ بات معرض بحث میں ہے کہ تہذیب الاخلاق کو قطع نظر اس کے کہ اس نے پہلے کیا کیا اور وہ کیا کر چکا ہے، اس زمانہ میں مسلمانوں کے لیے کیا کرنا چاہیے۔

اب چونکہ تہذیب الاخلاق نے ایک عرصہ کے بعد دوبارہ جنم لیا ہے۔ اس لیے اس بات کی ضرورت پڑی کہ جو لوگ مسلمانوں کے حالات اور خیالات سے دلچسپی رکھتے ہیں۔ اس کی نسبت اپنے خیالات ظاہر فرمائیں۔ چنانچہ پچھلے پرچہ۲۳ میں ہمارے مکرم حبیب اللہ خاں صاحب نے اس پر ایک دلچسپ مضمون لکھا ہے اور نہایت خوبی سے بتایا کہ مسلمانوں میں کس چیز کی بڑی کمی ہے مگر یہ نہ بتایا کہ تہذیب الاخلاق کا کیا کام ہے۔

تہذیب الاخلاق کا جو مقصد قرار دیا گیا ہے وہ نہایت قابل تعریف اور اعلیٰ درجہ کا ہے اور جب تک تہذیب الاخلاق جاری رہے گا اس میں تغیر و تبدل کی یقیناً کوئی ضرورت معلوم نہ ہوگی۔ بحث طلب بات صرف یہ ہے کہ یہ قابل قدر مقصد کیونکر اور کس ڈھنگ سے عمل میں لایا جائے اور اس میں کوئی دقت واقع نہ ہوگی، اگر اس کی وضع میں زمانہ کے مطابق ذرا تراش خراش کر دی جائے۔ گو ایسا کرنے میں اس کی وضعداری میں فرق ضرور آ جائے گا۔

۱۔ سب سے پہلا فرض تہذیب الاخلاق کا یہ ہے کہ وہ مسلمانوں کی قوم میں نیشنلیٹی کا خیال پیدا کرے اور جب تک یہ خیال ہماری قوم میں پیدا نہ ہوگا ہم کبھی اعلیٰ ترقی اور تہذیب کے رتبہ تک نہیں پہنچ سکتے۔ کیا فائدہ ہوگا ایسی تعلیم کا اگر ہم ہندوستان میں ایک نیشن بن کر نہ رہیں اور مسلمانوں میں مختلف جرگے قائم ہو جائیں جن کے مقاصد اور اغراض ایک دوسرے سے کچھ تعلق نہ رکھتے ہوں۔ جس کا نتیجہ صاف ادبار ہوگا۔ کیونکہ جب قوم ہی متفرق اور پریشان ہوگئی تو ان مختلف جرگوں کا سنبھالنا خود ان کے لیڈروں کے بس کا نہ رہے گا اور وہ خود سر ہو کر تباہ و برباد ہو جائیں گے۔ اگرچہ مسلمانوں سے ہمیں یہ توقع ہرگز نہیں رکھنی چاہیے، مگر پھر بھی تہذیب الاخلاق کا یہ فرض ہے کہ قوم کے ہر فرد بشر کے سامنے یہ خیالات پیش کرے اور ان کے دلوں میں قومیت کے خیال کو پورے طور سے متمکن کر دے اور اسلامی اخوت کے رشتہ کو اس قدر مضبوط کر دے کہ توڑے نہ ٹوٹ سکے۔ اگرچہ یہ کام ملک کے تعلیم یافتہ نوجوانوں اور خصوصاً انگلینڈ کے تعلیم یافتہ مہذب جنٹلمینوں کا ہے، مگر ان کی لاپروائی غضب کر رہی ہے اور اس لیے مجبوراً ہمیں تہذیب الاخلاق کی طرف جھکنا پڑتا ہے۔

اس میں کچھ شک نہیں کہ قوم کرنے سے بنتی ہے نہ کہنے سے، مگر جب تک کہا نہ جائے، بتایا نہ جائے اور ایسے خیالات کی اشاعت نہ کی جائے لوگ اس بڑے مقصد کے لیے کیونکر آمادہ ہو سکتے ہیں۔ اور یوں تو اپنی قوم کے فدائی وہ کچھ کر گزرتے ہیں جسے دیکھ کر ایک عالم کو تحیر ہوتا ہے۔ ایک شخص تن تنہا افریقہ کے قلق و دق صحرا اور طوفان خیز ریگستانوں کے حالات دریافت کرتے جاتا ہے جہاں خونخوار قومیں آباد ہیں۔ کیوں؟ صرف اس لیے کہ وہاں کے حالات دریافت کرنے کا فخر میری قوم کو ہو۔ ایک باہمت وسیع سمندروں کو کھوندتا ہوا تو کل بحر اچلا جا رہا ہے۔ اس لیے کہ کسی طرح میری قوم متمول ہو اور ایک نئی دنیا آباد کرے۔ ایک اپنے آپ کو قربان کرتا ہے تاکہ باقی قوم سرسبز اور خوشحال ہو جائے۔ دوسرا اپنی جان جوکھوں میں ڈالتا ہے اور تباہ و برباد ہو جاتا ہے تاکہ لاکھوں آدمی اس کے تجربہ اور مشاہدہ سے فائدہ اٹھائیں۔ جب تک یہ خیالات ہم میں پیدا نہ ہوں گے ہم کچھ نہیں کر سکتے۔ ہم لوگوں میں کچھ فدائی۲۴ پیدا ہونے چاہئیں جو ان مقاصد کی تکمیل میں کوشش کریں۔

۲۔ دوسرا فرض تہذیب الاخلاق کا یہ ہے کہ وہ مسلمانوں میں توہمات باطلہ کو دور کرے۔

تہذیب الاخلاق کو اس میں عظیم الشان کامیابی ہوئی ہے۔ اس نے چند سالوں میں بہت سے باطل توہمات، پوچ خیالات، فضول اور بیہودہ اعتقادات کو جڑ اور بنیاد سے اکھاڑ ڈالا، اور باقی جو ہیں وہ بھی مٹتے جاتے ہیں۔ یہ توہمات خواہ سائنس کے متعلق ہوں یا مذہب کے متعلق یا سوشل حالت کے متعلق، ان سب کا دور کرنا تہذیب الاخلاق کا فرض ہے۔

۳۔ تیسرا کام تہذیب الاخلاق کا یہ ہے کہ وہ کبھی کبھی ملک کے سامنے دنیا کے بڑے بڑے نامور لوگوں کے عظیم الشان کارنامے پیش کرے۔ یہ طرز ہمیشہ مفید ثابت ہوا ہے۔ کیونکہ ہر ایک باہمت گزشتہ ناموروں اور مشاہیر کے قدم بقدم چلنا چاہتا ہے اور ان کے حالات سے سبق حاصل کرتا ہے۔ یہاں تک کہ بعض اوقات ان حالات کے پڑھنے سے مردہ دلوں میں بھی ایک جوش پیدا ہو جاتا ہے۔ علاوہ اس کے اس قسم کی تحریریں اردو زبان کے لیے سرمایہ ناز ہوں گی۔

۴۔ اردو زبان کو ترقی دینا۔

جو اسی قدر ضروری ہے جتنا انگریزی زبان سیکھنا اور جاننا۔ اسی فرض کو تہذیب الاخلاق نے نہایت خوبی کے ساتھ ادا کیا ہے اور اب کی بار جو تہذیب الاخلاق جاری ہوا تو جناب سید محمود صاحب نے اس فرض کے ادا کرنے میں پیش قدمی کی، جو بالکل نیا ڈھنگ ہے جو پہلے اختیار نہیں کیا گیا تھا۲۵۔

اس میں اردو نظم اور مختلف علمی مضامین بھی شامل ہیں جو زبان کی اصلی ترقی کی بنیاد ہیں۔

یہ ہیں تہذیب الاخلاق کے فرایض جو بجا لانے چاہئیں، جس سے وہ ہندوستان کے مسلمانوں کے لیے نہایت مفید اور ضروری ثابت ہوگا۔ گو وہ اس وقت بھی اپنی طرز کا ایک بے نظیر پرچہ ہے۔

راقم

عبدالحق''

# حواشی وتعلیقات

۱ ''خطبہ صدارت، شعبہ اردو، آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس، منعقدہ علی گڑھ، ۱۴ر فروری ۱۹۴۳ء'' از عبدالحق، اردو، سہ ماہی، دہلی، جلد ۲۴، نمبر ۹۰، اپریل ۱۹۴۳ء، ص ۲۲۳_۲۲۲

۲ ''بابائے اردو کی ابتدائی تحریریں'' از نرگس عظیم، قومی زبان، ماہنامہ، کراچی، ستمبر ۱۹۷۲ء، ص ۱۹

۳ شیخ چاند مرحوم مولوی عبدالحق کے عزیز شاگرد تھے۔ وہ ۱۹۰۶ء میں پٹن ضلع اورنگ آباد میں پیدا ہوئے۔ مڈل تک تعلیم پٹن کے مقامی مدرسے سے حاصل کی۔ اس کے بعد مدرسہ فوقانیہ عثمانیہ اورنگ آباد میں داخل ہوئے۔ یہاں سے میٹرک کیا تو ساتھ ہی اورنگ آباد کالج کا قیام عمل میں آ گیا۔ یہاں شیخ چاند مولوی عبدالحق کے شاگرد ہوئے اور یونیورسٹی کی آخری جماعت تک ان کی شاگردی میں رہے۔ قانون کی تعلیم بھی حاصل کی۔ ۱۹۳۰ء میں ایم۔ اے کا امتحان پاس کیا۔ ایم۔ اے کے بعد بابائے اردو کی تجویز اور سفارش سے انہی کی نگرانی میں جامعہ عثمانیہ کی مجلس تحقیقات علمیہ کے لیے سودا کے کلام پر مقالہ لکھنے کا آغاز کیا۔ تحقیقی وتنقیدی صلاحیتوں سے مالا مال تھے۔ رسالہ ''اردو'' میں کئی تحریریں ان کی یادگار ہیں۔ مولوی عبدالحق کے خاکوں کے مجموعے ''چند ہم عصر'' کا پہلا ایڈیشن بھی انہی کی کوششوں کا ثمرہ تھا، جو ان کی وفات کے بعد ۱۹۳۸ء میں منظر عام پر آیا۔ سودا پر ان کا کام تپ دق جیسی بیماری کے باعث معرض التواء میں رہا، لیکن مولوی عبدالحق کے ''تشدد انہ تقاضوں'' کے سبب بیماری کے عالم میں تصنیفی کام محض ایک ماہ میں انجام دیا۔ مولوی عبدالحق کو یہ کام اتنا پسند آیا کہ انہوں نے اسے انجمن ترقی اردو کی طرف سے چھاپنے کا فیصلہ کیا۔ یہ کتاب چھپ رہی تھی اور شیخ چاند نے ابھی اس کا اشاریہ ترتیب دینا تھا کہ ۱۹۳۶ء میں ان کا انتقال ہو گیا۔

۴ ''مولوی عبدالحق صاحب کا مقصد زندگی'' از مولوی شیخ چاند مرحوم، رسالہ جوہر، دہلی، انجمن اتحاد جامعہ ملیہ اسلامیہ، (مارچ ۱۹۴۰ء)، عبدالحق نمبر، ص ۴۳

۵ ''مولانا عبدالحق کی تنقید نگاری'' از اخلاق الرحمٰن قدوائی، جامعہ، ماہنامہ، دہلی، جلد ۳۳، نمبر ۱۲، دسمبر ۱۹۴۰ء، ص ۹۲۶

۶ ''بابائے اردو کے ابتدائی حالات'' از نرگس صادق، قومی زبان، ماہنامہ، کراچی، ستمبر ۱۹۶۹ء، ص ۷

۷ مولانا ظفر علی خاں۔ احوال وآثار، ڈاکٹر نظیر حسنین زیدی، لاہور، مجلس ترقی ادب، ۱۹۸۶ء، ص ۴۳_۴۲

۸ ''آخری بادل'' از معین الرحمٰن، ماہ نو، ماہنامہ، کراچی، اگست ۱۹۶۲ء، ص ۱۱

۹ ایضاً

۱۰ نقد عبدالحق، پروفیسر ڈاکٹر سید معین الرحمٰن (مرتب)، لاہور، الوقار پبلی کیشنز، ۱۹۹۵ء، ص ۴۰۱

۱۱ تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان وہند (نویں جلد)، سید فیاض محمود، ڈاکٹر عبادت بریلوی (مدیران خصوصی)، لاہور، پنجاب یونیورسٹی، ۱۹۷۲ء، ص ۸۲

۱۲ سرمایۂ اردو، حافظ محمود شیرانی (مرتب)، لاہور، سیکنڈری ایجوکیشن بورڈ، ۱۹۵۷ء، ص ۳۲۱

۱۳ تیسری اشاعت پر اگرچہ "NEW SERIES EDITED BY M. ENAYET ULLAH,B.A." لکھا جاتا تھا، تاہم عملاً سرسید ہی اس کے ادارتی فرایض انجام دیتے تھے۔

۱۴ ''مرحوم تہذیب الاخلاق کا دوبارہ زندہ ہونا'' از مہدی علی، تہذیب الاخلاق، علی گڑھ، جلد اول، شمارہ ۲، یکم ذیقعدہ ۱۳۱۱ھ بمطابق ۶ر مئی ۱۸۹۴ء، ص ۲۰_۱۷

۱۵ ''تہذیب الاخلاق'' از سید احمد، تہذیب الاخلاق، علی گڑھ، جلد اول، شمارہ نمبر ۶، یکم ربیع الاول ۱۳۱۲ھ بمطابق ۲ر ستمبر ۱۸۹۴ء، ص ۱۰۲

۱۶ حبیب اللہ خاں جو خاں بہادر ڈپٹی حبیب اللہ خاں کے نام سے مقبول ہوئے، شاہجہانپور میں جنوری ۱۸۶۸ء میں پیدا ہوئے۔ ۱۸۹۲ء میں علی گڑھ سے بی۔ اے کیا۔ ۱۸۸۹ء میں علی گڑھ کے سنڈنس یونین کلب کے وائس پریذیڈنٹ منتخب ہوئے۔ انجمن الفرض کے خادم مقرر ہوئے۔ ۱۸۹۲ء میں عمدہ جواب مضمون لکھنے پر انہیں سر آکلینڈ کالون گولڈ میڈل عطا کیا گیا۔ علی گڑھ سے فارغ التحصیل ہونے کے بعد ضلع علی گڑھ کے مقام اترولی میں نائب تحصیلدار اور تحصیلدار رہے۔ مسلم یونیورسٹی سے گہری محبت تھی۔ اسی محبت میں آبائی وطن کو خیر باد کہہ کر علی گڑھ میں آ گئے تھے اور یہیں ولایت منزل کے نام سے اپنی کوٹھی تعمیر کی تھی۔ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے معاملات سے خوب واقف تھے۔ ''علی گڑھ کا کرکٹ'' کے عنوان سے ۱۹۴۱ء میں ان کی ایک کتاب چھپی جبکہ صاحبزادہ آفتاب احمد خاں وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی سوانح پر مشتمل کتاب ''حیات آفتاب'' کے نام سے ۱۹۵۶ء میں شائع ہوئی۔ طویل عمر پائی۔ مارچ ۱۹۶۱ء میں انتقال ہوا۔

۱۷ ''تہذیب الاخلاق کا کام'' از حبیب اللہ خاں، تہذیب الاخلاق، علی گڑھ، جلد اول، شمارہ ۷، یکم ربیع الثانی ۱۳۱۲ھ، بمطابق ۲ر اکتوبر ۱۸۹۴ء، ص ۱۲۶_۱۲۳

۱۸ لارڈ لینسڈن (Lord Lansdowne) ۱۴ر جنوری ۱۸۴۵ء کو لندن میں پیدا ہوئے۔ اہم عہدوں پر فائز رہے۔ وزیر اعظم سالسبری نے انہیں ہندوستان کا وائسرائے مقرر کیا۔ وہ ۱۸۸۸ء سے ۱۸۹۳ء تک ہندوستان کے وائسرائے کی حیثیت سے فرائض انجام دیتے رہے۔ یہاں انہوں نے امپیریل لائبریری اور ریکارڈ آفس قائم کیا۔ ریلوے اور نہری نظام کو پھیلایا۔ اسی زمانے میں انڈین کونسل ایکٹ پاس ہوا، جس کی رو سے ارکان کونسل کو مالی معاملات وغیرہ کو زیر بحث لانے کا اختیار دیا گیا۔ روپے کی حیثیت کو مستحکم کیا گیا اور افغانستان کے ساتھ سرحدی امور طے پائے۔ ان کی وفات ۳ر جون ۱۹۲۷ء کو ہوئی۔

۱۹ ڈاکٹر سید معراج نیر نے مولوی عبدالحق پر اپنے پی۔ ایچ۔ ڈی کے مطبوعہ مقالے (بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق فن اور شخصیت، لاہور، الوقار پبلی کیشنز، ۱۹۹۵ء) کے صفحہ ۳۰ پر مولوی عبدالحق کو لارڈ لینسڈن وائسرائے سلور میڈل ملنے کا سن ۱۸۹۴ء کے بجائے ۸۹_۱۸۸۸ تحریر کیا ہے، جو حقائق کے منافی ہے۔

۲۰ محمدن کالج ڈائرکٹری، ممبران الفرض (مرتبین)، علی گڑھ، محمدن پریس، (۱۸۹۶ء)، ص ۱۳۰

۲۱ فہرست مضامین تہذیب الاخلاق، من ابتدائے شوال ۱۳۱۱ھ لغایت رمضان ۱۳۱۲ھ، ص ۳

۲۲ ''تہذیب الاخلاق'' سے متن کو بذریعہ کمپیوٹر کمپوزنگ پیش کرنے میں املاء کی پیروی ممکن نہیں تھی، خصوصاً اس زمانے میں ''ٹ''، ''ڑ'' اور ''ی'' کی جو املاء رائج تھی، وہ اب ترک بھی کی جا چکی ہے۔ لہٰذا اس مضمون میں رائج الوقت املاء کو اپنایا گیا ہے، نیز توام الفاظ کو الگ کرنے اور ''ھ'' کو ''ہ'' سے بدلنے جیسی معمولی تبدیلیوں کے علاوہ الفاظ وتراکیب ''تہذیب الاخلاق'' کے عین مطابق ہیں۔

۲۳ مراد ہے ''تہذیب الاخلاق'' کی گزشتہ اشاعتوں میں شمارہ نمبر ۷۔

۲۴ مولوی عبدالحق نے اپنی تحریروں میں سرسید احمد خاں کو قوم کا فدائی قرار دیا ہے۔ دیکھئے:

(i) سرسید احمد خاں۔ حالات وافکار، بابائے اردو مولوی عبدالحق، کراچی، انجمن ترقی اردو پاکستان، (اشاعت سوم) ۱۹۹۸ء، ص ۷۸

(ii) ''سرسید احمد خاں'' از ڈاکٹر مولوی عبدالحق، کارواں، کراچی، جون ۱۹۵۲ء، ص ۱۵

۲۵ اشارہ ہے ناول کے ترجمے کی جانب۔ سید محمود نے وائسرائے ہند لارڈ لٹن کے والد لارڈ بلورلٹن کے تصنیف کردہ ناول ''ایلی'' کا ترجمہ ''محاصرہ غرناطہ'' کے نام سے کیا جو ''تہذیب الاخلاق'' کی تیسری اشاعت میں قسط وار شائع ہوتا رہا۔ سید محمود نے تمہیدی کلمات میں اس کی اشاعت کے حوالے سے لکھا کہ ''... اس سے دو فائدے مترتب ہیں اول تو یہ کہ اسپین کے مسلمانوں کے آخری حالات تاریخی دلچسپی کے ساتھ معلوم ہوں گے اور دوسرے یہ کہ جو لوگ کہ اردو لٹریچر کو ترقی دینا چاہتے ہیں اور زبان انگریزی نہیں جانتے ان کو اس مختصر ناول کے دیکھنے سے معلوم ہوگا کہ انگریزی میں ناول لکھنے کا طرز وانداز کیا ہے''۔

(''محاصرہ غرناطہ'' مترجمہ سید محمود، تہذیب الاخلاق، علی گڑھ، جلد اول، نمبر ۲، یکم ذیقعدہ ۱۳۱۱ھ، بمطابق ۶ر مئی ۱۸۹۴ء، ص ۳۰)

# اقبال شناسی

مبصر: ڈاکٹر وزیر آغا

حال ہی میں علامہ اقبال پر ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور کی طرف سے پروفیسر منظور احمد صاحب کی کتاب اقبال شناسی شائع ہوئی ہے۔ یہ کتاب اس لحاظ سے اہم ہے کہ قاری کے ذہن میں کئی سوال پیدا کرتی ہے۔ کتاب کی اہمیت کے پیش نظر ہم نے بعض ماہرین اقبالیات سے رجوع کیا تا کہ وہ اپنے اپنے تاثرات بیان فرمائیں۔ اس شمارے میں تین مقالے شامل کرنے کا ارادہ تھا جو تین مختلف الخیال ماہرین اقبالیات کے تجزیے پر مشتمل ہوتے۔ پروفیسر فتح محمد ملک اپنا تجزیہ ارسال نہیں کر پائے۔ اس شمارے میں ڈاکٹر وزیر آغا اور ڈاکٹر وحید عشرت کے مقالے شائع کیے جا رہے ہیں۔ ان میں دو مختلف زاویہ ہائے نظر سے کتاب پر تبصرے کیے گئے ہیں۔ کتاب کی اہمیت کے پیش نظر امید ہے قارئین ان مقالات سے فائدہ اٹھائیں گے۔

**مدیر**

''اقبال شناسی'' کے عنوان سے جناب منظور احمد نے اقبال کے افکار اور نظریات پر مضامین کا جو مجموعہ پیش کیا ہے وہ نہ صرف دقیق فلسفیانہ اور سائنسی مباحث کے حوالے سے قابل قدر ہے بلکہ ان کی اپنی فکری گہرائی کا بھی ثبوت فراہم کرتا ہے۔ انہوں نے اپنی اس کتاب میں اقبال کے افکار کی وضاحت کرنے کے علاوہ ان پر تنقید بھی کی ہے۔ جس سے سوچ بچار کی نئی راہیں نمودار ہوئی ہیں۔ ان کا یہ کہنا کہ:

''تمام علوم کے نتائج اس کلی نقطہ نظر کو پیش کرتے ہیں جو سائنسی نقطہ نظر کہلاتا ہے، جو کسی ایک سائنس یا اس کے کسی ایک جزو ہی سے متعلق نہیں رہتا بلکہ اس کی بنیاد پر ایک فلسفیانہ کلی تصور جنم لیتا ہے''۔

بجائے خود ایک ثبت اور ہمہ گیر زاویہ نظر ہے۔ بقول منظور احمد صاحب:

''مذہب اور اخلاق بھی انسانی زندگی کے معاشرتی ارتقا کی ضرورت اور تنازع للبقا میں ایک مفید اور معاون عامل کی حیثیت سے متعارف ہوتے ہیں''۔

حقیقت یہ ہے کہ مندرجہ بالا کلی نقطہ نظر جدید طبیعیات کے Web of Relations کی صورت میں اس طور سامنے آیا ہے کہ اب طبیعیات اور مابعد الطبیعیات میں موجود فاصلے بھی معدوم دکھائی دینے لگے ہیں۔ بالخصوص ایم تھیوری نے (جو طبیعیات کی جدید ترین تھیوری ہے) ایک ایسا منظر نامہ پیش کر دیا ہے جہاں وجود اور موجود باہم مربوط اور جلی اور خفی ایک ہی حقیقت کے دو رخ دکھائی دیے ہیں۔ اقبال کے ہمہ گیر زاویہ نظر کو نشان زد کرتے ہوئے جب منظور احمد صاحب اقبال کی دو باتوں یعنی:

۱۔ سائنس کا ارتقا انسان کو کائنات کے محدود مطالعہ سے آگے بڑھا رہا ہے۔

۲۔ سائنس بھی انسان کو اس حقیقت کی طرف متوجہ کر رہی ہے جو انسان کے مذہبی تجربے کا موضوع ہے

کو پیش کرتے ہیں تو خوشی ہوتی ہے کہ خود اقبال نے بھی اس قسم کے کلیوں کہ سائنس کا موضوع فقط حسی تجربیاتی مواد ہے یا یہ کہ سائنس حقیقت کے محض ظاہری احوال سے بحث کرتی ہے یا پھر یہ کہ حسی تجربیاتی مواد کو اسباب و علل کے سلسلے میں منسلک کرنا سائنس کا کام ہے، سے ایک قدم آگے بڑھا کر سائنس کی حدود کی کشادگی اور مذہبی تجربے کے حوالے سے حقیقت کے ادراک کی کاوش کا بھی ذکر کیا تھا، گویا اقبال نے اس زمانے میں بھی جب ابھی علوم زیادہ تر اجزا کے مطالعہ کی طرف راغب تھے، ایکا ایسے کلی زاویہ نگاہ کو اپنایا جو امتزاج اور انضمام کا حامل تھا۔

کتاب کے آخری مضمون میں منظور احمد صاحب نے اقبال کے حوالے سے لکھا ہے:

''اگر اقبال کی فکر کو آگے بڑھایا جائے تو شاید آج کی تشکیل فکر اسلامی کے اصول کے طور پر ہم کہہ سکیں کہ حقیقت وہ ہے جو ہمارے اوپر منکشف ہوئی ہے۔ انسان اس انکشاف میں اتنا ہی شریک ہے جتنی کہ حقیقت!''

یہ ایک اہم نکتہ ہے جو عرفان حقیقت کو دو آئینوں کے ایک دوسرے کے روبرو آنے کا عمل قرار دیتا ہے، یعنی ایک ایسا عمل جس سے عکسوں کا ایک لامتناہی سلسلہ وجود میں آتا ہے۔ ویسے اس بات کو بھی نظر انداز نہیں کرنا چاہیے کہ کائنات کا آغاز انرجی سے ہوا۔ پھر مادے کا دور آیا۔ اس کے بعد زندگی کا! زندگی تدریجی ارتقا کے عمل سے گزر کر مآل کار انسانی شعور پر منتج ہوئی اور 'کیا'۔ 'کس نے'۔ 'کب'۔ 'کیسے' اور 'کیوں' ایسے سوالات پوچھنے لگی۔ چونکہ زندگی بھی اس کائنات کا ایک اہم رنگ اور جزو ہے لہذا ہم کہہ سکتے ہیں کہ کائنات مختلف مدارج سے گزرنے کے بعد اب اس مقام پر آ پہنچی ہے جہاں خود اسے اپنا ادراک ہونے لگا ہے اور یہ ادراک اسے اپنے اس جزو کے ذریعے سے ہو رہا جسے 'انسان' کا نام ملا ہے، گویا انسان میں کائنات کا نطق ہے اور جب انسان سوال اٹھاتا تو در حقیقت خود کائنات یہ سوال اٹھا رہی ہوتی ہے۔ لہذا جب ہم کہتے ہیں کہ حقیقت انسان پر منکشف ہوئی ہے تو اس کا مطلب یہ بھی ہے کہ خود کائنات 'خود انکشافی' کے عمل سے گزرنے لگی ہے، یعنی اسے اپنا ہی عرفان حاصل ہو رہا ہے!

# ''اقبال شناسی'' کی خطرناک جہتیں

مبصر: ڈاکٹر وحید عشرت

محترم پروفیسر ڈاکٹر منظور احمد سابق صدر شعبہ فلسفہ جامعہ کراچی، سابق صدر پاکستان فلسفہ کانگرس اور سابق وائس چانسلر ہمدرد یونیورسٹی کراچی، فلسفے کے کہنہ مشق استاد اور جدید فکر و ذہن کے مالک دانشور کی حیثیت سے اپنی طویل شناخت رکھتے ہیں۔ انہوں نے اقبال شناسی کے نام سے کتاب رقم کی ہے جسے اقبال شناس طبقے نظر انداز نہیں کر سکتے۔ زیر نظر تبصرہ بھی اس سلسلے کی کڑی ہے۔ ڈاکٹر صاحب اپنے پیش لفظ میں فرماتے ہیں کہ اقبال پر جو کچھ لکھا جا چکا ہے وہ پاکستانی امت کے لیے کافی ہونا چاہیے۔ ان تلوں (فکر اقبال مراد ہے) میں اب مزید تیل باقی نہیں ہے جسے نچوڑا جا سکے۔ سوچنے کی بات یہ ہے کہ جب ان تلوں میں تیل ہے ہی نہیں تو انہوں نے کس لیے سعیٔ رائیگاں فرمائی ہے۔ تاہم ان کی اس بات سے اختلاف نہیں کیا جا سکتا کہ ابھی تک لوگوں نے اپنی علمی روایت کے مطابق فکر اقبال پر حاشیے زیادہ لکھے ہیں، تدوین، تشریح و تدوین اور تحقیق کا کام کیا ہے فکر اقبال کا خالص علمی اور فلسفیانہ بنیادوں پر تجزیہ بہت ہی کم کیا ہے، کچھ کام مختلف فلاسفہ سے تقابلی مطالعے کا بھی ہوا ہے مگر اس میں بھی یار ان تیز گام نے اقبال کو ہی پچھاڑنے کی کوشش کرتے ہوئے اسے نٹشے، گوئٹے، ہیگل، ولیم جیمز اور ایسے ہی دوسرے فلاسفہ اور شعرا جیسے دانتے وغیرہ کا خوشہ چین بنا دیا ہے۔ اقبال اپنی شناخت کہاں کراتے ہیں اور ان کی فکر کی انفرادیت کہاں متشخص ہوتی ہے، اس کو تو بالکل ہی غتر بود کر دیا گیا ہے۔ یہ میدان پہلے کی طرح اب بھی خالی ہے۔ ان تلوں میں ابھی تک تیل موجود ہے جسے ڈاکٹر منظور جیسے فلاسفہ اور علما کو نچوڑنا ہے کہ جدید عصری تناظر میں فکر اقبال کس قدر موثر ہے اور اس وقت جب سوشلزم کے انہدام کے بعد مغرب نے اپنی تہذیبی جنگ قوت اور اسلحہ کے زور سے اور کمزور قوموں کے وسائل ہڑپ کرنے کے لیے چین (کنفیوشس ازم) اور مسلمانوں (اسلام) کے خلاف برپا کر رکھی ہے دیکھنا یہ ہے کہ ہم اقبال سے یا اقبال کے فکری ماخذات سے کوئی ایسی قوت پا سکتے ہیں کہ تہذیبوں کے اس ٹکراؤ میں فتح یاب ہو سکیں اور آزاد منڈی کی معیشت اور مغربی تہذیب کے ارتقا کی آخری حد جمہوریت کو اس انداز سے اپنائیں کہ ہماری دنیا ان مضرات سے محفوظ رہ کر نوع انسانی کو جینے کی کوئی نئی امنگ اور آدرش دے سکے کیونکہ مغربی اور امریکی دانشور فوکویاما اور ایڈگلٹن وغیرہ تو مغربی سیکولرازم اور نتائجی تصوریت کا نکتہ کمال قرار دے کر تاریخ کے رکنے اور خاتمے (End of History) کا المناک مژدہ سنا چکے ہیں۔ کہ چونکہ انسانی فکر و ذہن اس کمال سے آگے نہیں جا سکتا اس لیے تاریخ کا خاتمہ ہو چکا اور اکانومی کی موت واقع ہو چکی۔ مغربی امریکی تہذیب نے انسانیت کو اسلحہ کے ڈھیر پر ہی نہیں لا بٹھایا، انسان سے جینے کی امنگ اور حوصلہ بھی چھین لیا ہے۔ ایسے میں اقبال اور ان کا فکری اثاثہ ہمیں کہاں لا کھڑا کرتا ہے۔ وہ کس اخلاقی کمال (Ideal) اور خودی سے ہمیں یقین، ویژن اور اعتماد سے باثروت کرتے ہیں کہ ہم نئی عصری مبارزتوں سے نبرد آزما ہو سکیں۔ یہ پورا باب ابھی تک بند ہے۔ ڈاکٹر منظور احمد اور ہم جیسے اقبال شناس اگر اس طرف بڑھ سکیں تو خوب۔ ورنہ یہ تسلیم کر لیں کہ اقبال کے نہیں ہمارے تلوں میں تیل باقی نہیں رہا اور ہم کوئی نیا تخلیقی عمل کرنے کی بجائے ذہنی مجلوقیت میں مبتلا ہیں۔

ڈاکٹر منظور احمد نے اپنی تخلیق کے دو مقاصد بیان کیے ہیں۔

> ''اول تو یہ کہ ان (اپنے چھ مقالات) میں اقبال کی فکر کا کسی قدر تجزیہ اور جن باتوں سے میں اختلاف رکھتا ہوں وہ بلا خوف لومتہ لائم بیان کر دی گئی ہیں''۔
>
> ''دوسری وجہ یہ ہے کہ ہمارا قومی مزاج شخصیتوں کے حوالوں کو معتبر مانتا ہے اور اس مضمون میں جس نئی جہت کی طرف میں متوجہ کرنا چاہتا ہوں اس کے لیے اقبال کا حوالہ شاید مفید ہو، اور میری بات کے گوش شنوا تک پہنچنے میں کسی حد تک ممد و معاون ہو''۔

ہم ڈاکٹر منظور احمد کی ''اقبال شناسی'' کو متذکرہ صدر حوالوں سے ہی دیکھنے کی سعی کریں گے۔ تاہم اقبال کے خطبات کے دیباچہ کے تتبع میں ہی انہوں نے کہا ہے کہ مختلف مقدمات اور قضیات پر غور و فکر کا دروازہ جو اقبال نے کھولا تھا وہ اس کو کھلا رکھنا چاہتے ہیں اور کسی بھی استنتاج کے حرف آخر ہونے پر اصرار نہیں کرتے۔ کیونکہ کوئی فکر مختتم نہیں ہوتی، یہ کبھی آہستہ اور کبھی انقلابی طور پر آگے بڑھتی ہے۔ مسلمانوں کا جمود اس وجہ سے ہے کہ انہوں نے معاشرتی علوم میں بھی فکر کے اپنے پیراڈائم کو حرف آخر سمجھا۔ علم، ایمان کا معاملہ نہیں بلکہ قضیات سے متعلق ہے جو اگرچہ صادق ہی کیوں نہ ہوں، کاذب ہونے کا امکان رکھتے ہیں۔ ایسے تمام قضایا جس میں کذب کا امکان نہ پایا جاتا ہو علم سے متعلق نہیں ہوتے البتہ ایمان سے متعلق ہوتے ہیں۔ اس اہم اور اصولی گفتگو کے بعد وہ اقبال کے ہی بیان کو دہراتے ہیں کہ جب تک وہ اپنے علمی پیراڈائم پر نظر ثانی نہیں کریں گے ان کی فکر منجمد رہے گی اور وہ دنیا کے مسائل سے نبرد آزما ہونے کے قابل نہیں ہوں گے۔ ڈاکٹر منظور احمد مجھ سے یقیناً اتفاق کریں گے کہ اقبال کے تمام مقالات، خطوط، شاعری اور بالخصوص خطبات کا بنیادی مقصد ہی یہ ہے کہ وہ مسلمانوں پر طاری پانچ سو سالہ جمود توڑنا چاہتے ہیں۔ جدید علوم و معارف، سائنس اور دانش کے حاصلات سے اسلامی فکریات کی تطبیق و توضیح اور تبصرہ و تشکیل کر کے عصر جدید کی مبارزتوں سے نمٹنے کے لیے مسلمانوں کو ایک نیا ذہن دینا چاہتے ہیں۔ اس لحاظ سے اقبال مسلم جدیدیت اور نشاۃ ثانیہ کی سب سے بلند آہنگ آواز ہیں اور شاید ڈاکٹر منظور احمد نے اس لیے اپنے پیش لفظ (ص ۸) میں یہ اعتراف کیا ہے کہ ''جو راہ اقبال نے بڑی مشکل سے کھولی تھی، دوبارہ بند نہ ہو جائے اور ہمارے فکری سانچے منجمد نہ ہو جائیں''۔ اس لیے انہوں نے اقبال شناسی پر اپنے مقالات شائع کیے ہیں۔ لہٰذا انہیں یہ اعتراف ہے کہ پیراڈائم کے حوالے سے ان کی سوچ اقبال سے مختلف نہیں بلکہ اقبال کے پیراڈائم کی ہی جگالی ہے۔ پیراڈائم کے حوالے سے ڈاکٹر منظور احمد سبکِ اقبال سے متعلق اور ان کے ہی نیاز مند ہیں ان کے پاس اس حوالے سے اقبال سے سوا کچھ نہیں ہے۔ جبکہ یہ پیراڈائم بھی میرے نزدیک فرسودہ اور گسا پٹا ہے۔ فکر اقبال میں اس پیراڈائم سے خود اقبال کی استثنا بھی دیدنی ہے مگر اقبال اس پیراڈائم سے ہٹ کر کسی نئے پیراڈائم کی تشکیل بھی نہیں کر سکے۔ وہ خود بھی یونانی تصوریت سے بیزاری کے باوجود اسلامی اور قرآنی معتقدات اور تصورات کی اسی روش میں مقید ہو گئے جو تطبیق (Reconciliation) اور تشکیل (Reconstruction) کے پیراڈائم کی صورت میں فلو اور فلاطونس (اسکندریہ) کے راستے ابن عربی، ابن سینا، الفارابی اور دوسرے مسلمانوں فلاسفہ کے توسط سے سرسید کے زیر اثر اقبال کے شعور کا حصہ بن گئی تھی جس میں ہم اپنی استدلالی اور استنتاجی منطق سے دین اور مذہبی معتقدات کو پگھلا، لچکا اور موڑ کر افلاطونیت اور نو افلاطونیت کے سانچے میں ڈھالنے کے کار بے سود میں مبتلا ہو جاتے ہیں اور جدیدیت کی کدال سے خود اپنی بنیادوں کو مسمار کرنے پر تل جاتے

ہیں۔ یہ اسی کا کرشمہ ہے کہ مغربی تہذیب وتمدن پر جارحانہ تنقید کے باوجود اقبال کہتے ہیں کہ موجودہ مغربی تمدن اور تہذیب اسلامی تہذیب کی ہی ایک ارتقایافتہ صورت ہے۔ اگر اسلامی تہذیب کی یہی مغربی تہذیب ارتقایافتہ صورت ہے تو اسلامی تہذیب کے احیا کی کیا ضرورت ہے۔ یہ اتنا بڑا مغالطہ ہے کہ اقبال کی پوری سوچ بھی اس کا مداوا نہیں کرسکتی۔ اقبال نے بھی ہمارے مسلمان فلاسفہ کی طرح قرآن میں غوطہ زن ہوکر اس کا کوئی ایسا پیراڈائم وضع نہیں کیا جو خود قرآن کے اصول اولیہ پر اپنی تشکیل رکھتا اور پھر ہم اس صداقت پر تمام تہذیبوں پر حکم لگاتے اس کے برعکس ہم نے اسلام اور قرآن کو موم کی طرح یونانی تصوریت سے موافق، ہم آہنگ اور مطابق بنانے کی ہی سعی نامشکور کی ہے۔ جو قرآن فہمی سے افسوسناک عدم تفہیم کی غماز ہے۔ ڈاکٹر منظور احمد کی کتاب میں دور دور تک اس شعور کا ادراک نہیں۔ وہ بھی پرانی کدالوں سے ہی لیس ہیں تازہ ہوا کا ایک جھونکا بھی ان کی دانشوری سے اس طرف آتا ہوا محسوس نہیں ہوتا۔ بلکہ جہاں مسلم دانشوری اور بصیرت کو اقبال نے چھوڑا ہے ڈاکٹر منظور نے اسے آگے بڑھانے کی بجائے ریورس کر دیا ہے۔ اپنے پیراڈائم میں اقبال اب بھی زیادہ توانائی رکھتے ہیں کہ ان کے ہاں یونانیت اور مغرب کے خلاف بغاوت ہے اگر چہ وہ اس کی بنیاد پر کوئی انفراسٹکچر نہیں دے سکے مگر ڈاکٹر منظور کی بصیرت میں تو اسلامی بصیرت سے گریز اور مغرب زدگی کے سوا کچھ بھی نہیں۔ ان کی بغلوں میں سیکولرزم کے بت چھپے ہوئے ہیں جو عصر حاضر کا سب سے بڑا ناسور ہے۔ علامہ اس کی زہرناکی سمجھتے تھے مگر ڈاکٹر جاوید اقبال اس شعور سے عاری ہیں وہ اسلام کو بھی سیکولرزم کہتے ہیں یا تو وہ سیکولرزم سے مراد رواداری لیتے ہیں یا پھر وہ نہ اسلام کو سمجھتے ہیں اور نہ سیکولرزم کو۔ ڈاکٹر منظور کے ڈانڈے اقبال کی بجائے ڈاکٹر جاوید اقبال سے جا ملتے ہیں۔

کند ہم جنس بہ ہم جنس پرواز

بہرحال ان کا پہلا مقالہ ''اسلامی فکر میں بصیرت کی روایت اور اقبال'' ہے۔ اس مضمون میں ڈاکٹر منظور احمد کی سوچ عجب طرفہ تماشا ہے۔ ایک طرف تو یہ کہتے ہیں کہ کسی بھی فلسفی کو اس کے عصری حالات اور تناظر سے کاٹ کر خلا میں معلق کر کے نہیں سمجھا جاسکتا اور اسی سانس میں یہ نتیجہ بھی نکال لیتے ہیں کہ چونکہ یہ بات اقبال کے بارے میں صحیح ہے اس لیے اقبال فی نفسہٖ مفکر نہیں، جرم اقبال کا یہ ہے کہ ان کی فکر کا بنیادی محرک مسلمانوں کی حالتِ زار کی اصلاح تھی۔ اس بھلے مانس سے کوئی پوچھے کہ کیا سقراط، افلاطون اور ارسطو کی فکر پر ماقبل فلاسفہ کے اثرات نہیں تھے اور کیا یونان کی اشرافیہ اور معاصر صورت حال کے اثرات سقراط، افلاطون، ارسطو، لاک، ہابس، روسو حتیٰ کہ ہیگل، کانٹ اور ڈیکارٹ پر نہیں تھے کیا انہوں نے مذہب، فلسفے، سائنس، انسانی حقوق کی عصری تحریکوں اور معاشرتی حالات سے الگ تھلگ ہوکر اپنے نظریات مرتب کیے؟ کیا ان کا فلسفہ خلا میں اگا۔ اگر ایسا نہیں تو اقبال پر مفکر نہ ہونے کی پھبتی کسنا کہاں تک روا ہے کہ انہوں نے اپنے عہد کے چیلنجوں کا جواب دینے کی سعی کی۔ ہوتا یہ ہے کہ انسان اپنے ذاتی تجربات کی اپنے عہد کی عمرانی، سیاسی اور اخلاقی صورت حال سے جزئیات مرتب کرتا اور پھر ان جزئیات سے کلیات کا استنتاج اور استخراج کرتا ہے۔ اقبال نے برصغیر کے مسلمانوں کے ابتلا، عالم اسلام کی عمومی صورت حال اور نوع انسانی کے عالمگیر اخلاقی، سیاسی اور معاشی افلاس کے حوالے سے خودی، کائنات کے حرکی تصور، ایغو، تعمیر شخصیت، اخلاقی برتری کی ضرورت اور انسان کے روحانی استخلاص کے لیے اور اسلام کی بطور ایک نظام زندگی، معاشی تصورات میں قل العفو اور سرمایہ داری اور اشتراکیت کے خلاف اسلامی تصوریت کے اصول وضع کیے کیا وہ سب عصری تقاضوں کو پورا کرتے تھے یا وہ آج بھی جب کہ مغربی اور مشرقی تہذیبیں آپس میں دست وگریباں ہیں، جب آزاد منڈی کی معیشت اور مادر پدر آزاد جمہوریت کو انسانی تہذیب وترقی کا نکتہ آخر تصور کرلیا گیا ہے، اسلام کے معتقدات اور تصورات کی تعبیر جدید کو انسانی المیے کا حل تجویز کر رہے ہیں، تو کیا یہ اقبال کو مفکر اور فلسفی قرار دینے کے لیے کچھ بھی نہیں، نجانے وہ کون سے سینگ ہیں جو فلسفی کے سر پر اگتے ہیں اور وہ فلسفی بن جاتا ہے، بٹلر، ہیوم، کانٹ، لائبنز اور ڈیکارٹ کے فلسفہ اخلاق اور مابعد الطبیعیات کی اٹھان کیا مسیحی تصوریت پر نہیں تھی؟ کہ انہیں فلسفی کہنے میں عار نہیں اور اقبال کو اسلام کے چھوتے ہی فلسفے سے دیس نکالا مل جاتا ہے۔ یہ تضاد ہے کم نفسی ہے یا احساس کمتری! ڈاکٹر صاحب ہی بتائیں۔

ڈاکٹر صاحب نے انگریزوں، فرانسیسیوں اور ولندیزیوں کی طرح مسلمانوں کو امپیریل طاقت کہا ہے۔ ان کے ممدوح انگریز، فرانسیسی اور برطانوی ان معنوں میں امپیریل تھے کہ انہوں نے اپنے مفتوحہ علاقوں کو اپنی کالونیوں میں بدل دیا جن کے وسائل وہ لوٹ کر لے جاتے تھے۔ ان کا پس نوآبادیاتی نظام امریکہ کی صورت میں اب بھی موجود ہے جو افغانستان، عراق، سعودی عرب کے تیل اور دیگر وسائل لوٹتا ہے مگر مسلمان جہاں گئے وہاں کے وسائل لوٹ کر کہیں اور نہیں لے گئے بلکہ ہر ملک، ملک ماست کہ ملک خدائے ماست کے اصول کے تحت ان مفتوحہ علاقوں میں ہی رچ بس گئے۔ لہٰذا مسلمانوں کو امپیریل طاقت کہنا لاعلمی اور دکھ کی بات ہے۔ کیونکہ ہم یہ تو نہیں کہہ سکتے کہ ان جیسا پڑھا لکھا عالم امپیریلزم کے مفہوم سے ناآشنا ہے یا مسلمانوں سے بغض رکھتا ہے کہ ڈاکو اور ڈاکٹر کو ہم پیشہ کہے۔ اس مضمون میں وہ ارسطوی منطق، افلاطونی سکون اور عجمی تصوف کے بارے میں اقبال کے شدید ردعمل کو بیان کر رہے ہیں اور پھر بھی انہیں فلسفی تسلیم کرنے کو تیار نہیں جب کہ وہ خود محض فلسفے کے استاد ہونے کے ناتے سے فلسفی ہیں اور اقبال اپنے نظریات کی جدت کے باوجود فلسفی نہیں۔ ایسی ہی غلط فہمی علی عباس جلال پوری، ڈاکٹر عطاء الرحیم، ڈاکٹر سی اے قادر اور ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم کو بھی تھی جو خود کو تو نابغۂ عصر فلسفی تصور کرتے تھے جب کہ وہ فلسفے کے محض استاد تھے اور اقبال جس کا مطالعہ ساری دنیا میں کیا جارہا ہے جس کی فکر نے ایک نئی نظریاتی ریاست پاکستان کو وجود بخشا (جبکہ افلاطون اپنی جمہوریہ کے قیام میں ناکام رہا تھا اور غلام بنا کر بیچ دیا گیا) اور قائداعظم جیسی اپنے عہد کی نابغۂ عصر قیادت جنوبی ایشیا کے مسلمانوں کو فراہم کی وہ فلسفی نہیں بلکہ بقول حمید نسیم ''ہمارے عظیم شاعر'' ہیں حالانکہ ان کی شاعری سے فلسفہ نکال دیا جائے تو وہ داغ، جوش اور جگر مراد آبادی کی سطح کے شاعر بن جائیں۔ حمید نسیم تو پھر بھی اقبال کو ایک عظیم شاعر مانتے ہیں، مگر سلیم احمد تو انہیں ایک مجمع باز موچی دروازے کا شاعر کہتے ہیں۔۔۔۔

ببین ایں تفاوت کہ بباید گریست۔

اپنے اس مقالہ میں ڈاکٹر منظور احمد نے متعدد اہم تجزیے بھی کیے ہیں جو قابل قدر ہیں۔ مثلاً انہوں نے درست طور پر یہ بیان کیا ہے کہ اقبال کو مسلمانوں کی جاہ ومنزلت سے محرومی سے زیادہ اس بات کا غم ہے کہ مسلمانوں سے مسند علم چھن گئی اور مغرب کے مسلمانوں کے علمی اثاثے سے ہی فلسفہ جدید اور سائنس کی شاندار عمارت تعمیر کی، تاہم اس سے بھی زیادہ وہ اس کا سبب مسلمانوں میں ملوکیت کو تصور کرتے تھے۔ جس نے اسلام کی جمہوری اور آزاد روح کو کچل کر اس کے گلے میں اموی ملوکیت کا پھندا ڈال دیا۔ خود خطبہ الٰہ آباد میں علامہ اقبال نے لکھا کہ شمال مغربی ہندوستان میں ایک آزاد مسلم ریاست کے قیام سے اسلام کے لیے ایک موقع فراہم ہو جائے گا کہ وہ گلوخلاصی کرائے اس مہر سے جو عرب استعمار نے مجبوراً اس پر ثبت کی۔ اقبال اس عرب استعمار کو مسلمانوں کے زوال اور علم کی مسند کے یورپ اور دیگر اقوام کو منتقلی کا سبب گردانتے ہیں اور پاکستان کے قیام کا مقصد عرب استعماریت کے تحت اسلام کی تمدن، تصوف، شریعت، کلام میں تقسیم اور اس کی تشریح وتعبیر کو جس پر عرب استعماریت کی چھاپ یا مہر ہے اس کو ختم کر دیا جائے اور پاکستان میں اس سے آزاد اسلام کی جدید عصری تقاضوں کے پیش نظر تجدید کر کے ایک ایسا نظام عمل میں لایا جائے جو اس ریاست کی ایک جدید اسلامی فلاحی اور جمہوری سماج میں تشکیل کرے تاکہ پاکستان ایک ایسی ماڈل ریاست بن

جائے جو عالم اسلام کے لیے بالخصوص اور دنیا کے لیے مشعل راہ ہو۔ اقبال کی یہ سوچ اسلامی فکر بلکہ دنیا بھر میں دینی فکر میں منفرد اور بے مثل ہے اور یہ فلسفہ سیاست و ریاست میں ایک نئی بصیرت کا ابلاغ ہے جس سے جدید سیاسی فکر ایک نیا شعور پا سکتا ہے۔ اقبال نے ریاست کی اساس کے طور پر مسلم قومیت اور قومیت کی نظریاتی اور مذہبی اساس کا جو اصول دیا وہ بھی اقبال کے ہاں منفرد ہے اور اسی پر قائداعظم کی عظیم وکالت اور ذکاوت کی جیت پاکستان کی صورت میں سرخرو ہوئی اور قومیت کے پرانے تصورات کی مات سے قومیت کے ایک نئے اصول کی بازیافت ہوئی۔ اور یہ صرف تجریدی اصول نہیں تھا اس کی اساس پر دنیا کی سب سے بڑی مسلم ریاست وجود میں آئی جس کی بنیادوں کو بعد میں کمزور کر دیا گیا اور وہ پاکستان اور بنگلہ دیش کی دو نئی مسلم ریاستوں میں تقسیم ہو گیا۔ دو قومی نظریے کی صرف یہی بازیافت اقبال کو فلسفی قرار دینے کے لیے کافی ہے۔

اقبال کا یہ کہنا کہ مسلمانوں کے لیے لازم ہے کہ وہ پہلے اپنے ہاں اسلامی جمہوریتیں قائم کریں انہیں مستحکم کریں اور پھر ان جمہوریتوں کا ایک وفاق بنائیں تا کہ ایک عالمگیر اسلامی جمہوری خلافت مسلمانوں کے اتحاد سے وجود میں آئے جو مغرب کی نو آبادیاتی استعماریت سے نوع انسانی کی نجات کا باعث بنے، یہ بھی ایک منفرد واقعہ ہے۔ بہر حال ڈاکٹر منظور احمد نے یہ خوبصورت تجزیہ کیا ہے کہ مسلمانوں کے زوال کی پہلی وجہ تصوف ہے، جس کے زیر اثر عمل کی قوت سے مسلمانوں کا محروم ہونا ہے جس سے وہ حرکی قوت سے محروم ہو گئے دوسرے مذہب کی تعبیر ارسطوی منطق سے کرنا اور تیسرے مذہب کو طاقت سے جدا کرنا۔ قوت سے محرومی اقبال کے نزدیک مسلمانوں کے زوال کا بنیادی سبب ہے اور جب مذہب یا دین کو سیاست سے الگ کر دیا جائے تو وہ سیاست چنگیزیت بن جاتی ہے۔ لیکن اقبال کی طرح ڈاکٹر منظور احمد کا بھی صوفی اور پیغمبر کے تجربے میں امتیاز کوئی صائب نہیں، یہ لازمی نہیں کہ پیغمبر لازمی طور پر کوئی انقلاب برپا کرے اس کا کام محض پیغام رسانی ہے۔ ہمارے صوفیا صرف مقام وصال میں فنا نہیں ہوئے انہوں نے بھی دین کی تبلیغ و اشاعت میں بڑا عزم اور پیغمبرانہ استقلال دکھایا ہے۔ یہ اقبال کا متذکرہ صدر نتیجہ ولیم جیمز کی نتائجیت کے اثر کا شاخسانہ ہے۔ پیغمبر خدا کی طرف سے صرف پیغام رسانی کا مکلف ہے کسی قوم کا اس کے اثر کو قبول کرنا نہ کرنا اس کا وظیفہ نہیں۔ پیغمبر کو براہ راست وحی آتی ہے وہ صوفی کے تابع نہیں۔ پیغمبر کی وحی حکم ہے جب کہ صوفی کا تجربہ حکم نہیں اور اس کا مذہبی تجربہ حجیت نہیں رکھتا۔ صوفی پیغمبر کی وحی کے تابع ہے۔ بڑے سے بڑے صوفی کا بڑے سے بڑا مرتبہ کسی صحابی کی گرد سے بھی کم ہے۔ لہذا نبی اور صوفی کے تجربے میں مماثلت ڈھونڈھنا سوئے ادب ہے۔ دونوں میں کسی نوعیت سے کوئی ہم آہنگی نہیں، یہ ایک نئے فتنے کا دروازہ کھولنا ہے جیسے ابن عربی کے نظریۂ بروز نے غلام احمد قادیانی جیسے کئی بدبختوں کو گمراہ کیا۔ فتوحات مکیہ اور فصوص الحکم علمی اور ادبی شاہکار سہی مگر بقول اقبال ابن عربی کے ''زندیقہ'' نے تصوف اور اسلامی معتقدات میں گمراہی کے ایسے ابواب کھولے ہیں جو شاید کوئی بہت بڑا انقلاب بھی بند نہ کر سکے۔

ڈاکٹر منظور اگر یہ مانتے ہیں کہ مذہبی تہذیبوں کی بنیاد حقیقت کے ایک راست تجربے پر مبنی ہوتی ہے تو انہیں یہ بھی ماننا چاہیے کہ دنیا کی ہر تہذیب کی بنیاد میں مذہبی تجربہ موجود ہے مگر یہ صوفی کا تجربہ نہیں ہوتا پیغمبر کی وحی ہوتا ہے۔ گرچہ گرد زمانہ سے وہ اپنی صورت کھو چکا ہے۔ پھر انہیں یہ بھی ماننا چاہیے کہ تصوف اس تجربے کا بنیادی جوہر ہے، مذہبی اور حسی دونوں تجربات میں وقوف کو وہ اگر تسلیم کرتے ہیں تو انہیں اس نتیجہ پر بھی پہنچنے میں دیر نہیں کرنی چاہیے کہ مذہبی وقوف میں یقین بنیاد ہے اور علم کی اساس یقین ہے ظن و تخمین نہیں۔ تخمین اور ظن معلومات فراہم کرتے ہیں علم نہیں۔ جدید تہذیب جس کے کمال کے وہ معترف ہیں علم پر اساس نہیں رکھتی بلکہ معلومات سے عبارت ہے۔ انہی معلومات نے آج کے دور میں ابلاغیات کو غلبہ دیا جس میں غلط سلط معلومات کے ذریعے گمراہ کیا جاتا ہے جیسا کہ واقعہ ۱۱ ستمبر کو خود تخلیق کر کے اور اسے اسامہ اور مسلمانوں پر ابلاغیات کے ذریعے تھوپ کر عراق اور افغان جنگ میں امریکہ اور برطانیہ نے کیا۔ وہ سارا طور مار جو دن رات ریڈیو، ٹیلی ویژن، اخبارات، جرائد، اور کتابوں میں آتا رہا انفارمیشن کا طغیان تھا علم نہیں۔ وقوف اور احساس کی حقیقی اور یقینی اساس یقین ہے جو ایقان سے انسانی ذہن اور دل کو لبریز، شاد کام اور معمور کرتا ہے یہ نور ہے طمانیت ہے جبکہ انفارمیشن پر جھوٹ اور فریب کی ملمع کاری ہے ہمارے فلسفی جانے کب اس گمراہی سے نکلیں گے اور شک کو علم کی بنیاد تصور کریں گے۔ شک شک ہے یہ دیوار کج ہے جو تاثر یا کج رہتی ہے اور فلسفی ساری عمر شک کی ڈور کو سلجھاتا رہتا ہے اور اسے سرا ملتا ہی نہیں۔ ان کے اپنے الفاظ میں یہ نکتہ انہیں بھی سمجھنا چاہیے کہ جب پیغمبر کی وحی ہم عصری زبان میں اظہار پاتی ہے تو فلسفی سے یہ توقع کیوں ہے کہ وہ عصری تقاضوں سے بالاتر کوئی نئی طبع زاد مجنون تیار کرے کہ فلسفی کہلائے۔ خدا پیغمبر کو بھی گرد و پیش سے مانوس اصطلاحوں، الفاظ اور زبان میں وحی عطا کرتا ہے تا کہ تفہیم کا خلا نہ رہے مگر مغالطہ اگر یہ پیدا کرنا مقصود ہو کہ وحی کے تصورات خدا کے اور زبان اور الفاظ نبی کے ہیں تو یہ غلط ہے جب تصورات خدا نازل کر سکتا ہے تو الفاظ دیتے ہوئے اسے کیا امر مانع ہے پھر الفاظ سے ماسوا تصورات کا تصور ہی لغو ہے تصورات مجردات نہیں وہ لفظوں کے لباس میں ہی ملبوس ہوتے ہیں۔ تہذیبی ورثہ ہماری مجبوری ہے کہ ہم انہیں سمجھ سکیں خدا کی احتیاج نہیں۔ اس کی وجہ بھی ڈاکٹر صاحب نے خود لکھی ہے کہ ''کلام اس وقت کے معاشرے کے لیے بے معنی ہو جاتا بلکہ وہ کسی معاشرتی تبدیلی کا سبب بھی نہیں ہو سکتا تھا''۔ (ص ۱۴) جب تک وہ عصری شعور سے ثمر بار نہ ہو۔

ڈاکٹر منظور نے ایک اور نازک مسئلہ چھیڑ دیا ہے ص ۲۰ پر رقم طراز ہیں کہ ''ایک نفسیاتی مسئلہ پھر بھی باقی رہ جاتا ہے اگر نظری طور پر مختلف مذاہب کی حقانیت تسلیم کر لی جائے تو ایک مذہب سے دوسرے مذہب میں داخل ہونے کی صرف انفرادی وجوہات ہو سکتی ہیں اور کوئی مذہب یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ اس کے علاوہ باقی سب مذاہب باطل ہیں''۔ اس سے انکار نہیں کہ تمام مذاہب کی اصل ایک ہے، خدا، بزرگ و برتر ہستی، وحی و الہام اور حیات بعد الموت اور اعمال صالح کے تصورات سب مذاہب میں موجود ہیں۔ آدم علیہ السلام سے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تک تمام انبیا خدا کی وحدانیت کے قائل ہیں مگر جب مارکیٹ میں کسی کتاب کا نیا ایڈیشن آ جائے تو پرانے تمام ایڈیشن ساقط اور محض حوالہ کی چیز رہ جاتے ہیں جب کہ یہ مذاہب بنیادی سچائیاں رکھنے کے باوصف اپنے پیروکاروں کی تحریفات سے غلط سلط ہو چکے ہیں اور توحید و رسالت کا جوہر مفقود ہو چکا ہے۔ متعدد مذاہب محض ایک قوم کی طرف بھیجے گئے اور وہ آنے والے رسول کی شریعت تک محدود تھے جبکہ اسلام آخری مذہب ہے اور اس کے رسول کو خدا نے آخری اور اس کی کتاب (قرآن) کو نہ صرف آخری قرار دیا بلکہ اس کی حفاظت کی ذمہ داری بھی قبول کی اور اس کو حجت اور حکم قرار دیا۔ اس کے علاوہ کسی کو حق سمجھنا اور اس میں نجات تصور کرنا اسلام اور اس کے نبی کی رسالت سے روگردانی، قرآن کی حجیت کا انکار اور کفر ہے۔ دین کو اختیار کرنے میں جبر نہیں مگر ایک دین کو اختیار کر کے پھر ادھر ادھر منہ مارنا ارتداد و بے دینی ہے۔ یقیناً دین ایک ہی ہے اور یہ اسلام ہے جو آخری الہامی مذہب ہے اور تمام ادیان پر محیط اور غالب۔ یہ شاذ لیہ فرقے کے نو مسلم شوآن بلکہ اس سے قبل ٹوئن بی وغیرہ کے نظریات کی جگالی ہے جو تمام مذاہب کے اجزا سے اپنے ڈھب کا ایک نیا عالمی مذہب برآمد کرنا چاہتے ہیں تا کہ مغربی استعماریت عالمی ریاست، عالمی فوج، عالمی ثقافت، عالمی ذرائع ابلاغ اور عالمی یا گلوبل ولیج کے پرفریب نعروں سے مغربی عسکری امپریلزم کو دنیا کی تمام کمزور اور غریب قوموں کو جکڑنے اور ان کے وسائل لوٹنے کے لیے مسلط کرنا چاہتے ہیں۔ ڈاکٹر منظور جیسا زیرک فلسفی بھی اگر اسی دام پرفریب کا اسیر ہے تو عام آدمی کو کیا روؤں؟ مطلق حقانیت اسلام

ہے کوئی وسیع المشربی کا دام جھوٹ کو سچ نہیں بنا سکتا۔

ڈاکٹر منظور نے ان فقہا کے نام نہیں گنوائے جو یہ کہتے ہیں کہ فقہائے اسلام نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ ''جتنی ردوبدل معاشرتی ترقی ارتقا کی وجہ سے ضروری تھی، ہو چکی اور اب ان احکامات میں کسی ردوبدل کی گنجائش نہیں'' اس طرح کے دعاوی کم تر درجے کے عالم ہر دور میں، ہر مذہب میں کرنے والے موجود ہیں۔ ابھی حال ہی میں البتہ فوکویاما اور اسی قبیل کے امریکی دانشوروں نے دعویٰ کیا ہے معیشت کی انتہا آزاد منڈی سے آگے اور سیاسی اور معاشرتی ترقی جمہوریت سے آگے نہیں جا سکتی لہٰذا تاریخ کا اختتام ہو گیا ہے اور ارتقا رک گیا ہے۔ ڈاکٹر منظور جیسے دانشور اس پر تو صاد کر لیں گے مگر مسلمان فقہا ایسا کہیں تو ان پر طنز فرمائیں گے تاہم انہیں معلوم ہونا چاہیے کہ فقہائے اسلام یعنی آئمہ فقہا کے اپنے فتاویٰ کی بنیاد جب اجتہاد پر ہے جس کا حق قرآن اور رسول نے دیا ہے تو یہ دروازہ کون بند کر سکتا ہے۔ کسی کا اجتہاد کسی دوسرے کے لیے حجت نہیں۔ کسی فقہی فیصلے کو قبول کرنا یا نہ کرنا بھی انفرادی معاملہ ہے۔ تاہم اگر ایک خطے یا ملک کے لوگ اپنے جمہوری حق کے طور پر ایک فقہ کو قبول کرتے ہیں تو اس ملک اور معاشرے میں اس کا نفاذ ایک جمہوری تقاضا ہوگا۔ اس میں ڈاکٹر منظور سے اختلاف نہیں اس لیے کہ ارتقا کا عمل رکتا نہیں اور نہ روکا جا سکتا ہے۔ درست راہ پر اسے نہ رکھا جائے تو یہ غلط راہ پر چلا جائے گا۔ یہ ہر فن، مذہب، ریاست اور تمدن کی زندگی کا لازمی خاصا ہے۔

ڈاکٹر منظور احمد کا یہ نتیجہ درست نہیں کہ اجتہاد کے روایتی تصور پر اقبال کا بھروسہ صحیح نہیں اور کلاسیکی علم رکھنے والا عالم اور موجودہ جدید دور کا مختلف علوم کا ماہر کسی ایک نقطہ نظر پر متفق نہیں ہو سکتے۔ اقبال نے مجتہد کے انفرادی اجتہاد پر علما، اور جدید علوم کے ماہرین کے ایک بورڈ یا پارلیمان کے اجتماعی اجتہاد کو اس لیے صائب قرار دیا تا کہ جدید و قدیم دونوں نظریات اور علوم کے باہمی مکالمہ سے اسلام کے اصول ہائے زندگی کی تعبیر و تفسیر جدید تقاضوں کی روشنی میں ہو سکے یوں یہ اصول تجرید سے تجربے یا عمل میں آ سکیں۔ یہ ان کا خیال موجودہ صورت حال میں تھا ورنہ ان کے پیش نظر تھا کہ اس ابتدائی التزام کے بعد مستقبل میں ایسے لوگ بھی پیدا ہوں گے جو جدید و قدیم دونوں علوم پر گہری بصیرت کے حامل ہوں گے اور وہ ایک اسلامی ریاست اور معاشرے کے تقاضوں کے مطابق بہتر صورت میں اپنی مجتہدانہ بصیرت سے رہنمائی دے سکیں گے اس کی مثال ڈاکٹر حمید اللہ، ڈاکٹر فضل الرحمٰن اور ایسے ہی علما ہیں جو جدید و قدیم دینی اور دنیاوی دونوں علوم پر بصیرت رکھتے ہیں۔ یوں اقبال نے ایک تنزل پذیر یا ترقی فرا مسلم معاشرے سے ایک ترقی یافتہ معاشرے کی طرف پیش قدمی کی عملی صورت تجویز کی جس کو ڈاکٹر صاحب نے سمجھے بغیر کنفوژ کر دیا ہے۔ یہاں ایک جملہ معترضہ یہ عرض کر دوں کہ پارلیمان کو حق اجتہاد دیتے ہوئے بھی میں انفرادی حق اجتہاد کو برقرار رکھنے پر اصرار کروں گا۔ اس لیے کہ اکثر پارلیمنٹ کسی آمر، جابر حکمران یا بادشاہ کے ہاتھوں مفلوج ہو کر حکمران کی اہوائے نفس کے مطابق قانون کی ناک مروڑنے لگتی ہے تو ایسے میں کوئی ابوحنیفہ یا امام احمد بن حنبل یا ابن تیمیہ جیسا جرأت آزما اس کے خلاف بغاوت کو جنم دے کر اسلام کی محافظت کرتا ہے۔ لہٰذا انفرادی حق اجتہاد منسوخ نہیں کیا جانا چاہیے۔ یہ ایک مسلمان کے فطری حق کا تقاضا ہے۔

ڈاکٹر منظور نے قرآن کو بھی غلط طور پر سمجھا ہے کہ ''قرآن و حدیث زیادہ تر ترغیب و ترہیب اور مواعظ پر مشتمل ہے'' قرآن و حدیث اس کی بجائے ایک توحیدی اساس پر استوار ایک نظام زندگی اور اس کے لیے ضروری مابعد الطبیعیاتی اور عمرانی حقائق کا اساسی بیان ہے۔ ظاہر ہے حسب ضرورت اس میں ترغیب و ترہیب اور مواعظ اور مختلف قوموں کے ان کے قبول نہ کرنے کے نتائج و عواقب کو بھی شامل کیا گیا ہے تا کہ وہ ماضی سے حال اور مستقبل کی طرف مسافرت میں تاریخی حقیقتوں سے آگاہ رہیں۔ مواعظ اور قضایا کے گورکھ دھندے سے ڈاکٹر منظور کیا نتائج حاصل کرنا چاہتے ہیں اور ہمارے ذہنوں کو کن کن الجھاؤ میں ڈالنا چاہتے ہیں کچھ معلوم دکھائی نہیں دیتا۔ جانے جدید ذہن نے ان کے نقطہ نظر سے کیا ترقی کر لی ہے جب کہ میری نظر میں تو انسانی ذہن عصر جدید میں اپنے بنیادی انسانی اور اخلاقی جوہر سے بھی محروم ہو گیا ہے۔ وہ انسان سے پھر ایک ہوس کار درندے کے قالب میں ڈھل گیا ہے جس کے سامنے دولت، قوت، عورت اور منشیات کے سوا کوئی مقصد و مطلب ہی نہیں۔ اسلحے کے آتش دان پر بیٹھا ہوا انسان۔ نطشے نے کہا تھا خدا مر گیا ہے کاش وہ یہ کہتا کہ انسان مر گیا ہے اور اسلحہ کی قبر میں اتر ا ہی چاہتا ہے۔

ڈاکٹر منظور سے مجھے اتفاق ہے کہ حضرت عمر کے دور کے بعد اسلامی فکر قانون اور نظام کے ارتقا کا سبب ہی نہیں بنا۔ ان کا قتل سازش تھی۔ اسلام جس قوت اور تیزی سے پھیل رہا تھا اس کی پیش قدمی کسریٰ کی باقیات کو کھل رہی تھی۔ اس لیے کہ ایرانی ملوکیت چوپٹ ہو کر رہ گئی تھی اور یہ ان کے لیے صدمہ تھا۔ حضرت عمر کے خلاف ایرانیوں کا دل ابھی تک خوف اور غصہ سے بھرا ہوا ہے۔ حضرت عثمان کی خلافت حضرت عمر کا تسلسل بلکہ باقیات اور ان کی شہادت کے بعد خلافت انتشار کا شکار ہو کر حضرت امیر معاویہ کے پاؤں تلے دم توڑ گئی اور اسلام ملوکیت کے شکنجے میں آ گیا جس نے ترغیب و ترہیب سے ایک ملوکانہ معاشرے کو اسلام کا مقصود بنا دیا اب کہاں سے صدائے لا الہ الا اللہ آتی؟ ملوکیت نے اپنے تحفظ کے لیے تصوف، شریعت، تمدن کلام کے بتان عجم حرم کعبہ میں گاڑ دیئے اور اسلام کی قوت کبھی سقوط بغداد، سقوط اندلس، سقوط دہلی، سقوط ڈھاکہ، سقوط کابل اور پھر سقوط بغداد سے دم توڑتی چلی گئی۔ امام مظلوم نے اپنی اور اپنے خاندان کی جان دے کر اس کو بچانے کی کوشش کی مگر ملوکیت پوری قوت سے قائم رہی اور یہ آکاس بیل سب اداروں، شاخوں اور پتوں کو چاٹ گئی۔ جس کا شعور ہر ذی شعور مسلمان کو ہر دور میں رہا مگر وہ ابھی تک ٹک ٹک دیدم کی کیفیت سے باہر نہیں آئے۔ ڈاکٹر منظور کا یہ دکھ تو بجا ہے کہ ہمارے مدرسوں کے علما فرقہ بندی اور تکفیر میں تیز اور قرآن و حدیث کی وسعت تفہیم میں روک ہیں مگر یہ نہیں دیکھتے کہ جدید تعلیم یافتہ لوگوں نے کس قدر غدر مچا رکھا ہے۔ تعلیم کے وابستگان انگریزی کو تدریس اور سرکاری زبان بنائے ہوئے ہیں جو ہماری نہیں استعماری ہے۔ قومی زبان میں جدید علوم و فنون لانے میں ان کی غفلت مجرمانہ ہے اور وہ اپنا مضمون اپنی زبان میں نہیں پڑھاتے اور نہ اپنے مضمون کی غیر ملکی کتب ترجمہ کرتے ہیں نہ لکھتے ہیں۔ امتحانات میں بوٹی مافیا اور یونیورسٹیوں میں کرپشن سب سے زیادہ ہے۔ ٹیوشن، امتحانات میں نقالی، پرائیویٹ تعلیمی اداروں میں فیس، سرکاری تعلیمی اداروں میں سیلف فنانس، طالبات کے تھیسس اساتذہ لکھتے ہیں۔ پریکٹیکل کے نمبر رشوت دے کر لگائے جاتے ہیں۔ ہمارے علما کے مقابلے میں جدید تعلیم یافتہ طبقہ زیادہ کرپٹ ہے۔ علما کا قبلہ تو پھر بھی مکہ اور مدینہ ہے ہمارے جدید تعلیم یافتہ طبقہ کا قبلہ پیرس، لندن، نیویارک اور واشنگٹن ہے۔ ہمارے علما کی مٹی ہمارے وطن سے گندھی ہے ان کی مٹی امریکہ اور یورپ سے گندھی ہے۔ یہ ملکی اداروں، پارلیمنٹ، عدلیہ بنک اور ایسے ہی اداروں کو توڑ پھوڑ کر امریکی اور یورپی غلامی کو مستحکم کر رہے ہیں۔ دولت، عورت، شراب تعیشات اور گرین کارڈ ان کا ضمیر اور ایمان ہے۔

ڈاکٹر منظور فرماتے ہیں کہ اقبال نے اسلامی فکر کی بنیادی خامیوں کی نشاندہی تو کی ہے مگر انہوں نے ان خامیوں کو دور کرنے کے لیے نیا پیراڈائم مہیا نہیں کیا۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ ڈاکٹر منظور کو فلسفے کے استاد ہی کی حیثیت سے علم ہونا چاہیے کہ جواب سے سوال مرتب کرنا کہیں اہم ہے، فلسفے میں اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ایک فلسفی سوال مرتب کرتا ہے تو فلسفے کے تدریجی ارتقا میں کوئی دوسرا فلسفی اس کا جواب فراہم کرتا ہے۔ سوال مرتب کرنا اور خامیوں کی نشاندہی اگر وہ تسلیم کرتے ہیں تو اقبال کو بلند اقبال رکھنے کے لیے یہی کافی ہے۔ مگر ایسا بھی نہیں کہ انہوں نے ان خامیوں کے تدارک کے لیے کوئی پیراڈائم نہیں دیا۔ انہوں نے کائنات کی روحانی تعبیر، حرکت کے تصورات، یعنی کائنات کے حرکی ہونے کے تصورات، فرد کے روحانی استخلاص کے لیے اعتبار ذات،

استحکام ذات کے لیے خودی یقین، اخلاقی قوت، ملت سے رابطہ استوار کرنا، ملوکیت کی جگہ روحانی جمہوریت جو اخلاقی اصولوں کی پاسدار ہو، شعور خویشتن شعور دیگرے اور شعور ذات حق اور عشق کے حوالے سے اور پھر مسلم قومیت کے تصور کے تحت اسلام کی ایک سرزمین سے پیوستگی کے تصور کو اجاگر کر کے اسلام کی ایک عملی تجربہ گاہ پاکستان کی تخلیق کر کے کیا کم پیراڈایم دیے ہیں۔ متحدہ قومیت کے بالمقابل مسلم قومیت کے تصور پر برصغیر کی تقسیم سے ایک ارب کے قریب لوگ متاثر ہوئے اور تقریباً تیس کروڑ مسلمان آج آزادی کا سانس لے رہے ہیں۔ باقی سرسید کے پاس بھی کوئی پیراڈایم نہیں تھا مغربی تہذیب کے آگے سرافگندگی تھی۔ سرسید سے بہت پہلے یونانی نظریات وتصورات اور مذہبی معتقدات کے درمیان مطابقت پذیری (Reconciliation) کا پیراڈیم موجود تھے جس کو ابن رشد نے حقیقت دوگونہ بنا دیا۔ مذہب کے معتقدات کی دنیا الگ اور سائنس وطبیعات کی دنیا الگ کر دی مذہب اور طبیعیات کے حوالے سے یہی روش کانٹ کی بھی تھی۔ اوپر کے حضرات کی اس روش کی اساس مذہب اور سائنس کے حقائق میں توازن کی عدم تفہیم پر تھی مگر سرسید کی روش مغربی امپریلزم سے شکست خوردگی پر تھی۔ اقبال کے ہاں اس روش کے خلاف مزاحمت اور بیزاری موجود ہے مگر عملاً وہ سرسید کے ہی تتبع میں چلے۔ تشکیل جدید، الہیات اسلامیہ میں مذہبی تجربے، اس کے معیار مذہب کے امکان، مسلم ثقافت وغیرہم میں یہی پیراڈیم انہوں نے سرسید سے بہتر طور پر اور زیادہ فلسفیانہ سطح پر پیش کیا ہے اس لیے کہ اقبال سرسید سے ہر لحاظ سے زیادہ فلسفی، متکلم اور وسیع المطالعہ تھے۔ اسی کا شاخسانہ ہے کہ اقبال نے کہا کہ یورپی سائنسی تہذیب اسلامی تہذیب ہی کی ارتقایافتہ صورت ہے۔ کوئی اقبال سے پوچھے اگر اسلامی تہذیب نے بھی یورپی تہذیب کی طرح ارتقایاب ہو کر انسان کو اسلحہ کے ڈھیر پر بٹھانا تھا تو اسلامی تہذیب کے ارتقا اور احیا کی کیا ضرورت تھی اور ہے۔ جس کو خود انہوں نے کہا کہ وہ اپنے خنجر سے آپ خودکشی کرے گی اور اس کی فتوحات بیکاری وعریانی ومے خواری وافلاس کو قرار دیا تھا جس میں عبادت گاہوں سے بلند بنکوں کی عمارات ہیں اور سود لاکھوں کے لیے مرگ مفاجات ہے، جہاں غریبوں اور مظلوموں کا لہو پی کر تعلیم مساوات دی جاتی ہے اور اس کے کمالات کی حد بقول اقبال برق وبخارات ہے جہاں مشینوں کی حکومت ہے اور احساس مروت کو آلات کچلتے ہیں، جہاں بندہ مزدور کے اوقات تلخ ہیں، جس کے سرمایہ پرستی کے سفینے کو ڈبو دینے کے لیے وہ خدا سے فریادی ہیں۔ جس کی بربریت کا مظاہرہ افغانستان، عراق اور دوسرے اسلامی ممالک میں امریکہ کی زیر قیادت تہذیب جدید کے درندے کر رہے ہیں اور اگلی نظم میں فرمان خدا سنا رہے ہیں کہ دنیا کے غریبوں کو جگا دو تا کہ وہ بڑھ کر کاخ امرا کے در و دیوار ہلا دیں۔ ان کا لہو سوز یقین سے گرمائے اور کنجشک فرومایہ (مسلمان) شاہین (مغربی استبداد) سے لڑ جائے اور پھر سلطانی جمہور کا زمانہ (جدید اسلامی فلاحی جمہوری معاشرے) تشکیل پائے تمام نقش ہائے کہن مٹ جائیں، دہقان کو روزی میسر ہو، خالق اور مخلوق میں حائل پردے اٹھ جائیں۔ اقبال جب تہذیب نو کو کارگہہ شیشہ گراں کہہ رہے ہیں اور آداب جنوں کی اپنے لیے آرزو کر رہے ہیں جو سچے انقلاب کی حدی خوانی کرے تو ہم کس طرح اس تہذیب کو اسلامی تہذیب کی ارتقایافتہ صورت مان لیں۔ اقبال کی فکر میں بڑے بڑے التباسات کے باوجود ایک نئے تہذیبی اور تمدنی انقلاب کا پیراڈائم مکنون ہے کاش ڈاکٹر منظور اس انقلاب کا انفراسٹکچر اقبال کے شعر وفلسفہ سے مرتب کرتے جس کے شاید فلسفے کے استاد کی حیثیت سے اہل بھی تھے مگر وہ تو اپنی منطقی تلواریں سونت کر کسی اور ہی راہ پر نکل کھڑے ہوئے ہیں۔

گزشتہ دو تین صدیوں سے انسانی ذہن کو سائنس کی بے پناہ ترقی نے مبہوت کر رکھا ہے وہ اس کے سحر سے آزاد ہی نہیں ہو رہا وہ اس بات کو مان ہی نہیں رہا کہ صدیوں کی تاریخ پر نوشتہ سائنس کی روداد پڑھیں تو خود سائنس کے نظریات بھی اتھل پتھل اور تغیرات کی زد میں چلے آ رہے ہیں۔ سائنس کے معتقدات اور حاصلات بھی قطعی اور حتمی نہیں وہ بھی ارتقایاب رہتے ہیں اگر سائنسی نظریات وتصورات بھی ادلتے بدلتے رہتے ہیں تو مذہب کے معتقدات کو ان کے مطابق ڈھالنے اور اس کی کسوٹی پر ان کے غلط اور صحیح ہونے اور سائنس کی روشنی میں ان کی تعبیر پر اصرار کی تک ڈاکٹر منظور کو تو آتی ہوگی ہمیں یہ منظور نہیں۔ یورپی سائنس مسیحی تصوریت پر پروان چڑھ سکتی ہے تو اسلامی معتقدات پر سائنس کے نئے پیراڈائم بھی وجود پا سکتے ہیں۔ یہی کام مسلمانوں نے نہیں کیا نہ ابن عربی، نہ ابن سینا، نہ امام غزالی، نہ ابن رشد نے۔ یہ سب یونانی تصورات کی جگالی کرتے رہے اور ہمارے نئے متجددین جس کے سرخیل سرسید ہیں جو جدید یورپی تہذیب اور سائنس سے چوندھیائے ہوئے ہیں، وہ مطابقت پذیری علوم کو اسلامی کرنا اور تشکیل و تجدید کے نام پر قرآن اور اسلام کو موم بنا کر انہیں پرانے سانچوں میں پگھلانے میں جتے ہوئے ہیں۔ خوئے غلامی نے ان کے اندر ایک آزاد انسان پیدا ہی نہیں ہونے دیا۔ بلکہ ایک سہما ہوا ڈرا ہوا اور بے ہمت فرد مقید کر رکھا ہے۔ تاریخ اس کا جواب دیتی ہے یا نہیں دیتی۔ تاہم تاریخ اور قرآن کا سب سے بڑا سوال یہی ہے۔ ڈاکٹر منظور نے اسلامی فکر میں بصیرت کی روایت کی اس ٹھوکر اور کجی کو محسوس نہیں کیا وہ تو واصل بن عطا سے اقبال، اسماعیل راجی فاروقی، حسین نصر، ڈاکٹر فضل الرحمٰن، ضیاء الدین سردار اور وحید الدین خان کا ہی تتبع ہیں جس پر مسلم دانشوری ہکا بکا ہے اور وہ اپنی اصل کی بازیافت کی بجائے چبائے ہوئے اور اگلے ہوئے نوالوں پر ہی گزر بسر کر رہی ہے۔ علمی دنیا میں ایک انقلاب برپا کرنے کا وقت شاید آ گیا ہے اور میں مسلمانوں کی ناقہ بے زمام کو سوئے قطار کھینچنے کے اس جتن میں ہوں۔ شاید اس انقلاب کے پرچم بردار بھی ابھی پالنوں میں ہیں مگر میں اس کشت ویران سے ناامید نہیں ہوں۔ یہ امر ہے اور امر، ہو کر ہی رہتا ہے۔ ورنہ تو بقول اقبال ہمارا سارا علم کلام قوالی سے زیادہ نہیں جس کی طبع مشرق صدیوں سے افیونی ہے اور ہم سب تمدن، تصوف، شریعت اور کلام کے بتوں کے پجاری ہیں جس کو اموی ملوکیت نے ہماری تقدیر بنا دیا تھا۔ ڈاکٹر منظور سرسید کے پیراڈائم کی مدح سرائی کی بجائے اس نئے پیراڈایم کی نوید سناتے تو کوئی بات بھی تھی۔

ڈاکٹر منظور احمد حضور ﷺ کی وفات کو جسے وہ خود صدمہ کہہ رہے ہیں، خوف سے تعبیر کر رہے ہیں۔ مسلمانوں کو کس بات کا خوف تھا اور وہ کیا خوف تھا جو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی چھوٹی سی تقریر کا بھی متحمل نہ ہو سکا۔ اصحاب رسول کو اپنے محبوب ﷺ سے جو محبت تھی۔ محبوب کے وصال پر محبت کے لیے وہ ایک قدرتی اور فطری عمل تھا۔ جانے کس ڈکشنری اور نفسیات کی کون سی کتاب سے وہ خوف کی یہ تفسیر وتعبیر نکال لائے ہیں۔ وہ تو محبت کا ایک مظاہرہ تھا اور جس طرح نبی پاک کی رحلت پر صحابہ نے اپنے معاملات طے کیے اور دنیا کی ایک عظیم سلطنت اور تہذیب کی بنیاد رکھی اور اسلام کی تبلیغ وتنفیذ کے لیے بحر ظلمات میں گھوڑے دوڑا دیے وہاں کہاں خوف تھا حضرت عمر کی کیفیت محبت کی انتہا تھی مجھے تو خود ڈاکٹر منظور کی اس دانشوری سے صدمہ ہوا ہے کہ وہ محبت کے مظاہرے کو خوف سے تعبیر کر رہے ہیں۔ عجیب فلسفہ بگھار رہے ہیں۔ فلسفہ طرازی کا یہ کون سا انداز ہے۔ بکھرنے کا خوف کہاں تھا وہاں تو جڑنے کی تدابیر تھیں۔ سقیفہ بنو ساعدہ میں تو ایک نئی تاریخ مرتب ہو رہی تھی حضرت ابوبکر صدیق نے کمال اعتماد کے ساتھ حضرت اسامہ کے لشکر کو روانہ کیا، مدعیان نبوت اور منکرین زکوٰۃ کو سیدھا کر کے نئی سلطنت کی بنیادیں انتہائی مختصر وقت میں رکھ دیں اور اپنا جانشین حضرت عمر جیسا عظیم حکمران چھوڑا۔ تاریخ کی ایسی من چاہی تعبیرات افسوسناک اور حقائق کے منافی کرنے کا ڈاکٹر منظور کو نہ کوئی حق ہے اور نہ ضرورت۔ ان کی فلسفہ طرازی یوں خطرناک جہتیں نہ تراشے، جس کا حقائق سے کوئی واسطہ ہی نہیں۔ عجب طرفہ تماشا ہے کہ ان کی دانشوری نے اسلامی فکر میں بصیرت کی روایت سے خوف ہی برآمد کیا ہے اور اس فلسفی کا کردار دہرایا ہے جو رات کے اندھیرے میں ایک تاریک کمرے سے ایک ایسی سیاہ بلی کو تلاش کر رہا ہے جو وہاں موجود ہی نہیں۔ ڈاکٹر منظور کیا یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ اسلام کا مثبت کردار نبی پاک کی رحلت کے ساتھ ہی ختم ہو گیا تھا اور سقیفہ

بنی ساعدہ سے خوف اور اختلاف کا دور دورہ شروع ہو گیا۔ حضرت عمر نے اسے سنبھالا دیا اور ان کی شہادت کے بعد اسلامی فکر میں بصیرت کی روایت دم توڑ گئی۔ یوں ڈاکٹر منظور یہ احساس رکھتے ہیں کہ یہ روایت عصری تقاضوں کو پورا کرنے سے قاصر ہے۔ لہٰذا ہمیں ایک ایسی بصیرت کی طرف آنا چاہیے جو منطقی استدلال اور وقوف و ادراک پر پوری اترتی ہو۔ اقبال نے مذہبی مشاہدہ میں وقوف و ادراک کی طرف خطبات میں قدم بڑھایا مگر ڈاکٹر منظور کے نزدیک اس روایت کو فروغ نہ ہوا حالانکہ ان کے خیال میں اس کا احیا ہونا چاہیے تھا تاکہ مذہب کے روایتی تصور سے آزاد ہو کر تجدد پسند مسلم ذہن مغرب زدگی سے کوئی نیا آمیختہ اپنے لیے تیار کر سکے۔ یہ اسلام سے یا مذہب سے فرار ہے یا اسلام میں ''اجتہاد'' اور تازہ کاری کا نیا در کھولنے کی کوشش، یا علوم کی اسلامائزیشن ہے۔ یہ عقیدہ پرستی کے خلاف عقل و استدلال اور خرد افروزی کی تحریک ہے یا عصر حاضر کے تقاضاؤں کے مطابق فلسفہ طرازی ہے۔ ڈاکٹر منظور اسے جو بھی لیبل لگائیں یہ اقبال پر نقد نہیں اسلام سے بغاوت ہے۔ ڈاکٹر منظور کی فکر کے پردۂ زنگاری میں کون سا محبوب ہے جو چوٹ تو اسلام پر کرنا چاہتا ہے اور نام اقبال کا استعمال کرتا ہے۔ اسی طرح ستر کی دہائی میں اشتراکی اور ماڈریٹ اسلام پر تنقید اس طور کرتے تھے کہ ''ہمیں مودودی کا اسلام نہیں چاہیے'' وہ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کی آڑ میں اسلامی معتقدات اور شعائر کو آڑے ہاتھوں لیتے تھے۔ ڈاکٹر منظور مولانا مودودی سے قربت رکھتے رہے ہیں۔ گرم سرد چشیدہ ہیں، جانتے ہیں کہ ضرب کہاں لگانی ہے تاکہ جہاں سے وہ چاہتے ہیں ٹیس اٹھے۔ اسلامی فکر میں بصیرت کی روایت کو اپنی مرضی کے تحت بدلنے کے لیے وہ اقبال کے کاندھے کو استعمال کر رہے ہیں۔

اجتہاد کا عمل اور اس کی اصل روح حضرت عمر سے پہلے ہمیں خود رسول پاک ﷺ کے دور میں ملتی ہے۔ مثلاً معاذ بن جبل اور نبی پاک کا مکالمہ۔ حضرت ابوبکر کا اسامہ بن زید کے لشکر کو روانہ کرنے پر اصرار۔ کاذب نبیوں کے خلاف جہاد اور منکرین زکوٰۃ کے خلاف ایکشن۔ جن کی مقتدر صحابہ نے سفارش کی کہ کچھ دیر توقف کر لیا جائے مگر ابوبکر صدیق کی اجتہادی بصیرت نے اسے قبول نہ کیا اور اپنے عزم صمیم کا مظاہرہ کیا۔ حضرت عمر نبی پاک کے بعد ان کے بھی تربیت یافتہ تھے پھر بھی حضرت عمر کی اس عظمت کا تو جواب ہی نہیں جو اجتہادی بصیرت کی وجہ سے انہیں حاصل رہی۔ آخر نبی پاک نے انہیں خود خدا سے مانگا تھا۔ ایک بات جس کی طرف مسلمانوں نے کبھی نہیں سوچا وہ یہ تھی کہ خلافت تاحیات کا تصور درست نہیں تھا۔ ہمارے چاروں خلفاء تادم مرگ خلیفہ رہے۔ اگر حضرت عمر کی بے وقت شہادت نہ ہوتی تو ممکن ہے کہ خلافت کے نظام کے ارتقا اور تبدیلی سے اور مستحکم اور موثر کرتے۔ وہ ایسے اقدامات کرتے کہ ہم ان حوادث کا شکار نہ ہوتے جو ان کی شہادت کے بعد شہادت عثمان، علی اور شہادت حسین کی صورت پیش آئے اور خلافت ملوکیت میں بدل گئی۔ وہ تامرگ خلافت کو بدل کر بوڑھا اور کمزور ہونے پر خلیفہ کی سبکدوشی اور نئے خلیفہ کے انتخاب کی کوئی صورت پیدا کرتے تو حضرت عثمان کے بوڑھے اور کمزور ہونے پر خلافت کے اختیارات سے مروان بن حکم نہ کھیلتا۔ نہ حضرت عثمان کی شہادت ہوتی اور نہ حضرت علی اور نہ حضرت حسین کی اور نہ حضرت امیر معاویہ کو ملوکیت کے قیام کا موقع ملتا۔ یہ سب سے المناک راستہ تھا جو بند نہ ہو سکا۔ اگر جمہوری خلافت کا یہ نظام قائم ہو جاتا تو خلافت کا ادارہ صدیوں قائم رہتا اور خلافت کے نام پر اموی، عباسی اور دیگر ملوکیتیں وجود میں نہ آتیں اور اسلام اپنے عالمگیر پھیلاؤ کے باوجود ایک مستحکم نظام میں قائم و دائم رہتا پھر کوئی یہ تعبیر و تاویل بھی نہ کرتا کہ اسلام ملوکیت کے نظام کو بھی قبول کرتا ہے جبکہ اسلام ملوکیت کا دشمن ہے ملوکیت مسلمانوں میں رہی ہے مگر اسلام میں اس کا تصور ہی باطل ہے اگر اسلام میں ملوکیت مطلوب ہوتی تو نبی پاک خلافت یا حکمرانی کا تاج حضرت علی کے سر خود رکھتے کیونکہ ان کی بیٹی کے شوہر اور چچازاد بھائی کی حیثیت سے وہی قرابت دار اور حق دار تھے۔ حضرت علی اور شیعیان علی کا یہی دعویٰ تھا مگر رسول خدا نے اس کو کھلا چھوڑ دیا۔ مسلمانوں کی بصیرت پر اعتماد کیا جس کے تحت مسلمانوں نے سقیفہ بنی ساعدہ میں جمع ہو کر باہمی رضا سے فیصلہ کیا اور سب سے بزرگ، نبی پاک کے عہد میں امامت کرنے والے، جن کے پیچھے خود نبی نے نماز ادا کی، کو خلیفۃ الرسول منتخب کیا گیا اور ان کے ہاتھ پر بیعت کی گئی۔ خلافت کے ادارے کی دو امویوں مروان بن حکم اور امیر معاویہ اور ان کے بیٹے یزید کے ہاتھوں اضمحلال اور اس کے خلاف اٹھنے والی عبداللہ بن زبیر اور حضرت امام حسین کی تحریکوں کا بزور کچلنا اور اس کی حمایت میں عالم اسلام کا کامل سکوت۔ وہ المیہ ہے جس نے مسلمانوں کی ہلاکت و بربادی کے راستے کھول دیئے اور ہم ابھی تک ملوکیتوں اور آمریتوں کے پنجۂ خونی کے نخچیر ہیں۔ ڈاکٹر منظور اسے خوف اس لیے نہیں کہہ سکتے کہ انہیں کسی اندرونی اور بیرونی جارحیت کا ڈر نہ تھا بلکہ ملوکانہ دور میں بھی فتوحات تیز رہیں۔ تاہم ان کی یہ بات تو اقبال کے قریب اور حقیقت ہے کہ اس ملوکیت نے جس علم کلام، تصوف، فقہ اور تمدنی روایات کو جنم دیا اس نے ملوکیت کی گود میں آنکھ کھولی اور ان سب کا رخ بھی ملوکیت کے استحکام کی طرف رہا۔ خلافت نام رہا مگر خلافت کی روح حضرت امیر معاویہ کے ہاتھوں قتل ہو گئی اور اسلام ایک دین، نظام، تحریک سے روایت، تہذیب اور تمدن کے قالب میں گھٹ کر رہ گیا۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ فاسق حکمران کا تختہ الٹنے کی بجائے یہ منطق ایجاد ہوئی کہ فتنہ کے مقابلے میں فاسق سلطان کی حکومت قبول کی جا سکتی ہے۔ حالانکہ فاسق سلطان کی حکومت سے بڑا فتنہ کون سا ہوتا ہے؟ اس المیہ پر صدیوں سے مسلمان آنسو بہا رہے ہیں۔ ڈاکٹر منظور اور میں اقبال کے اس دکھ میں برابر کے شریک ہیں۔ معتزلہ، اشاعرہ، دیگر کلامیوں، صوفیوں اور فقیہوں کے سب ڈھکوسلے کتابیں تو بھر سکتے ہیں مگر وہ روح بلالی، صدق سلمانی اور فقر بوذری پیدا نہیں کر سکتے جو اسلام نے پرورش کیے اور قیصر و کسریٰ کے تخت و تاج الٹ گئے۔

ڈاکٹر منظور احمد اور ہم جن ہی راستوں سے گزر کر مسلمانوں کے زوال کے مشترک فیصلے پر پہنچے ہوں اس میں یہ اختلاف موجود ہے کہ ان کے ہاں مایوسی، خوف اور تشتت ہے جبکہ اقبال کی طرح میں بھی عصر حاضر کے تقاضوں سے امید رکھتا ہوں کہ وہ آئین شرع پیغمبر کو آشکار کر دیں گے۔ اس کھیتی میں نم پیدا ہو گا اس لیے ہم اپنی کشت ویران میں روئیدگی سے مایوس نہیں۔ اس لیے کہ بقول اقبال آج بھی خال خال ہی سہی اس قوم میں ایسے جرأت آزما نظر آتے ہیں جو اشک سحرگاہی سے وضو کرتے ہیں۔ اگر فوکویاما اور اڈنگٹن مزدکیت کے انہدام کے بعد اسے فتنہ فردا تصور نہیں کرتے تو وہ اپنی بصیرت میں اسلام کو تو فتنہ فردا تسلیم کرتے ہیں اور امریکی قیادت میں پورا یورپ ایک بار پھر متحد ہے ان کے پاس راڈارک (بش) ہے اور ہم صلاح الدین ایوبی (عراقی کرد) کی قیادت کے منتظر ہیں۔ یہ سوالیہ نشان کب اثبات میں ڈھلے گا۔ پردہ اٹھنے کی منتظر ہے نگاہ۔ اگر عالم اسلام کے عوام حکمرانوں کی طرف دیکھنے کی بجائے اپنی طرف دیکھیں۔ اپنے اپنے ہاں ملوکیتوں اور آمریتوں کے تخت و تاج اچھال کر جمہوریتوں کو استحکام دیں اور پھر ان جمہوریتوں کا وفاق مرتب کریں تو عصر حاضر کے ہر چیلنج کا جواب وہ دے سکتے ہیں۔ اسی طرف استبدادی طاقتیں ہمیں دھکیل رہی ہیں اور اسی سے نہنگوں سے نشیمن تہ و بالا ہوں گے اور مسلمان خانقاہوں سے نکل کر رسم شبیری ادا کریں گے۔

ڈاکٹر منظور احمد کا مقالہ اقبال۔ حالیہ فکری تناظر میں ایک اچھی کاوش ہے کہ اقبال کی فکر پر ان کے تین بڑے اساتذہ ولیم رچی سورلے، جیمس وارڈ اور جان میکیگرٹ کے اثرات کا سراغ ملتا ہے۔ ان تینوں کا رخ مذہبی تصوریت کی جانب تھا۔ وارڈ کے گفرڈ لیکچر کا اقبال نے بھی حوالہ دیا ہے پھر ڈاکٹر منظور نے ان کا رشتہ ہیگل سے ملایا ہے جو حقیقت اعلیٰ کا روحانی تصور رکھتا تھا۔ اگر ڈاکٹر منظور کی کوشش کو یہ تصور نہ بھی کیا جائے کہ انہوں نے شمل، خلیفہ حکیم، بی۔ اے ڈار اور متعدد اقبالیات کے ماہرفن کی طرح یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ اقبال کی فکر ان حضرات مغرب کی خوشہ چین ہے جس کا جواب اقبال نے نکلسن کو دیا تھا یا بعض

دوسرے لوگوں کو دیا جو نٹشے، کارل مارکس، ولیم جیمز وغیرہ کا محض خوشہ چین بتاتے ہیں تو میں عرض کروں گا کہ یہ اقبال کی خوبی ہے کہ وہ ہم عصری دانش سے بے خبر نہ تھے اور اپنے مذہبی اور عمرانی معتقدات کے لیے انہوں نے ان سے استفادہ کیا جو معیوب بات نہیں مگر اقبال کا سارا رویہ انتقادی تھا۔ ہیگل کے صدف کو گہر سے خالی قرار دے کر کہا کہ اس کا فلسفہ خیالی ہے مارکسزم پر سخت نقد کی اور نیٹشے کے بارے میں کہا کہ اگر وہ مجذوب فرنگی اس زمانے میں ہوتا تو اقبال اسے سمجھاتا کہ مقام کبریا کیا ہے؟ پھر ایک فارسی شعر میں کہا کہ کاش وہ حضرت مجدد الف ثانی کے عہد میں ہوتا۔ تو وہ سرور سرمدی سے بہرہ یاب ہوتا۔

اقبال نے یقیناً اپنے فکر کی پرداخت میں روح عصر سے استفادہ کیا ہے مگر یہ محض استفادہ تک ہی محدود ہے۔ اقبال نے کسی بھی سطح پر کسی کے افکار کی جگالی نہیں کی بلکہ انہیں اپنے نظریات وافکار کی تنقیح، توضیح اور استحکام کے لیے استعمال کیا ہے۔ ورنہ محض نقالی مقصود ہوتی تو وہ ۱۹۰۲ء میں لکھے گئے مور کے مقالہ ''تصوریت کا رد'' سے بھی متاثر ہوتے۔ اقبال نے اسی لیے کبھی مور اور رسل کے تصورات کو قبول نہیں کیا اور رسل بھی اقبال کو فلسفی کے طور پر قبول نہیں کرتے تھے۔ اسی طرح وٹگنسٹائن کے فلسفے کو بھی انہوں نے زیادہ درخور اعتنا نہیں سمجھا۔ کیونکہ اس کا تعلق زبان، جملے اور عبارت کے متن اور مفہوم سے تھا جو دراصل انہدام فلسفہ و مابعد الطبیعیات کی ایک جہت تھی۔ اگرچہ بعض لوگ اسے بھی ایک نئی مابعد الطبیعیات قرار دیتے رہے ہیں۔ وٹگنسٹائن سے زبان، فلائی بوتل میں، متن، جملہ، عبارت کے مفہوم کے متن و معنی سے ہائیڈیگر کے واسطے سے تشکیل اور رد تشکیل، ساختیات کے مبحث کی طرف موڑ گیا جو اقبال کے تصورات سے لگا نہ کھاتا تھا۔ اقبال جس اخلاقی نصب العین کی انسان میں تخم ریزی چاہتے تھے اور عصر حاضر کی ذہنی تشکیل میں اخلاقی قوت کو جو مقام دلانا چاہتے تھے ان لوگوں کی طرف اس کی توجہ نہیں تھی۔ وہ تمام لفظ و معنی کے حوالے سے تمام معتقدات، اخلاقیات اور تصورات کے انہدام کی طرف راجع تھے جس کے ثمرات دریدا، اڈگلٹن، سالسر اور نئے منطقین کے ہاں برآمد ہوئے۔ ان لوگوں نے تو لفظی کھیل کی فلائی بوتل میں سب کچھ بند کر دیا۔ جس کا نتیجہ عدمیت، فنائیت، قنوطیت، انتشار و افتراق تھا۔ اس کے خلاف اقبال نے اپنے فلسفہ خودی کو ایک مثبت بنیاد کے طور پر پیش کیا جس میں فردیت کی تشکیل، استحکام ذات، نئے معاشرے کی تشکیل کے تصورات سے نوع انسانی کے لیے امید اور حوصلہ کی راہ پیدا کی۔ بہر حال ڈاکٹر منظور کا یہ مقالہ فکر اقبال کے بعض بنیادی سوالات کی تفہیم میں کارگر ہے۔

ڈاکٹر منظور احمد کا تیسرا مقالہ اقبال، سائنس اور مذہب ہے۔ دراصل اقبال نے سائنس اور ٹیکنالوجی میں زیادہ امتیاز نہیں کیا۔ مسلمانوں نے سائنس سے کہیں زیادہ ٹیکنالوجی پر اپنی توجہ رکھی جسے یورپ نے پروان چڑھایا۔ جدید یورپ کی ترقی کی اساس بھی ٹیکنالوجی پر زیادہ ہے۔ اگرچہ سائنس کو کلیۃً اس سے جدا بھی نہیں کیا جا سکتا اقبال نے ٹیکنالوجی کی نسبت سائنس کو اپنی فکر میں اہمیت دی تھی اور اس سے شدید متاثر ہوئے۔ سائنس کے مضمرات کی نسبت وہ اس کے حاصلات سے زیادہ متاثر تھے اس لیے وہ ہر عقیدہ اور تصور کی سائنسی اساس چاہتے تھے۔ مذہبی مشاہدہ (پہلا خطبہ) مذہبی مشاہدے کے معیارات (دوسرا خطبہ) اور کیا مذہب کا امکان ہے؟ میں وہ انہی الجھنوں کا شکار رہے اور بقول ڈاکٹر منظور ''سائنس اور مذہبی تجربات کی منطق کے مابین امتیازات کو نظر انداز کر گئے''۔ باقی اقبال بھی علت غائی یا علت اول یا علت وجودی کو خدا کے لیے دلیل تصور نہیں کرتے وہ مذہبی تجربے کے موضوع خدا تک رسائی کے لیے ان علتوں کے گورکھ دھندے کو بے کار قرار دیتے ہیں۔ اقبال بھی خدا کو منطقی یا سائنسی قضیہ قرار نہیں دیتے تو ڈاکٹر منظور کیوں کر اسے اقبال کی بھول قرار دیتے ہیں۔

گزشتہ صفحات میں ہم نے یونانی فکر کی مسلمانوں پر گرفت کا جو تذکرہ کیا ہے اقبال کے ہاں بھی اس کا احساس ہے اور ڈاکٹر منظور کو بھی۔ اپنے مضمون ''اقبال حالیہ فکری تناظر میں'' کے آخر پر وہ لکھتے ہیں کہ ''یونانی فکر کی جو گرفت ہے وہ سیدھا دیکھنے کی راہ میں رکاوٹ بن جاتی ہے۔ تاریخ اور فکر یونانی کی اہمیت اور ضرورت اپنی جگہ لیکن ایک غیر شعوری خوف جس میں ہماری فکر مبتلا ہے وہ ہمیں آگے قدم بڑھانے سے روکتا ہے اور یہ غیر شعوری خوف ملامت کرنے والے کی ملامت سے بھی ہے اور اس ڈر سے بھی کہ کہیں ہم اپنا تشخص کھو نہ بیٹھیں''..... ڈاکٹر منظور کو پتہ ہونا چاہیے کہ ہمارا تشخص قرآن ہے اور یہ تشخص ہم کھو چکے ہیں اس لیے کہ اموی ملوکیت کے بعد قرآن سے انحراف کا جو عمل شروع ہوا وہ خلافت سے ملوکیت کی طرف، شریعت سے روایت، طریقت سے تصوف کی طرف۔ قرآن کی حکمت سے علم کلام کی طرف رہا ہے، فقہ نے ملوکیت کے لیے نرم گوشہ پیدا کیا۔ علم کلام نے یونانیت کو۔ یونانی فلسفے کو ہم نے قرآن پر مسلط کر دیا، اخلاق و کردار میں ہم نے اپنی جاہلیت کی روایات کا جا بجا احیا کیا اور اسلام اور قرآن محض عقیدہ بن کر رہ گئے یا ہم اسے اپنے مقاصد کے لیے استعمال کرنے لگے جس کا آغاز امیر معاویہ نے عمرو بن عاص اور موسیٰ اشعری کے ذریعے کیا تھا۔ قرآن کو حکم بنایا اور پھر اسی سے تاویل اور گریز کیا اور اب قرآن ترتیل و تلاوت اور عدالتوں میں قسمیں کھانے کے کام آتا ہے۔ رہ گئی رسم اذان، روح بلالی سے ہم فکر میں، سیاست میں اور عمل میں فارغ۔ ڈاکٹر منظور کو جس تشخص کے کھونے کا ڈر ہے وہ بتائیں تو سہی کہ وہ کہاں ہے؟

ڈاکٹر منظور کا تیسرا مقالہ اقبال، سائنس اور مذہب ہے۔ اس پر اتنا ہی تبصرہ کافی ہے کہ پہلے ہم قرآن کو یونانیت پر منڈھتے رہے۔ اب سائنس پر منڈھ رہے ہیں۔ سائنس ہماری غلام نہیں ہم سائنس کے اسیر ہیں۔ ہم نے سائنس کے حاصلات سے قرآن فہمی میں شمہ بھر استفادہ نہیں کیا قرآن کے صدق و کذب کا معیار اسے بنا دیا اور ہر سائنسی تصور پر قرآن کی آیت نکال کر قرآن کی صداقت کی دلیل چاہی اور کہا دیکھو! قرآن بھی یہی کہتا ہے۔ اقبال کے ہاں بھی یہ منہاج بری طرح کھٹکتی ہے۔ سائنس سے بڑھ کر ٹیکنالوجی نے انسان کو جو فتوحات دی ہیں ہم اس سے مسخر ہو کر رہ گئے ہیں۔ بہر حال فلسفہ، سائنس اور سائنس سے مفر بھی ممکن نہیں صرف اتنا ہونا چاہیے کہ سائنس زدگی نہ ہو۔ سائنس کو ایک آلہ تصور کرنا چاہیے جو ہمارے فائدے کے لیے اسباب فراہم کرے، وہ ہمارے قتل کا آلہ نہ بنے۔ سائنس کا خود ترویج وارتقا بھی ہمارے اپنے معتقدات اور ضرورت کے تحت ہوا اسے مادر پدر آزاد الہ دین کا جن نہ بنا دیا جائے اس کو واضح مقاصد کے تحت رکھا جائے۔ ڈاکٹر منظور کی اس بات میں وزن ہے کہ اقبال کی فکر ایک نئے سائنسی طریق کار کی اساس بن سکتی ہے۔ مگر شاید ہنوز دلی دور است۔

ان کا اگلا مقالہ اقبال کا فلسفۂ مذہب ہے۔ اس مقالے میں ایک ہی بات بنیادی ہے کہ مذہب کی اساس مذہبی تجربے پر رکھنا درست نہیں اور مجھے اس سے اتفاق ہے۔ مذہبی تجربے پر تصوف کی بنیاد ہو سکتی ہے، جبکہ مذہب اسلام کی بنیاد وحی پر ہے۔ اقبال کے مذہبی تجربے میں وقوف و ادراک ڈھونڈتے ہیں جب کہ میرے نزدیک وحی، وقوف و ادراک کی اعلیٰ ترصورت ہے۔ ڈاکٹر منظور کے نزدیک یہ اقبال کی بنیادی غلطی ہے اور میرے نزدیک یہ کوشش ہی لغو ہے۔ مذہبی تجربہ ذاتی، موضوعی اور محدود ہے جبکہ وحی معروضی، عالمگیر اور لامحدود ہے۔ مذہبی تجربہ کسی دوسرے کے لیے حکم نہیں جبکہ وحی حکم ہے۔ مذہبی تجربے قیامت تک ہوتے رہیں گے جبکہ وحی نبی ﷺ کے ساتھ ہی منقطع ہو گئی۔ اسی مذہبی تجربے کا شاخسانہ ابن عربی کا نظریہ بروز ہے جس کا حاصل قادیانیت اور بہائیت وغیرہ ہیں۔ مذہبی تجربہ کا تصور ہی وحی کے خلاف ہے۔ لہٰذا اقبال کا مذہبی تجربے میں وقوف و ادراک تلاش کرنا اثبات مذہب بھی نہیں کرتا اور یہ شغل بے کار بھی ہے یہ اقبال کے ہاں ان کے کسی مغالطے کا نتیجہ ہے اور شاید انہوں نے اس کے تباہ کن نتائج پر کبھی غور ہی نہیں کیا۔

''اقبال اور تصوف کی مابعد الطبیعیات'' پر ڈاکٹر منظور کا مقالہ میں اس لیے زیر بحث نہیں لا رہا کیونکہ اقبال تصوف کی مروجہ تمام صورتوں کو بتان عجم قرار دیتے ہیں اور جس طرح کے ادارے اور سلاسل تصوف کے نام پر تشکیل پائے وہ تمام ہی خلاف اسلام ہیں۔ تزکیہ نفس، طہارت روح، تعلق باللہ اور اتباع رسول شریعت کے دوائر سے باہر گراہی ہیں۔ تصوف کے ردعمل میں ہی اقبال کا تصور خودی وجود میں آیا۔ تصوف کے امام ابن عربی کی بائبل ''فصوص'' میں اقبال کو الحاد و زندقہ کے سوا کچھ نظر نہیں آیا تو اس کے بعد روایتی تصوف اقبال میں ڈھونڈنا ظلم ہے۔ یہ بھی ملوکیت کا تحفہ ہے جب لوگ اموی ملوکیت کے خلاف بغاوت نہ کر سکے اور خلافت کے احیا کی جرأت اپنے اندر نہ پا سکے تو وہ پاکیزگی نفس، خدا سے تعلق کے فاعلانہ رویے چھوڑ کر مفعولانہ رویے اپنا کر گھروں اور خانقاہوں میں بند ہو گئے اور بزعم خویش اسلام کی خدمت کرنے لگے۔ اموی، عباسی اور دیگر مملوک آزادانہ مسلمانوں اور اسلام کے مقدر سے کھیلنے لگے اب مسلمان، دل ملوکیت میں کانٹے کی طرح کھٹکتے نہیں تھے اس لیے کہ وہ اسے دنیا داری کہہ کر حجروں میں اللہ ہُو کر رہے تھے۔ تصوف سے ملوکیت کے مقاصد کی بڑی عمدہ تکمیل ہوئی۔ حضرت مجدد کے سوا کبھی کسی صوفی نے حاکم وقت کو نہیں للکارا۔ بلکہ حاکموں کو کھل کھیلنے اور ان کی معاونت کا وظیفہ بنے ہیں حاکمانِ وقت نے بھی ہمیشہ ان کی پیٹھ ٹھونکی ہے۔

آخری مقالہ خدا، خودی، زمان و مکان ہے۔ یہ تصورات اقبال کی فکر میں اساسی ہیں اس تبصرے میں شاید گنجائش بھی نہیں کہ ان پر کھل کر بات ہو سکے۔ ہم اس مقالے کو چھوڑ رہے ہیں کہ ہمارے مختصر بیان سے انتشار ذہن اور خلجان فکر پیدا نہ ہو۔ خدا کو بے مثل اور بے نظیر تصور کرنا ہی مناسب ہے۔ تمام اصطلاحات و تعبیرات خدا کے تصور کو عیاں کرنے کی بجائے اس کو تحریر کرنے اور ابہام پیدا کرنے کا ہی باعث ہیں۔ اقبال نے بھی سورہ اخلاص ہی اپنے خطبہ میں پیش کی ہے اور وہی کافی ہے۔ اس پر کوئی سی بھی حاشیہ آرائی مناسب نہیں۔ عقلی دلائل سے خدا کے وجود کا انکار بھی ممکن نہیں۔

ڈاکٹر منظور احمد کی کتاب ''اقبال شناسی'' تمام تر اختلافات کے باوصف اقبال شناسی کی ایک سنجیدہ کوشش ہے اور فکر اقبال کا فلسفیانہ سنجیدگی سے مطالعہ کی ایک اہم سعی۔ اقبال ہمارے لیے کتنے ہی اہم اور محترم سہی تاہم ان کی فکر کا علمی اور تنقیدی سطح پر مطالعہ لازم ہے۔ خواہ اس سے اختلافات سامنے آئیں خواہ اس سے ہمارے جذبات کو صدمات پہنچیں۔ وہ ہماری فکر و دانش میں اساسی حوالہ ہیں اور اس کو جانے بغیر ہم آگے نہیں بڑھ سکتے، اتفاق و اختلافات سے ہی ان کی فکر ہمارے لیے سچی رہنمائی کا باعث ہوگی۔ اندھی تقلید اقبال کی کوئی خدمت نہیں اور نہ اقبال شکنی۔ ڈاکٹر منظور کی کتاب کا اقبال کی فکر کی ایک تنقیدی کاوش کے طور پر مطالعہ کیا جانا چاہیے اور ہماری تنقید کو بھی ایسی ہی کوشش سمجھنا چاہیے۔ نہ اقبال حرف آخر ہیں نہ ڈاکٹر منظور اور نہ ہم۔ یہ افہام و تفہیم کا عمل ہے اور یہ جاری رہنا ہی فکر اقبال کی روح ہے۔ تاہم بین السطور میں اس بات کو بھی ذہن میں رکھنا چاہیے کہ اسلامی فکر میں بصیرت کی روایت ۔۔ اسلام پر اقبال کے کندھے پر رکھ کر انہوں نے توپ داغی ہے کہ یہ فکر آؤٹ ڈیٹڈ یعنی اذکار رفتہ ہے یہ عصر حاضر کے وقوفی ادراک اور منطق قضایا سے لگا نہیں کھاتا۔ لہٰذا ہمیں اسلامی فکر میں بصیرت کی اس روایت اور عہد حاضر میں اس کے داعی اور نقیب کو نظر انداز کر کے ایک قدم اور بڑھنا چاہیے۔ کس طرف۔ ظاہر ہے کہ ڈاکٹر منظور کے نزدیک وہ سمت اور منزل مغرب ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ خود مغرب بھی اپنے سیکولرزم سے کچھ حاصل نہیں کر سکا۔ مسیحی ریاستیں آج بھی مسیحی مفادات کی محافظ ہیں، اسرائیلی ریاست یہودیت کی اور بھارت ہندو ریاست ہے جس نے سیکولرازم کو آڑ بنا کر چھوٹی قوموں کی آزادی اور حقوق کو غصب کر رکھا ہے۔ روس مسیحی اور چین میں بدھ ازم اور کنفیوشس ازم بڑے ہی دھیمے قدموں سے نئی شناخت کی تشکیل کر رہا ہے۔ سیکولرازم سے مسیحی انتہا پسندی کی طرف بڑھ کر مغرب خود ایک نئے مخمصے میں ہے جس سے وہاں بے سمتی، خوف، تشتت، جمہوری بربریت اور آزاد وحشت کا اسیر ہے جہاں دہشت گردی اور خوف کا دور دورہ ہے۔ حالانکہ مغرب نسلی تفاخر اور مسیحی بالادستی کی تنگناؤں سے نکل کر جدید سائنس اور ٹیکنالوجی کی مدد سے پوری نسل انسانی کے لیے روٹی، تعلیم، روزگار، گھر اور سماجی و روحانی فوز و فلاح کے ذرائع فراہم کر سکتا تھا تاکہ دنیا امن کا گہوارہ بنے مگر اس نے امریکی قیادت میں اپنی بالادستی، نوع انسانی کے وسائل کی لوٹ کھسوٹ، اسلحہ سازی اور تباہی کے ذرائع کی طرف قدم بڑھایا ہے جس سے اس نے پوری دنیا کی نفرت اور دہشت خریدی ہے اس کے نتیجے میں آج امریکہ اور مغرب ایک سمت ہیں اور پوری نسل انسانی دوسری طرف۔ جس سے انسانیت ایک خوفناک بحران اور المیہ سے دوچار ہے۔ ایسی صورت حال میں اقبال اس کے خلاف ہماری امید اور ہمارا حوصلہ ہیں اس لیے ڈاکٹر منظور نے اقبال پر ہی سب سے سخت وار کیا ہے۔ یہی اس کتاب پر بحث کا ملخص ہے۔

## اقتباس

اقبال کو مسلمانوں کے صرف جاہ و منزلت سے محروم ہو جانے کا قلق نہیں تھا، بلکہ ان کے مطالعہ نے ان کو یہ بھی بتایا کہ مسلمانوں نے علم کی مسند بھی مغرب کے لیے خالی کر دی ہے اور مغرب نے ان کے علمی اثاثہ کے بل بوتے پر فلسفہ جدید اور سائنس کی شاندار عمارت تعمیر کر لی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ مفکرین اسلام میں اقبال ہی ایک ایسے شخص ہیں جنہوں نے اس حقیقت کی تہہ تک پہنچنے کی کوشش کی کہ مسلمانوں میں روشن خیالی پیدا نہ ہونے کے اسباب کیا ہیں، اور نشاۃ ثانیہ صرف ان تہذیبوں کا حصہ کیوں بنی جو یہودی اور عیسائی مسلکوں پر عمل پیرا تھیں۔ یہ بات بھی بڑی بدقسمتی کی ہے کہ اقبال نے اپنی اس یافت کی اہمیت کو محسوس نہیں کیا اور بالآخر وہ بھی اسی علمی جمود کا شکار ہو گئے جس سے وہ بچنا چاہتے تھے۔

**''اقبال شناسی'' از منظور احمد**

# مالک رام

پروفیسر جگن ناتھ آزاد

وید بھگوان میں ایک دعائیہ منتر ہے:

''اے خداوند قدیر! مجھے ایک ایسے عالم کی صحبت عطا کر جو اپنے علم وفضل سے (صحیح راستے کی جانب) میری رہنمائی کر سکے اور مجھ پر حق وصداقت کا انکشاف کرے۔'' (رگ ۶:۵۴:۱)

یہ دعا غالباً میرے لبوں پر تو کبھی نہیں آئی تھی لیکن دل کی گہرائیوں میں ضرور مچلتی رہی ہوگی اور شاید اسی خاموش دعا کا اثر ہوگا کہ میری خوش قسمتی مجھے مالک رام صاحب کے قریب تر لے گئی اور اس طرح کہ خوردی وبزرگی کے رشتے کے باوجود ہم دونوں میں بے تکلف مراسم پیدا ہو گئے اور ان بے تکلف مراسم نے انجام کار کچھ مدت کے لیے استادی شاگردی کے رشتے کی صورت اختیار کر لی۔

لیکن استادی شاگردی کچھ مدت کے لیے نہیں ہوتی۔ یہ روحانی رشتہ ہے اور ایک بار شروع ہو کر ٹوٹتا نہیں ہے اس لیے مجھے یہ نہیں کہنا چاہیے تھا کہ استادی شاگردی کا رشتہ کچھ مدت کے لیے پیدا ہو گیا۔ مجھے یہ کہنا چاہیے تھا کہ استادی شاگردی کا باضابطہ تعلق چند دن سے آگے نہ بڑھ سکا لیکن اس باضابطہ تعلق سے پہلے بھی اور بعد میں بھی، میں نے مالک رام صاحب کی زبان، ادب اور تحقیق میں استادانہ حیثیت کو ہمیشہ تسلیم کیا ہے اور ان کی بات کو اسی توجہ سے سنا ہے جس توجہ سے ایک شاگرد کو سننا چاہیے۔

باضابطہ درس وتدریس کی بات یہ ہے کہ غالباً ۶۴ء میں میں نے قرآن شریف پڑھنے کا عزم کیا۔ ظاہر ہے کہ مالک رام سے بہتر قرآن پڑھانے والا کہاں سے میسر آتا۔ میں نے ان سے درخواست کی، انہوں نے قبول کر لی، گویا:

پا سباں مل گئے کعبے کو صنم خانے سے

اس زمانے میں وہ مولانا آزاد کی تصانیف ''ترجمان القرآن''، ''غبار خاطر'' اور ''تذکرہ'' کی ترتیب وحواشی کے کام میں مصروف تھے اور اسی سلسلے میں باقاعدہ ساہتیہ اکیڈمی کے دفتر میں بیٹھا کرتے تھے۔ میں قریب ہی پریس انفارمیشن بیورو میں انفارمیشن آفیسر تھا۔ طے یہ پایا کہ میں لنچ کے اوقات میں ان کے پاس پہنچ جایا کروں۔ میں نے پابندی کے ساتھ ان کی خدمت میں پہنچنا شروع کیا اور کلام پاک پڑھنے کی میری دیرینہ آرزو پوری ہونے لگی۔

اس سلسلے کو چند ہی روز گزرے تھے۔ ایک دن میں آموختہ انہیں سنا رہا تھا کہ ان کی میز پر ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ یہ ٹیلی فون میرے لیے تھا۔ بتانے والا بتا رہا تھا کہ میرے ایک عزیز کا شدید حادثہ ہو گیا ہے۔ وہ سڑک پار کر رہے تھے کہ ایک تیز رفتار بس کی جھپٹ میں آ گئے، انہیں نازک حالت میں ولنگٹن ہسپتال پہنچا دیا گیا ہے۔

یہ سنتے ہی میرے حواس گم ہو گئے۔ سبق چھوڑ کر میں نے فوراً اسکوٹر پر پاؤں رکھا اور اسپتال جا پہنچا۔ میرے عزیز کی حالت

مخدوش تھی۔ خدا کا شکر ہے کہ چند ماہ کے علاج کے بعد وہ صحت یاب ہو گئے لیکن کلام پاک کی تعلیم کا سلسلہ دوبارہ شروع نہ ہو سکا۔

اس ضمن میں جو بات مجھے آج تک متاثر کر رہی ہے اور جس پر میں آج تک عمل پیرا ہوں یہ ہے کہ مالک رام صاحب نے سورہ فاتحہ شروع کرانے سے قبل ہی مجھے قرآن شریف کو ہاتھوں میں اٹھانے اور میز پر رکھنے کے آداب سے آشنا کیا۔ کلام پاک کا احترام تو مجھے ابتدا ہی سے گھر میں سکھایا گیا تھا، لیکن مالک رام صاحب نے میری تعلیم قرآن کی ابتدا اس احترام سے کی اور سورہ فاتحہ پڑھانے سے قبل ہی مجھے روح مذہب سے آشنا کرنے کی کوشش کی۔

جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے مالک رام صاحب سے میری پہلی ملاقات ۵۰ء میں ہوئی، ''آج کل'' کے دفتر میں، جوشؔ صاحب کے کمرے میں۔ ایک رات قبل ایک جگہ شعرا کی دعوت تھی، دعوت رات کے بارہ ایک بجے ختم ہوئی تو میں نے جوشؔ صاحب سے کہا کہ مجھے صبح عدالت میں ایک گواہی کے سلسلے میں پیش ہونا ہے۔ شاہراہ کے مالک یوسف جامعی اور ایڈیٹر پرکاش پنڈت پر ممتاز شیریں کی ایک کہانی کے سلسلے میں ایک صاحب نے مقدمہ دائر کر دیا ہے۔ مجھے یوسف جامعی اور پرکاش پنڈت کی طرف سے پیش ہونا ہے اس لیے میں کل وقت پر دفتر نہیں پہنچ سکوں گا۔ شاید ایک ڈیڑھ بجے حاضر ہو سکوں گا۔

میں جب خاصی تاخیر سے دفتر پہنچا تو سوچا پہلے جوشؔ صاحب کے کمرے میں پہنچ کر انہیں اپنی آمد کی اطلاع دے دوں۔ وہاں پہنچا تو دیکھا کہ حسب دستور محفل جمی ہے۔ میں شاید دعا سلام کیے بغیر ہی جوشؔ صاحب سے مخاطب ہوا اور بولا کہ عدالت میں بہت دیر ہو گئی۔ مقدمے کی سماعت ہی بارہ بجے شروع ہوئی۔ میں نے ابھی اتنا ہی کہا تھا کہ ایک صاحب جن سے میری کوئی شناسائی نہیں تھی اور جنہیں میں نے کبھی دیکھا ہی نہیں تھا، جھٹ سے بول اٹھے یہ عدالت وغیرہ کا بہانہ آپ کیوں کرتے ہیں؟ جب رات کے بارہ بارہ ایک ایک بجے تک شراب کی محفلیں رہیں گی تو وقت پر دفتر آنا کیسے ممکن ہو سکے گا۔ میں ایک اجنبی کے منہ سے یہ تبصرہ سنتے ہی بھنا گیا۔ جلدی میں مجھ سے جواب نہ بن پایا۔ اتنے میں جوشؔ صاحب نے قہقہہ لگایا اور بولے ''بھئی یہ مالک رام ہیں''۔ مالک رام کا نام سنتے ہی میں اچھل پڑا اور انہوں نے اٹھ کر فوراً مجھے گلے لگا لیا۔

اس ملاقات میں یہ پتہ چلا کہ مالک رام صرف ایک دو دن کے لیے مصر سے آئے ہیں۔ مجھے حیرت ہوئی کہ مصر کوئی غازی آباد یا میرٹھ تو ہے نہیں کہ آپ ایک دن کے لیے دہلی آئے ہیں۔ معلوم ہوا کہ کسی میٹنگ کے سلسلے میں آئے ہیں اور کل یا پرسوں واپس چلے جائیں گے۔ چنانچہ یہ ملاقات یہیں تک محدود رہی۔

۱۹۶۲ء میں مجھے انگلستان اور یورپ کا سفر درپیش آیا۔ مالک رام صاحب بہ سلسلہ ملازمت اس زمانے میں بلجیم کے دارالحکومت برسلز میں تھے۔ میں نے انہیں قبل از وقت اطلاع دی اور جب لندن میں، میں اپنے کام سے فارغ ہو گیا تو مالک رام صاحب کے ساتھ طے شدہ پروگرام کے مطابق میں نے برسلز کا رخ کیا۔ وہاں ان کے ساتھ جو چند روز بسر ہوئے وہ یورپ کے سفر کا حاصل تھا۔

غالباً اس زمانے میں مالک رام صاحب ''گل رعنا'' کے حواشی لکھ رہے تھے۔ رات کے دس گیارہ بجے تک میرے ساتھ ان کی خوش گپیاں رہتی تھیں اور اس کے بعد جب میں سو جاتا تھا تو وہ اپنا علمی اور تحقیقی کام شروع کرتے تھے۔ ان کی محنت کرنے کی یہ عادت آج بھی اسی طرح جاری ہے اور انہیں مصروف کار دیکھ کر یورپین محققین اور مستشرقین کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ رات کو کھانے کے بعد ہم دونوں بلجیم کی سڑکوں پر گشت کر رہے تھے۔ بات چیت کے دوران میں، میں نے حافظ کا یہ مصرع پڑھا۔

نہ ہر کہ سر بتراشد قلندری داند

مالک رام صاحب یہ مصرع سنتے ہی سوچ میں پڑ گئے اور قدرے توقف کے بعد بولے ''غالباً موبتراشد'' ہے اب اس کے بعد میں بھی یقین سے کچھ نہ کہہ سکا۔ میں نے اتنا ہی کہا کہ میں نے شاید ''سر بتراشد'' ہی پڑھا ہے''۔ ممکن ہے غلط پڑھا ہو۔ ویسے اقبال نے بھی اس مصرعے کو اپنایا ہے تو یوں:

اگر چہ سر بتراشد قلندری داند

بات آئی گئی ہوگئی۔ کوئی چند ماہ کی سیاحت کے بعد میں وطن واپس آیا۔ اس دوران میں مالک رام صاحب کے ساتھ باقاعدہ قسم کی خط و کتابت شروع ہو چکی تھی۔ ان کا ایک خط مجھے یورپ سے واپسی کے قریباً ایک برس بعد ملا۔ اس میں لکھا تھا آپ کو یاد ہوگا بلجیم میں ایک رات دوران گفتگو میں حافظ کے ایک مصرعے پر بات ہوئی تھی۔ آپ نے مصرع صحیح پڑھا تھا۔ اس میں ''موبتراشد'' نہیں ہے ''سر بتراشد'' ہے۔ میری حیرت کی حد نہ رہی۔ جس بات کو میں ایک وقتی بات سمجھ کر بھلا چکا تھا، وہ مالک رام صاحب کے لیے موضوع تحقیق بن گئی اور جب تک اس کے متعلق انہوں نے پوری تحقیق نہ کر لی انہیں چین نہ آیا۔

اسی دوران قیام میں، میں نے مالک رام صاحب کے یہاں ایک عجیب و غریب چیز دیکھی اور یہ ایک آٹوگراف چارٹ تھا۔ آٹوگراف بک تو ہم سب نے دیکھی ہوگی لیکن یہ آٹوگراف چارٹ میرے لیے ایک عجیب و غریب چیز تھا۔ جیسے دنیا کا نقشہ دو ڈنڈوں اور ایک رسی کے سہارے دیوار پر لٹکا رہتا ہے۔ اسی طرح یہ آٹوگراف چارٹ ان کے ڈرائنگ روم میں لٹکا رہتا تھا اور اس پر دنیا بھر کے آدمیوں کے دستخط موجود تھے۔ کسی کے صرف دستخط تھے، کسی کے شعر سمیت دستخط۔ کسی نے کوئی جملہ لکھا تھا کسی نے کوئی مقولہ، غرض یہ چارٹ ایک ہی نظر میں عجب بوقلمونی کیفیت پیش کر رہا تھا۔ میری واپس انگلستان روانگی سے ایک رات قبل مالک رام صاحب نے یہ چارٹ میرے سامنے رکھا اور مجھ سے اس پر آٹوگراف دینے کو کہا۔ میں نے پنجابی کے ایک شاعر کا مندرجہ ذیل شعر لکھ کر اپنے دستخط کر دیئے۔

الف اج دی رات وصال والی بھلکے کی جانڑاں کیڑھا رنگ ہوسی
میلے فیر محمدا قسمتاں دے کتھے شمع تے کتھے پتنگ ہوسی

دراصل اس رات مالک رام صاحب سے جدا ہوتے وقت میرے دل کی کیفیت یہی تھی اور جب مجھے ایک حسب حال شعر یاد آ گیا تو میں نے اسے آٹوگراف چارٹ پر لکھ دینا مناسب سمجھا۔

معلوم نہیں یہ آٹوگراف چارٹ اب مالک رام صاحب کی کتابوں کے ساتھ ہمدرد یونیورسٹی نے سنبھال کر رکھا ہے یا نہیں کیونکہ اگر یہ کھو گیا ہے تو اس پر کیے ہوئے پطرس بخاری، آرتھر آربری، سر ظفر اللہ خاں، ایساندر بسانی، جولیس جرمینوس اور انامیری شمل کے دستخط یا آٹوگراف بھی گم ہو چکے ہیں۔

میرے اس قیام برسیلز کی ایک اور رات بھی مجھے ہمیشہ یاد رہے گی اور یہ وہ رات تھی جب مالک رام صاحب نے اپنے گھر میں محفل شعر کا اہتمام کیا۔ اردو شاعری کی محفل اور برسیلز میں مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے ہندوستان یا پاکستان کے کسی شہر میں بیٹھا ہوں۔ ہندوستانی اور پاکستانی سفارت خانے کے اکثر و بیشتر لوگ اس محفل میں موجود تھے۔ غالباً دونوں ملکوں کے سفیر کبیر بھی تھے۔ اس وقت بلجیم میں ہمارے سفیر تھے کے۔ بی۔ لال اور پاکستان کے سفیر تھے جنرل محمد ایوب خاں کے بھائی۔ نام ان کا مجھے یاد نہیں رہا۔ شاعر صرف میں تھا۔ اس لیے میں نے جی بھر کے کلام سنایا اور سننے والوں نے بھی جی بھر کے سنا کہ ایک مدت کے بعد انہیں ایک اردو شاعر کا کلام سننے کا موقع مل رہا تھا دیار فرنگ میں۔ رات کے کوئی دو بجے تک یہ محفل جمی رہی۔

قیام برسیلز کے دوران ہی میں مالک رام صاحب کے مشورے کے مطابق میں نے ہالینڈ، لکسمبرگ، جرمنی اور فرانس کی ایک جھلک دیکھنے کا پروگرام بنا لیا۔ ایک دن تو ایسا ہوا کہ میں صبح برسیلز سے چلا اور رات تک ہالینڈ کی سیر کر کے واپس آ گیا اسی طرح چند روز ان کے ساتھ گزارنے کے بعد میں پھر انگلستان واپس چلا گیا۔

آخر جب وطن واپس آنے کا پروگرام طے ہوا تو میں نے پھر برسیلز کا رستہ اختیار کیا۔ مقصد یہ تھا کہ ایک تو مالک رام صاحب سے ملاقات ایک بار پھر ہو جائے گی دوسرا ان سے سفر ہسپانیہ کے متعلق ہدایات لے لوں گا کیونکہ میں وطن واپس لوٹنے سے قبل مسجد قرطبہ کی زیارت کرنا چاہتا تھا۔ اس وقت مسجد قرطبہ کو اپنے تصور میں کئی بار دیکھ چکا تھا لیکن ایک بار فن تعمیر کے اس نمونے کو اپنی چشم ظاہر سے دیکھنا چاہتا تھا، جس نے اردو شاعری کو سب سے بڑا شاہکار دیا تھا۔ زمان و مکان کا وہ پس منظر جس نے ''بال جبریل'' کے صفحات میں سما کر اردو شاعری کو آسمان تک پہنچا دیا تھا خود کیا شے ہوگی۔ یہ خیال مجھے کشاں کشاں لندن سے بلجیم اور بلجیم سے فرانس کے رستے اسپین لے گیا۔

دراصل فرانس کا رخ کرنا ہی میری سب سے بڑی غلطی تھی۔ حرم مرتبت سرمین کے رستے میں اس صنم کدے نے میری منزل کھوٹی کر دی اور جب میں پیرس کے ریلوے اسٹیشن سے میڈرڈ کے لیے روانہ ہوا تو میرا دل اور جیب دونوں خالی ہو چکے تھے۔ ''درایام جوانی چندانکہ افتد دانی'' لیکن میں اس تنبیہ سے بے خبر رہا کہ:

حرم کو جانے والے راہ میں ثابتؔ قدم رہنا حرم والوں کے رستے میں صنم خانے بھی آتے ہیں

فرانس میں میرے قدم جس طرح سے لڑکھڑائے اس پر میں حیران تو نہیں ہوں لیکن پشیمان ضرور ہوں۔ ادھر شانزے لیزے تھا تو ادھر فالی برژے۔ ان سے منہ موڑا تو لڈو اور سیکسی راما نے راستہ روک لیا۔ جس طرف قدم اٹھاتا تھا یہی منزلیں سامنے آتی تھیں۔ اب اس کے سوا اور کیا کہوں کہ:

صد سالہ دورِ چرخ تھا ساغر کا ایک دور نکلے جو میکدے سے تو دنیا بدل گئی

لیکن سرتاپا اس ہوش ربا ماحول میں ملوث ہونے کے باوجود مسجد قرطبہ کی زیارت کی آرزو سے دل بیگانہ نہ ہوا اور میں پیرس سے میڈرڈ اور میڈرڈ سے قرطبہ جا پہنچا۔ قرطبہ سے میں نے مالک رام کو تار دیا کہ اس وقت صورت یہ ہے کہ روٹی کے ساتھ پیاز کے سوا اور کچھ خریدنے کی سکت نہیں ہے کہ اسپین میں کھانے کی یہی جنس سب سے ارزاں ہے۔ جوں توں کر کے قرطبہ، طلیطلہ، اشبیلیہ، مدینۃ الزہرا، غرناطہ اور مریہ وغیرہ کا سفر تو کر لوں گا اور یہاں پر میرا کوئی مستقل پتہ بھی نہیں اور یہاں سے مارسیلز کا ٹکٹ بھی میرے پاس ہے اس لیے آپ میسجریز میری ٹائمز کے پتے پر میرے لیے کچھ روپیہ مارسیلز بھیج دیجیے۔

مارسیلز پہنچتے پہنچتے میری یہ حالت ہوگئی تھی کہ ریلوے اسٹیشن سے میسجریز میری ٹائمز کے دفتر تک جو چار پانچ میل کا فاصلہ ہوگا میرے لیے پیدل جانے کے سوا اور کوئی چارہ نہ تھا۔ وہاں پہنچا تو بھوک سے جان لبوں پر آ رہی تھی۔ پہنچتے ہی اپنا نام پتہ بتایا۔ ریسپشنسٹ نے مژدہ جانفزا دیا کہ برسیلز سے مالک رام صاحب نے آپ کے لیے منی آرڈر سے روپیہ بھیجا ہے۔ مجھے اب یاد نہیں کتنا روپیہ تھا، لیکن میری ضرورت سے کہیں زیادہ تھا۔ میں نے روپیہ لیا۔ سیدھا ایک ریسٹورنٹ میں پہنچا۔ پیٹ بھر کے کھانا کھایا۔ ٹیکسی لی، اسٹیشن پر آیا۔ اپنا سامان اٹھایا اور ایک ہوٹل میں جا کر فروکش ہو گیا۔ دوسری صبح کو مجھے ہندوستان روانہ ہونا تھا۔ اس روز کئی دنوں کے بعد مجھے پیٹ بھر کے کھانا نصیب ہوا تھا۔

یہ روپیہ تو ہندوستان واپس آ کر میں نے ان کے بتائے ہوئے پتے پر پہنچا دیا لیکن اس کے بعد مالک رام صاحب سے جب کبھی میں نے اس واقعے کا ذکر کیا انہوں نے سنی ان سنی کر دی کہ شاید میں اس بیان واقعہ کے ذریعے سے شکریہ ادا کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔

ان کے قیام یورپ کا ایک اور واقعہ مجھے یاد آ رہا ہے جس کا تانا بانا ہندوستان میں بنا گیا۔ مالک رام بہ سلسلہ ملازمت جب یورپ گئے تو اپنا ذاتی ذخیرہ کتب جو ہزاروں نادر اور کم یاب کتابوں پر مشتمل تھا دوارکا داس شعلہؔ کی تحویل میں دے گئے۔ ایک دن پنڈت ہری چند اخترؔ، عرشؔ اور میرے درمیان یہ سازش ہوئی کہ اخترؔ، عرشؔ اور میں تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد مالک رام صاحب کو یورپ خط لکھیں کہ فارسی کی فلاں کتاب جس پر آپ کا نام لکھا ہے آج مجھے جامع مسجد کے ایک کباڑی کے یہاں ملی۔ معلوم نہیں وہاں کیسے پہنچ گئی۔ ہمارا خیال تھا کہ جب پانچ سات کتابوں کے بارے میں اس قسم کے دو تین خط مالک رام صاحب کو ملیں گے تو وہ پریشان ہوا ٹھیں گے اور اسی عالم میں دوارکا داس شعلہؔ کے نام خطوط کا تانتا باندھ دیکھیں گے کہ میری کتابوں کا یہ کیا حشر ہو رہا ہے۔ لیکن بدقسمتی یہ ہوئی کہ جب ہم لوگوں میں یہ سازش پک رہی تھی تو رحمت قطبی بھی وہاں موجود تھے ابھی ہم تو خط لکھنے کی سوچ رہے تھے کہ رحمت قطبی نے مجوزہ مضمون کا ایک خط مالک رام کے نام داغ دیا۔ مالک رام کی ذہانت کی داد نہیں دی جا سکتی۔ انہوں نے فوراً عرشؔ کو خط لکھا کہ آپ اخترؔ یا آزادؔ کی طرف سے اس قسم کا خط آئے تو اس کے کوئی معنی بھی ہیں، یہ رحمت قطبی کون ہے ایسے خط لکھنے والا۔

مالک رام صاحب اپنی ملازمت سے سبکدوش ہونے سے قبل برسیلز سے دہلی آ گئے تھے۔ میرا قیام بھی اس زمانے میں دہلی میں تھا۔ ان کی ریل جب بمبئی سے دہلی پہنچی تو اسٹیشن پر ان کے احباب کا ایک ہجوم استقبال کے لیے موجود تھا۔ دوارکا داس شعلہ، عرشؔ ملسیانی، راقم التحریر ہم سب اس ہجوم میں گم تھے۔ دوارکا داس شعلہؔ نے قرول باغ میں ان کے لیے پہلے ہی مکان کا انتظام کر رکھا تھا۔ مالک رام اپنے بیوی بچوں سمیت اس مکان میں فروکش ہوئے اور ان کے ساتھ میری ملاقاتوں کا از سر نو ایک سلسلہ شروع ہوا۔ میں اور والد محترم اکثر ان کے گھر جاتے تھے اور گھنٹوں وہاں بیٹھتے تھے۔ اسی طرح مالک رام بھی ہمارے یہاں آتے اور خاصی دیر تک علمی گپ چلتی۔ والد محترم کا موزوں کیا ہوا یہ سجع اسی زمانے کی یادگار ہے۔

کون مالک رام سا ہر دلعزیز ہند سے تا روم و مصر و شام ہے
مذہب و ملت کے جھگڑوں سے الگ سچ تو یہ ہے سب کا مالک رام ہے

مالک رام کے دل میں نیکی اور شرافت کا جو جذبہ موجود تھا، اس پر پوری کتاب لکھی جا سکتی ہے۔ وہ ہر ضرورت مند کی مدد کے لیے تیار رہتے تھے۔ اپنی سرکاری حیثیت میں بھی انہوں نے اپنی اس خوبی سے کتنوں کے مسائل حل کیے اور ان کے دل منھی میں کر لیے۔

میں جس زمانے میں پریس انفارمیشن بیورو میں انفارمیشن آفیسر تھا میرے عزیز دوست صاحبزادہ محمد مستحسن فاروقی ایڈیٹر پیام مشرق (ہفتہ وار) اور آستانہ، (ماہانہ) نے ایک دن دوران ملاقات میں مجھ سے کہا کہ اس سال مجھے اپنے جرائد کے لیے اتنے ٹن کاغذ کی منظوری ملی ہے، لیکن حقیقتاً کاغذ اس سے بہت کم ملا ہے اور میرے لیے 'پیام مشرق' اور 'آستانہ' کو مطلوبہ تعداد میں چھاپنا دشوار ہو گیا ہے۔ بڑی مشکل میں گرفتار ہوں، کیا کیا جائے۔ میں نے کہا میرے دوست مالک رام منسٹری آف کامرس میں افسر ہیں۔ یہ تو نہیں معلوم ان کا عہدہ کیا ہے، لیکن میں ان کے نام پرچہ لکھ دیتا ہوں، ان سے جس حد تک ہو سکے گا مدد کریں گے۔ چنانچہ وہ میرا پرچہ لے کر مالک رام صاحب کے پاس گئے۔

مالک رام صاحب نے ان کی فائل منگوائی اور ساری فائل کا اول سے آخر تک مطالعہ کرنے کے بعد ان سے کہا "غالباً آپ کو گزشتہ برس کا کاغذ بھی پوری مقدار میں نہیں ملا"۔ فاروقی صاحب صورت حال سے خاصے مایوس تھے۔ بولے ہاں یہ صحیح ہے، لیکن چھوڑیے گزشتہ برس کے کاغذ کو مجھے اس سال کا بقیہ کوٹہ مل جائے تو بڑی بات ہے۔ مالک رام صاحب نے کہا جب گزشتہ برس کے کاغذ پر آپ کا حق ہے تو آپ اسے کیوں چھوڑ رہے ہیں۔ میں کوشش کروں گا کہ آپ کو گزشتہ برس کا کاغذ بھی مل جائے۔ چنانچہ مالک رام صاحب نے اس فائل پر جو نوٹ لکھے ان کے نتیجے کے طور پر مستحسن فاروقی کو سال رواں کے بقیہ کاغذ کے ساتھ گزشتہ برس کا بقیہ کوٹا بھی مل گیا۔ فاروقی صاحب کو جب اس بات کی منظوری کا کاغذ پہنچا اور ساتھ ہی وہ پروانہ بھی جس کی بنا پر وہ کاغذ کا پورا کوٹا حاصل کر سکتے تھے، تو بہت خوش ہوئے اور اسی خوشی کے عالم میں انہوں نے میرے دفتر کا رخ کیا۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی انہوں نے بے اختیار انداز میں کہا "یار جگن ناتھ! مالک رام تو تم سے بھی زیادہ اچھا آدمی ہے"۔ کمرے میں چند اور احباب بھی موجود تھے۔ اس جملے پر سب نے ایک قہقہہ لگایا اور جب میں نے اس جملے کی تشریح پوچھی تو فاروقی صاحب نے سارا واقعہ اول سے آخر تک کہہ سنایا کہ میرے کاغذ والے معاملے کی ڈوبی ہوئی کشتی مالک رام کی توجہ سے ابھر آئی ہے۔ ساتھ ہی فاروقی صاحب نے یہ بھی کہا کہ اس زحمت کے لیے جب میں ان کا شکریہ ادا کرنے گیا تو وہ بولے اس میں شکریے کی کیا بات ہے۔ اپنا دفتری کام تن دہی سے کرنا تو ہم لوگوں کے فرائض میں داخل ہے۔

مالک رام مزاجاً جلوت پسند بھی تھے اور خلوت پسند بھی۔ علمی اور تحقیقی کام ان کا اوڑھنا بچھونا تھا اور ظاہر ہے کہ ان کا یہ کام تنہائی اور گوشہ نشینی ہی میں سرانجام پاتا تھا۔ اس چھوٹے سے مقالے میں ان کی تحقیقی اور علمی کاموں کا جائزہ لینا مقصود نہیں۔ اس موضوع پر عرش ملسیانی ایک سیر حاصل مقالہ لکھ چکے ہیں۔ میں تو صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ کبھی کبھار جب آپ اس گوشہ تنہائی سے فراغت پانا چاہتے تھے تو اپنے گھر ہی پر دوستوں کی محفل سجا لیتے تھے۔ کبھی چائے پر کبھی کھانے پر، کبھی یہ محفل بزم مذاکرہ ہوتی تھی اور کبھی بزم مشاعرہ اور اس کے بعد آپ پھر علمی مراقبے میں چلے جاتے تھے اور وقار انبالوی کے اس مصرعے کی تفسیر بن جاتے تھے۔

رات، تنہائی، قلم، کاغذ، وقار

یہی قلم اور کاغذ ہی ان کی متاع گراں بہا رہی جس کی بدولت علم کے خزانوں میں انہوں نے اضافہ کیا۔ دور دور تک ان کا نام پہنچا اور ان کی عظمت کا ڈنکا بجا۔ مولانا عبدالماجد دریابادی نے ان کی کتاب پر ایک بار تبصرہ کرتے ہوئے لکھا کہ مصنف کا علم حدیث تبصرہ نگار سے کہیں زیادہ ہے۔ ابھی کچھ مدت قبل جب اقبال عالمی کانگرس میں شرکت کے لیے میں لاہور گیا تو نہ جانے کتنے لوگوں نے مالک رام صاحب کے کانگریس میں شریک نہ ہونے کی وجہ پوچھی۔ میں نے شروع میں غلطی سے سچ کہہ دیا کہ ڈاکٹر نے آنے کی اجازت نہیں دی۔ بس پھر کیا تھا۔ پاکستان کے ایک ایک ادیب نے میرے کمرے کا رخ کیا اور مجھ سے ان کی خیریت پوچھی میں بتاتے بتاتے تھک گیا کہ بھئی خدا کے فضل سے بخیریت ہیں۔ تشویش کی کوئی بات نہیں۔ ڈاکٹر نے صرف اس بنا پر شرکت کی اجازت نہیں دی کہ اس موقعے پر بڑی بڑی دعوتیں ہوں گی، صبح سے شام تک اجلاس جاری رہیں گے ان دعوتوں اور تھکن سے بچنے کا واحد راستہ یہی ہے کہ لاہور کا رخ ہی نہ کیا جائے۔

لیکن جب ڈاکٹر محمد باقر، ڈاکٹر فرمان فتح پوری، جسٹس رحمٰن، ڈاکٹر جاوید اقبال، خواجہ عبدالوحید، صوفی غلام مصطفیٰ تبسم، ڈاکٹر سید عبداللہ، ڈاکٹر وحید قریشی، ڈاکٹر عبادت بریلوی، ڈاکٹر معزالدین، محمد طفیل، پروفیسر محمد عثمان، ابوالخیر کشفی،

عبدالسلام خورشید اور ان کے علاوہ متعدد پاکستانی ادیبوں نے ان کی خیریت پوچھی تو مجھے بڑی چڑ ہوئی کہ یہ کیا معاملہ ہے۔ میں تو خود بزعم خویش اس کانگرس میں ہیرو بنا پھرتا ہوں، مجھ سے زیادہ مقبولیت تو پاکستان میں ان حضرت کو حاصل ہے جو کانگرس میں شریک ہی نہیں ہوئے۔

لیکن مالک رام اپنی اس علمی شان وشوکت سے قطعاً بے خبر اور بے تعلق رہے۔ وہ اپنے کام میں اتنے مگن تھے کہ تعریف سے بھی بے نیاز رہے اور مذمت سے بھی بے نیاز۔ انہوں نے جو بھی کام کیا اسے ایک معیاری درجہ حاصل رہا۔ آج تو ان کی حیثیت مسلمہ طور پر ایک بین الاقوامی اہل قلم کی ہے۔ ۳۳ء میں جب ان کے نام سے بہت کم لوگ آشنا تھے انہوں نے ڈاکٹر نکلسن کے اس مقالے کا اردو میں ترجمہ کیا جو نکلسن نے ''اسرار خودی'' کے متعلق لکھا تھا۔ ترجمے کے ساتھ مالک رام نے اسے حواشی سے بھی مزین کیا۔ یہ حواشی سمیت ترجمہ ''نیرنگ خیال'' کے اقبال نمبر میں شائع ہوا اور جب یہ ترجمہ علامہ اقبال کی نظر سے گزرا تو انہوں نے اسے اس قدر پسند کیا کہ انہوں نے مترجم کو دیکھنے کی خواہش کا اظہار کیا اور اقبال کی یہ خواہش مالک رام کی اقبال کے ساتھ پہلی ملاقات کا سبب بنی۔

مالک رام کا خاص موضوع غالب ہے۔ اقبال پر انہوں نے زیادہ نہیں لکھا لیکن اقبال کے متعلق جب بھی میری ان کے ساتھ گفتگو ہوئی ہے میں نے انہیں بحر اقبالیات کا شناور پایا ہے۔ انہوں نے اقبالیات کے تعلق سے کئی موقعوں پر میری مشکلات کو آسان کیا۔ شروع میں جب کہ اقبال کی از سر نو دریافت کے ساتھ ہندوستان میں اقبال شکنی کی مہم بھی شروع ہوئی، صحیح اقبال شناسی کا کام مالک رام کے قلم کا منتظر رہا۔ شاید اسی خیال کے تحت جب میں نے اپنی کتاب ''اقبال اور کشمیر'' کا انتساب مالک رام صاحب کے نام نامی سے کیا تو اقبال کا یہ شعر بے ساختہ میرے احساس میں چمکا اور میں نے اسے انتساب کے ساتھ ہی عنوان داستان بنایا۔

بیا کہ دامن اقبال را بدست آریم
کہ او زخرقہ فروشان خانقاہے نیست

# مولانا روحی

## (ایک نادیدہ شخصیت کا خاکہ)

ڈاکٹر خورشید رضوی

انسانی ذہن خوگرِ پیکرِ محسوس ہے۔ چنانچہ جن شخصیات کو کبھی دیکھا نہیں ہوتا ان کے بارے میں صرف سن کر یا پڑھ کر ان کے قد وقامت اور خط وخال کی بھی ایک فرضی تصویر ضرور بنا لیتا ہے۔ میرے ذہن میں ایک ایسی ہی تصویر مولانا اصغر علی روحی کی ہے۔ ۱۹۵۵ء میں جب میں دسویں جماعت کا امتحان پاس کر کے گورنمنٹ کالج منٹگمری (اب ساہیوال) میں داخل ہوا اور مجھے مولانا روحی کے فرزند اور علمی جانشین ڈاکٹر صوفی محمد ضیاء الحق مرحوم کی شاگردی کا شرف حاصل ہوا تو مولانا روحی کو انتقال فرمائے ایک سال ہو چکا تھا۔ ڈاکٹر صوفی محمد ضیاء الحق صاحب سے عربی پڑھتے ہوئے گاہے گاہے مولانا کا ذکر بھی سنتا رہا۔ اگرچہ کبھی ان کے چہرے مہرے یا شکل صورت پر گفتگو نہ ہوتی تھی، اس کے باوجود ایک دبلے لمبے، گورے چٹے، سفید ریش بزرگ کا نورانی چہرہ ذہن پر مرتسم ہوتا چلا گیا اور آج تک مرتسم ہے۔ مجھے یہ چہرہ بہت عزیز ہے حالانکہ میں خوب جانتا ہوں کہ یہ محض ایک فرضی تصویر ہے۔ بہت بعد کے زمانے میں جب ڈاکٹر صوفی صاحب سے میری بے تکلفی بڑھ گئی تو ایک بار ان سے مولانا کے خط وخال پر بات ہوئی۔ انہوں نے فرمایا کہ حافظ عبدالحق صاحب ------ ڈاکٹر صوفی صاحب کے برادر بزرگ ----- میں ان کی شباہت باقی سب بھائیوں سے بڑھ کر ہے۔ اسی طرح ایک بار غالباً علامہ عبدالعزیز میمن صاحب سے یہ سنا کہ مولانا روحی کو سائنس کے تجربات سے بھی شغف تھا اور کالج کی لیبارٹری میں کسی تجربے کے دوران ان کی ایک آنکھ متاثر ہو گئی تھی۔ ان حقائق نے میری لوحِ ذہن پر بنی ہوئی تصویر میں کچھ تبدیلیاں کرنا چاہیں لیکن وہی پرانی تصویر، پس منظر سے نکل کر پھر میرے ذہن پر حاوی ہو جاتی ہے۔ میں نے ڈاکٹر صوفی صاحب سے ایک بار یہ بھی پوچھا کہ مولانا کا کوئی فوٹو گراف بھی کہیں محفوظ ہے یا نہیں؟ معلوم ہوا کہ زبردست تدین کے سبب وہ فوٹو کھچوانا گوارا نہیں فرماتے تھے۔ ایک بار ایک عقیدت مند نے چوری چھپے ایک تصویر لے لی تھی جو صاف نہیں آ سکی۔ یہ تصویر بھی دیکھنے کا مجھے موقع نہیں ملا۔ چارلس لیمب نے کچھ ایسی بات کہی تھی کہ میں شیکسپیئر کے ڈرامے پڑھنا تو چاہتا ہوں لیکن اس کے کرداروں کو سٹیج پر دیکھنا نہیں چاہتا کیونکہ وہاں وہ میرے آزاد تخیل سے مختلف ہو جائیں گے۔ میں بھی مطمئن ہوں کہ مولانا روحی کی جو تصویر میرے آزاد تخیل نے بنائی تھی وہ حقائق کی دست برد سے محفوظ، آج تک میرے نہاں خانہ دل میں موجود ہے۔

یہ نفسیات کا ایک گہرا مسئلہ ہے کہ اس طرح کی فرضی تصویر بنانے میں ذہنِ انسانی کن عناصر سے متاثر ہوتا ہے اور اس کا تفصیلی جواب بہت دشوار ہے۔ لیکن میرا خیال ہے کہ کسی شخصیت کے نام اور اس کی سیرت وکردار کے بارے میں انسان کی شنید

اس تصویر کے لیے آب ورنگ مہیا کرتی ہے۔ مولانا روحی کے نام میں روحانیت کا اثر اور ان کے بارے میں وقتاً فوقتاً ڈاکٹر صوفی صاحب سے سنی ہوئی باتوں کا تاثر، شاید دونوں نے مل کر میرے ذہن میں اس تصویر کے نقش ابھارے۔

مولانا کی دینی حمیت کے بعض دل چسپ واقعات میں نے صوفی صاحب سے سنے۔ مثلاً یہ کہ جب مشہور مستشرق مارگولیتھ لاہور آیا اور اسلامیہ کالج بھی گیا تو مولانا روحی نے، جو بالعموم کرسی پر بیٹھ کر پڑھانے کے عادی تھے، اس روز ابتدا ہی سے کھڑے ہو کر لیکچر دینا شروع کیا تا کہ مارگولیتھ کی آمد پر ان کو اٹھنا نہ پڑے۔ اس کا سبب غالباً اسلام کے خلاف مارگولیتھ کا معروف تعصب تھا جس کا ذکر علامہ شبلی نے بھی سیرۃ النبی میں کیا ہے۔ مارگولیتھ کی آمد پر مولانا نے ڈائس کے اوپر ہی سے کھڑے کھڑے ہاتھ ملا لیا جبکہ مارگولیتھ اور لاہور کے کئی سرکردہ لوگ جن میں، سر شفیع بھی شامل تھے، نیچے کھڑے رہے۔ سر شفیع نے مولانا کو ڈائس سے اتارنے کے لیے چپکے سے ان کا دامن بھی کھینچا لیکن مولانا روحی نے سختی سے چھڑا لیا۔ اس بات کو سر شفیع نے سخت ناپسند کیا اور پرنسپل صاحب سے شکایت کی۔ جب پرنسپل نے بعد میں مولانا سے دریافت کیا کہ کیا یہ شکایت درست ہے تو انہوں نے اپنی روایتی صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے فرمایا "جی ہاں! اور مزید یہ کہ جو ہاتھ میں نے مارگولیتھ سے ملایا تھا اسی وقت جا کر دھویا تھا"۔ اُس دور میں پرنسپل سے ایسی بات کہنے کی جرأت کسی کو نہ ہوتی تھی لیکن مولانا کی بات اور تھی خود پرنسپل صاحب ان کے علم وفضل کے مداح ومعترف تھے اور جب کبھی مولانا کی اس نوعیت کی کسی سختی یا "عدم تعاون" کی شکایت کی جاتی تو وہ کہتے:

**" But he is a true scholar "**

مولانا کی صاف گوئی اور بے باکی کے پیچھے وہ مضبوط کردار اور بے داغ سیرت تھی جس کا دبدبہ بڑے بڑوں کو زیر کر لیتا ہے۔ یاد پڑتا ہے کہ ایک بار صوفی صاحب نے کچھ ایسا واقعہ سنایا کہ انگریز کی حکومت کو ایک بار کسی فتوے پر اصرار تھا (شاید ترکوں کے خلاف جنگ کے جواز کے لیے) اور لاہور کے علماء بہت پریشان تھے۔ بالآخر سب نے یہ موقف اختیار کیا کہ اگر مولانا روحی فتوے پر دستخط کر دیں تو سب دستخط کر دیں گے، کیونکہ مولانا کو ان کے ضمیر کے خلاف جھکانا ممکن نہ تھا۔

صوفی صاحب سنایا کرتے تھے کہ مولانا کو انگریز اور انگریزی تہذیب سے دلی نفرت تھی۔ وہ کبھی انگریزی لباس نہیں پہنتے تھے اور فرمایا کرتے تھے کہ اللہ تعالیٰ کے سامنے جس امر کی جواب دہی کا مجھے سخت خوف ہے وہ میرے بیٹوں کی وضع قطع ہے کہ یہ داڑھیاں منڈوا رہے ہیں اور انگریزی لباس پہنتے ہیں۔ مولانا دیسی جوتا اور دیسی کپڑے پہنتے۔ کرتا پرانی وضع کا جس کا گریبان سینے کے وسط میں نہیں بلکہ بائیں جانب دل کے مقام پر ہوتا تھا اور بٹن کندھے پر لگایا جاتا تھا۔ وہی جس کے بارے میں سائل دہلوی کہتے ہیں:

کیوں جل نہ جائیں دونوں گریباں کے سامنے　　کمبخت آ گیا دل سوزاں کے سامنے

مولانا انگریزی صابن تک استعمال نہیں کرتے تھے۔ انگریزی دوا نہیں کھاتے تھے۔ فرماتے تھے کہ ہر انگریزی دوا میں شراب (الکوحل) کی کچھ نہ کچھ آمیزش ضرور ہوتی ہے۔

یہاں ایک دلچسپ اور غیر معمولی واقعہ یاد آتا ہے۔ ڈاکٹر صوفی صاحب نے پی ایچ ڈی کے لیے ابن قتیبہ کی "کتاب المعارف" پر مقالہ پیش کیا تو ممتحن کوئی انگریز مستشرق تھے جنہوں نے ان کو زبانی امتحان کے لیے لندن طلب کیا۔ مولانا روحی کو یہ بات بالکل پسند نہ آئی اور سفر کی اجازت دینے سے انکار کر دیا۔ ڈاکٹر صوفی صاحب (جن کی اس وقت کی ظاہری وضع قطع کو مولانا روحی اندیشۂ آخرت تصور فرماتے تھے) والد کے اس قدر فرماں بردار تھے کہ انہوں نے اجازت کے بغیر سفر کا ارادہ ترک کر دیا۔

آخر کچھ خیر خواہوں نے مولانا سے مذاکرات کیے کہ آپ کے بیٹے کی سال ہا سال کی محنت شاقہ کا سوال ہے کچھ خیال کیجیے۔ بہت مشکل سے مولانا کے موقف میں کچھ نرمی آئی اور انہوں نے کہا اچھا میری کچھ شرطیں ہیں اگر ان کو پورا کر سکتا ہے تو چلا جائے۔ وہ یہ ہیں کہ (اس وقت کے مروجہ طریقے مطابق) پانی کے جہاز سے نہ جائے بلکہ ہوائی جہاز سے سفر اختیار کرے اور عین اس وقت کی پرواز ہو جو انٹرویو کے وقت کے قریب قریب لندن پہنچائے اور انٹرویو کے بعد فی الفور اولین ممکنہ پرواز سے واپسی ہو جائے۔ کہیں سیر وتفریح کے لیے نہ جائے۔ اپنا کھانا یہیں سے باندھ کر لے جائے اور دیار فرنگ سے لے کر نہ کچھ کھائے نہ پیے۔ صوفی صاحب بتاتے تھے میں نے ان شرائط کو غنیمت جانا، چنانچہ کراچی سے کچھ توس وغیرہ لے کر ٹفن کیریئر میں بند کر لیے اور والد صاحب کے حکم کے مطابق ایسے وقت میں لندن پہنچا کہ ہوائی اڈے سے سیدھا ممتحن کے پاس چلا گیا۔ انٹرویو کے دوران پیاس محسوس ہوئی تو ایک گلاس پانی پینا پڑا جس کا آج تک افسوس ہے۔ ممتحن انٹرویو سے بہت مطمئن تھا۔ پوچھا کہ لندن میں کب تک قیام ہے؟ جب میں نے بتایا کہ آئندہ پرواز سے اسی وقت واپسی ہے تو اسے سخت حیرت ہوئی۔ ایک گھنٹے کے لگ بھگ، وقت کی گنجائش میرے پاس تھی ممتحن نے پوچھا کہ یہ وقت میں کہاں بسر کرنا چاہوں گا۔ میں نے کہا برٹش میوزیم لائبریری میں۔ چنانچہ وہاں پہنچا دیا گیا اور تھوڑا سا وقت وہاں گزار کر واپس چلا آیا۔

پیدا کہاں ہیں ایسے پراگندہ طبع لوگ　　افسوس تم کو میرؔ سے صحبت نہیں رہی

ڈاکٹر صوفی صاحب اپنے والد محترم کو اپنا پیر ومرشد بھی تصور کرتے تھے اور فرماتے تھے کہ حقیقی معنوں میں میرے استاد بھی صرف وہی تھے۔ ان کو مولانا سے جو مضبوط روحانی تعلق تھا اس کی ایک تعجب خیز مثال مجھے یاد آ رہی ہے۔ ایم اے کے طالب علم کی حیثیت سے میرا قیام دولنر ہاسٹل میں تھا اور صوفی صاحب ازرہ شفقت گاہے گاہے میرے کمرے میں تشریف لایا کرتے تھے۔ ایک روز آئے تو میں نے محمد الخضری بک کی "محاضرات فی تاریخ الامم الاسلامیہ" میں درپیش دو ایک اشکال ان کے سامنے رکھے۔ مقام وہ تھا جہاں قریش کی طرف سے خانہ کعبہ کی تعمیر نو کے سلسلے میں خرچ کے کم پڑ جانے کا ذکر آتا ہے۔ اس رقم کے لیے وہاں "النفقۃ الطیبۃ" کے الفاظ درج تھے۔ میری سمجھ میں نہ آ سکا کہ "طیبۃ" کا یہاں کیا تعلق ہو سکتا ہے۔ پھر یہ ذکر تھا کہ یہ رقم کم پڑ جانے پر قریش نے عمارت کو شمالی جانب سے ذرا لمبا کر لیا اس ضمن میں "نحوا من ستۃ اذرع" کے الفاظ درج تھے۔ یہ لفظ "آمن" بھی معمہ بنا ہوا تھا۔ اتفاق کی بات کہ صوفی صاحب کا ذہن بھی منتقل نہ ہوا۔ اس روز وہ اٹھ کر چلے گئے۔ اگلے روز جب ملاقات ہوئی تو فرمانے لگے کہ تمہاری وہ عبارت حل ہو گئی ہے اور بڑے عجیب طریقے سے۔ تفصیل یہ بتائی کہ رات میں نے خواب میں دیکھا کہ یہی کتاب ہاتھ میں لیے غور کر رہا ہوں کہ والد مرحوم تشریف لاتے ہیں۔ مجھ سے پوچھا کیا پڑھ رہے ہو؟ میں نے عرض کیا کہ ان دو لفظوں کا مفہوم واضح نہیں ہو رہا۔ اس پر انہوں نے کتاب لے کر ایک نظر ڈالی اور پھر ہنس کر فرمایا "ڈاکٹر مفت میں بن بیٹھے ہو" (اصل الفاظ پنجابی میں تھے "ڈاکٹر یویں ای بن گیا ایں) پھر وضاحت فرمائی کہ دونوں جگہ چھاپے کی غلطی ہے۔ "النفقۃ الطیبۃ" نہیں "النفقۃ الطیبۃ" ہے یعنی پاک صاف مال جو قریش نے تعمیر کعبہ کے لیے جمع کیا تھا اور دوسری جگہ "نحوا من ستۃ اذرع" ہے یعنی تقریباً چھ ہاتھ کم کر دیا۔ غلطی سے "نحوا" کی تنوین الف پر مد کی علامت بن گئی ہے۔ دونوں جواب اس قدر واضح تھے کہ نہ صرف یہ کہ شک کی گنجائش نہ تھی بلکہ حیرت تھی کہ اس سے پہلے ذہن اس طرف منتقل کیوں نہ ہوا۔ خواب میں اس طرح ان کے حل ہو جانے پر مجھے بہت تعجب ہوا۔ صوفی صاحب نے بتایا کہ والد مرحوم سے میرے تلمذ کا سلسلہ منقطع نہیں ہوا اور اب بھی اسی طرح گاہے گاہے وہ خواب میں میری علمی رہنمائی فرما دیتے ہیں۔

ڈاکٹر صوفی صاحب بعض ایسے علوم میں بھی دستگاہ رکھتے تھے جو آج کی اصطلاح میں **occult** کہلاتے ہیں۔ مثلاً نجوم، رمل جفر وغیرہ۔ لیکن انہوں نے یہ علم محض ادب کو سمجھنے اور ذاتی تجسس کی تشفی کے لیے سیکھے تھے۔ نہ کبھی ان سے مادی فائدہ اٹھایا نہ ان پر اندھا اعتقاد رکھا۔ اور رفتہ رفتہ عملاً ان سے دست کش ہی ہو گئے۔ ان کے روحانی مشاغل کیا کیا تھے میرے علم میں نہیں نہ مجھے غیر ضروری سوال کرنے کی عادت تھی۔ میں ان سے عربی پڑھنے جاتا تھا اور بس اپنے کام سے کام رکھتا تھا۔ البتہ از خود کوئی ذکر چھیڑ دیتے تو میں دلچسپی سے سنتا تھا۔ ایک روز اپنے برادر بزرگ جناب فضل حق مرحوم کے ہاں تشریف لے جارہے تھے کہ راستے میں ذکر فرمایا کہ انہیں اور فضل حق صاحب کو روحوں سے رابطے کے ایک عمل کی اجازت حاصل ہے اور دونوں مل کر گاہے گاہے مولانا روحی سے ضروری معاملات میں رہنمائی حاصل کر لیتے ہیں اور اس طریقے سے بعض اشیاء کی نشان دہی ہوئی جو درست ثابت ہوئی۔ انہوں نے بتایا کہ مولانا روحی کی طبیعت میں جو ظرافت تھی وہ ان کی روح سے رابطے کے دوران بھی ظاہر ہوتی ہے۔ مثلاً ایک بار جب ہم نے پوچھا کہ آج کل آپ کی خوراک کیا ہے؟ تو جواب ملا ''دودھ'' اور پھر ذرا سے وقفے کے بعد اضافہ کیا گیا ''چائے یہاں نہیں ملتی''۔ اسی طرح ایک بار جس کمرے میں یہ عمل جاری تھا، فضل حق صاحب کی چھوٹی بچی، جس کا عرف غالباً ''پوپی'' بتایا، اندر آنے پر مصر تھی اور اسے زبردستی باہر دھکیل کر دروازہ بند کیا جارہا تھا کہ روح کی طرف سے یہ جملہ وصول ہوا ''پوپی کو اندر آنے دو''۔

صوفی صاحب، حضرت میاں شیر محمد صاحب (شرقپور شریف) سے مولانا روحی کی دلی عقیدت کا بھی ذکر فرمایا کرتے تھے۔ غالباً ایک بار یہ بھی ذکر کیا کہ ایک موقع پر مولانا علالت کے دوران حضرت میاں صاحبؒ کو یاد کر رہے تھے کہ میاں صاحبؒ ''بنفس نفیس مزاج پرسی کے لیے تشریف لے آئے جو دونوں کے مابین قوی روحانی تعلق کی دلیل ہے۔

مولانا روحی کی ظرافت کی طرف ابھی اشارہ ہوا۔ اس کی ایک صورت وہ عربی آمیز اردو تھی جسے بعض لوگ ان کا عمومی انداز تخاطب خیال کرنے لگے ہیں۔ مثلاً جس مکان میں بجلی اور نلکا موجود ہو اسے ''مجلل'' اور ''منلک'' کہنا۔ یاد آتا ہے کہ ایک روز صوفی صاحب نے سنایا کہ دوپہر کو جب قیلولے کے لیے لیٹتے تو پنڈلیاں دبوانا پسند تھا۔ اس وقت فرماتے ''نتف الشعر'' کرو'' یعنی بالوں کو آہستہ آہستہ کھینچو۔

مولانا روحی ایک باعمل عالمِ دین ہونے کے ساتھ ساتھ ایک خوش کلام شاعر بھی تھے۔ انہوں نے بیشتر شاعری فارسی زبان میں کی جس پر انہیں، عربی کی طرح، زبردست عبور حاصل تھا۔ ان کے دو شعر جو صوفی صاحب کی زبانی کئی بار سنے میرے دل پر بہت اثر کیا کرتے تھے۔

بہشتِ استخوانم خار خار است          شرارے پنبہ زارم را بکاراست
مرا در زیرِ گِل خفتہ مپندار          کہ تو در خوابی و من خفتہ بیدار

ایک بار جب صوفی صاحب مجھے اپنے ہمراہ کنھالہ لے گئے تو مولانا روحی کے مزار پر بھی حاضری دی اور غالباً اس وقت بھی یہ شعر یاد کیے گئے اور بعد کو ان کی لوح مزار کی عبارت میں بھی شامل ہوئے۔

تاریخ گوئی کے فن پر بھی مولانا کو عبور حاصل تھا جس کی کئی مثالیں ان کے عربی دیوان میں بھی موجود ہیں۔ بھاٹی دروازے کے اندر اکثر تنگ گلیوں سے گزر کر صوفی صاحب کے پاس حاضر ہونے کا موقع ملتا۔ بالکل ساتھ ہی وہ مسجد تھی جس میں مولانا روحی نے زندگی کے آخری سالوں میں بہت وقت گزارا۔ مسجد کے ماتھے پر ان کے کہے ہوئے تین شعر کندہ تھے جن میں مسجد کی تعمیر کا مادۂ تاریخ نظم کیا گیا تھا۔ آج حافظے کی آنکھ سے دیکھتا ہوں تو مٹے مٹے سے یہ شعر ٹھہر ٹھہر کر واضح ہوتے ہیں۔ کوئی مصرع واضح ہے کوئی دھندلا:

بناشد چو ایں مسجد خوش اساس          پئے اہل ایمان بفضل الٰہ
صفوف ملائک پس و پیش ہیں          بسجدہ نہادہ بخاکش جباہ
چو پرسیدم از ہاتفے سال او          بگفتا ''عجب منظر سجدہ گاہ''

''عجب منظرِ سجدہ گاہ'' کے الفاظ سے ۱۳۶۳ھ برآمد ہوتا ہے جو ۱۹۴۳ء-۱۹۴۴ء کے مطابق ہے اور اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ مسجد مولانا کی وفات سے کوئی دس برس پیشتر تعمیر ہوئی۔

اندرون بھاٹی دروازہ کے اسی پرانی وضع کے مکان میں کبھی کبھار جوش کے عالم میں صوفی صاحب یہ بھی فرما دیتے تھے کہ یہ جو اس دروازے کے باہر گندی نالی بہہ رہی ہے اس پر میں نے اپنے والد سے ملنے کے لیے بڑے بڑوں کو کھڑے دیکھا ہے۔ ان لوگوں میں علامہ اقبال بھی شامل تھے۔ علامہ کے بعض خطوط میں بھی مولانا اصغر علی روحی کا ذکر ملتا ہے۔

مولانا روحی نے عربی ادب کی تعلیم شیخ اجل مولانا فیض الحسن سہارنپوری سے پائی تھی جو سرسید اور علامہ شبلی کے بھی استاد ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر لائٹنر کے کہنے پر کس طرح اور کن شرائط پر مولانا فیض الحسن پنجاب آئے اور اورینٹل کالج میں عربی کے صدر مدرس ہوئے اس داستان کو میں نہایت دلچسپ ہونے کے باوجود چھوڑتا ہوں۔ ہاں اتنا عرض کردوں کہ آج پنجاب میں جو کوئی بھی عربی ادب کا طالب علم ہے اس کا شجرۂ علمی ضرور مولانا فیض الحسن سے ملتا ہے۔

ایسے فاضل استاد کی تربیت سے مولانا روحی کا جوہر خداداد چمک اٹھا اور انہیں عربی زبان و ادب پر بے مثل قدرت حاصل ہوگئی۔ میں نے ان کے علم و فضل کا اعتراف علامہ عبدالعزیز میمن جیسے نابغۂ روزگار کی زبانی بھی سنا۔ صوفی صاحب بتایا کرتے تھے کہ طرمّاح جیسے مشکل گو شاعر کا کلام مولانا نے رانا بہاء الحق صاحب (صوفی صاحب کے چھوٹے بھائی) کو آخری عمر میں، جب کہ بینائی بھی جواب دے چکی تھی، کسی خاص تیاری کے بغیر پڑھا دیا۔

مولانا روحی کی عربیت کا منہ بولتا ثبوت ان کا عربی دیوان ہے جس کی تحقیق متن ڈاکٹر محمد ذوالفقار علی رانا اور خوبصورت اشاعت اور فاضلانہ مقدمہ تحریر کرنے پر ڈاکٹر ظہور احمد اظہر ہمارے شکریے اور مبارکباد کے مستحق ہیں۔

دیوان کا آغاز جس نعتیہ ہمزیہ سے ہوتا ہے اس کا تیسرا شعر مجھے پھر یادِ ماضی کی خوشگوار فضاؤں میں لے جاتا ہے۔ یہ شعر میں نے صوفی صاحب کی زبانی کئی بار سنا۔

کبرقِ خُلّب وعد و وصل          کریح قُلّب حسن وماء

اس کا ذکر شاید اسی لیے ہوا ہو کہ اس میں عربی زبان کے دو جامع کلمات ''خُلّب'' اور ''قُلّب'' استعمال ہوئے ہیں۔ مادہ (خ ل ب) میں دلربائی کے علاوہ فریب کاری کا مفہوم بھی پایا جاتا ہے۔ چنانچہ ''برق خُلّب'' وہ بجلی ہوتی ہے جو چمک چمک کر یہ امید دلاتی ہے کہ بارش آنے والی ہے لیکن دیکھنے والوں کی پیاس بھڑکا کر بارش برسائے بغیر ہی روپوش ہو جاتی ہے۔ اسی طرح مادہ (ق ل ب) میں پلٹ دینے یا پلٹا کھا جانے کا مفہوم ہے۔ ''قلب'' دل کے معنوں میں بھی اسی لیے ہے کہ وہ خود بھی پلٹے کھاتا رہتا ہے اور اس میں پیدا ہونے والے خیالات و احساسات بھی ہر لحظہ متغیر رہتے ہیں:

ما سُمّی القلب إلا من تقلّبه          والرأی یصرف بالانسان أطوارا

''انقلاب'' بھی اس لیے ''انقلاب'' ہے کہ اس میں سارا نظام پلٹا کھا جاتا ہے۔ چنانچہ ''رخ قلب'' سے مراد وہ ہوا ہوئی جو مسلسل اپنی سمت بدلتی رہے۔ خیال پیدا ہو کہ مناسب سمت سے آ رہی ہے، سازگار ثابت ہوگی لیکن فی الفور رخ بدل کر ناسازگار بن جائے۔ سو تشبیب کے اس شعر میں روایتی محبوب کے وعدۂ فردا اور جلوۂ بے فیض کے لیے ''برق خلب'' اور ''رخ قلب'' کی تراکیب لانا لفظی و معنوی ہر دو اعتبار سے انتہائی بلیغ ہے اور شعر کے آہنگ میں ایک پرزور اضافے کا باعث۔ اور کیوں نہ ہو ''دیر نجم'' کے مصنف سے یہی توقع کی جا سکتی ہے۔

پاک و ہند کی عربی شاعری کی عام روایت کے مطابق مولانا روحی کے کلام پر بھی کلاسیکی عربی شاعری کی چھاپ نظر آتی ہے لیکن جیسا کہ ڈاکٹر ظہور اظہر صاحب نے اپنے عربی پیش لفظ میں فرمایا ہے ہر چند کہ مولانا نے برصغیر کی عربی شاعری کے ساز میں کسی نئے تار کا اضافہ نہیں کیا تاہم انہوں نے قدیم الفاظ سے جدید مفاہیم پیدا کیے اور یہاں کی عربی شاعری کے سرمائے میں قیمتی اضافہ کیا جس میں لفظ و معنی کی اصالت برقرار رہی۔ واقعی ان کے کلام میں اسلوب کی شوکت، مضامین کی پختگی، زبان کا شکوہ اور بندش کی چستی قدماء کی یاد تازہ کرتی ہے۔ مثلاً

اذا ما اراد المرء فوزا ببغية  فليس له بدّ من المسلك الوعر
سقتنا صروف الدهر كأسا من النوى  شربنا و إن كانت أمرّ من الصبر
هذّب لسانك ما استطعت فانه  لا ينطق المرء الحليم بفاحش

جہاں تک مولانا کے مضامین شعری کا تعلق ہے سو ڈاکٹر ظہور اظہر صاحب نے ان کا استقصاء کر کے مقدمہ دیوان میں وضاحت کر دی ہے کہ یہ مضامین بیشتر نعت، دفاع ناموس رسالت، بیان شان قرآن، عیسائی مبلغین کے رد، بعض ہنگامی مناسبتوں سے کہے گئے اشعار، چند مرثیوں، کچھ وعظ و نصیحت، غزلیہ اشعار اور منظر نگاری پر مشتمل ہیں۔

# جیلانی کامران۔ ایک تہذیبی نقاد!

ڈاکٹر سلیم اختر

ایک شخص ہمارے ساتھ ہوتا ہے ہم اس کے گھر جاتے ہیں اس کے ساتھ چائے پیتے، گپ شپ کرتے، ادیبوں اور کتابوں پر رائے زنی کرتے ہیں۔ اس سے بحث مباحثہ بھی ہوتا ہے اور اختلاف رائے بھی لیکن اس کے باوجود ہم اسے سرسری طور پر لیتے ہیں اس لیے کہ اس کا وجود، ذات و صفات، شخصیت اور تخلیقی شخصیت ہمارے معمولات کا حصہ ہوتی ہے لیکن جیسے ہی موت اسے ہم سے دور لے جاتی ہے اسے دیکھنے، سمجھنے اور پرکھنے کا زاویہ نگاہ بھی تبدیل ہو جاتا ہے۔ موت کا تناظر زندگی میں بہ انداز تو رنگ آمیزی کرتا ہے۔

پروفیسر جیلانی کامران سے میرے دوستانہ مراسم عرصہ تیس برس پر محیط ہیں۔ ہم دونوں گورنمنٹ کالج میں رفیق کار بھی رہے اگرچہ میری ان سے اس انداز کی بے تکلفی نہ تھی جس میں ہاتھوں پر ہاتھ مار کر لطیفہ گوئی ہوتی ہے اس لیے کہ وہ اس مزاج کے انسان نہ تھے۔ جیلانی کامران طبعاً مرنجان مرنج تھے اسی لیے ان کی ذات متنازعہ نہ بنی۔ حصول شہرت کے لیے نہ تو انہوں نے ادبی ''کن ٹٹوں'' کا اکھاڑا لگایا اور نہ ہی خود کسی ادبی وڈیرے کے ادبی مزارع بنے لیکن اس کے باوجود اپنے نظریات و تصورات کے برملا اظہار میں کبھی جھجک محسوس نہ کی۔ جیلانی کامران شریف ہی نہیں بلکہ شریف النفس بھی تھے۔ اس رویے نے ان کی تنقیدی تحریروں میں بھی اظہار پایا چنانچہ اپنے تنقیدی نظریات کی روشنی میں انہوں نے جب کسی اور سے اختلاف رائے کیا تو اسے صرف ادب و نقد تک ہی محدود رکھا اور اپنی تنقید سے مخالفین کی راہ میں کانٹے نہ بچھائے۔ جیلانی کامران ایسے کالم نگار تھے جن کا کالم نگاری کی وجہ سے کوئی کھڑکا ڈرکا نہ تھا۔ ہمارے ہاں جس طرح بعض کالم نگار اپنے کالموں کو غیر ادبی کاموں کے لیے استعمال کرتے حصول فوائد کے لیے سیڑھی بناتے اور مجاز حکام کے لیے ریڈ کارپٹ میں تبدیل کر دیتے ہیں، جیلانی کامران نے ایسا نہ کیا۔ انہوں نے کتابوں اور شخصیات پر کالم لکھے اور خوب لکھے مگر ان کی کالم نگاری ادب اور ادیبوں تک ہی محدود رہی انہوں نے اسے پبلک ریلیشنگ کا ذریعہ نہ بنایا۔ جیلانی کامران نرم دل انسان تھے اسی لیے ان کی شعوری کوشش رہتی کہ وہ زبان یا قلم سے کسی کی دل آزاری نہ کریں۔ کسی نقاد یا کالم نگار کے لیے ہی خاصا مشکل کام ہے لیکن جیلانی کامران نے عملاً یہ کر دکھایا۔

جب کبھی کسی دل جلے شاعر کی شاعری کی مدح میں نقاد سے ایک آنچ کی کسر رہ جائے یوں کہ اس کا نفس مکمل طور پر موٹا نہ ہو پایا تو وہ یہ کہہ کر جلے دل کے پھپھولے پھوڑتا ہے کہ ناکام شاعر تو نقاد بن جاتا ہے۔ وہ شخص جو تخلیقی اظہار میں خود ناکام رہتا ہے وہ دوسروں کی تخلیقات میں کیڑے ڈالتا ہے یا پھر کیڑے نکالتا ہے۔ یہ غیر منطقی سوچ ہے جس کی عملاً تکذیب ہو جاتی ہے۔ معاصر تنقید کے منظر نامے پر نگاہ دوڑائیں تو ہمیں متعدد ایسے تخلیق کار نظر آ جاتے ہیں جو اگر ایک طرف تخلیقی عمل کے رمز شناس ہیں تو ساتھ ہی تنقید سے وابستہ مسائل و مباحث پر بھی ماہرانہ نگاہ رکھتے ہیں۔ اس ضمن میں اسم شماری سے گریز کرتے ہوئے پروفیسر جیلانی کامران کا نام لے دینا ہی کافی ہے کہ ان کا نام اور کام یوں اہمیت حاصل کر لیتا ہے کہ وہ جتنے اچھے شاعر تھے اتنے ہی اچھے

نقاد بھی۔ یوں سمجھیے کہ فن کی میزان کے دونوں پلڑوں میں ان کی شاعری اور تنقید رکھ کر وزن کریں تو دونوں ہی ہم وزن ثابت ہوں گے۔ لہٰذا یہ دعویٰ غلط نہ ہوگا کہ اگر انہوں نے صرف شاعری ہی کی ہوتی تو وہ جدید شاعری میں اپنا مقام بنا سکتے تھے۔ تنقید نے ان کی شاعری کا کچھ نہ بگاڑا بلکہ میں یہ سمجھتا ہوں کہ تنقید نے ان کی شاعری میں زیادہ نکھار پیدا کر دیا کہ وہ بیشتر غیر ناقد شعرا کے مقابلے میں شاعرانہ فن کاری سے زیادہ واقف تھے اور اسلوب کی جمالیات کا زیادہ گہرا ادراک رکھتے تھے۔

میں اپنے موقف کی تائید میں ان کی ''استانزے'' میں سے ایک نظم کے صرف تین بند پیش کرتا ہوں۔ ۱۹۶۹ء میں وہ یہ لکھ رہے تھے:

میں ۔ دسمبر کا خنک ہاتھ، تو اپریل کی کلی،
تو، ستاروں کی خریدار، میں خواہاں تیرا،
دسترس تجھ کو، نہ حاصل مجھ کو!

عمر شبنم کا بدن چوم چکی ہے تجھ پر،
بند کلیوں کی طرح تو ہے کشش آج مجھے،
ہے دل قطرہ اگر بحر، تو ساحل مجھ کو!

زندگی تجھ کو اگر غیر پسند آتی ہے،
ناپسندیدہ اگر تجھ کو ہے خواہش میری،
موت کی شکل میں آ

۲۰۰۲ء میں جیلانی کامران کی کلیات شائع ہوئی تو ان کا تمام کلام یک جا ہو جانے کی وجہ سے ان کے فن کی تفہیم آسان ہو گئی اور اب جب کہ شاعر ہمارے درمیان نہیں تو یہ کلیات ہی ان سے مکالمے کا واحد ذریعہ قرار پاتی ہے۔

جیلانی کامران انگریز کے استاد تھے اس لیے انگریزی ادب کی تاریخ سے پوری طرح واقف تھے تاہم بیشتر پروفیسروں کی مانند ڈگری اور ملازمت حاصل کر لینے کے بعد انہوں نے مطالعہ ترک نہ کیا اور نہ ہی ماضی بعید کے کلاس نوٹس حال کی کلاسوں کو لکھواتے رہے وہ صحیح معنوں میں وسیع المطالعہ استاد تھے۔ بین الاقوامی سطح پر نمایاں ادبی تحریکوں اور تخلیقی نظریات سے بھی وہ مکمل طور پر آگاہ تھے۔ چونکہ اردو کے ادیب تھے اس لیے اردو زبان و ادب کے ماضی اور حال پر گہری نگاہ کے ساتھ ساتھ وہ کلاسیکس کا بھی گہرا ادراک رکھتے تھے۔ خیر یہ تو ایسی خصوصیات ہیں جو دیگر اچھے ناقدین میں بھی مل جاتی ہیں۔ جیلانی صاحب کی اضافی خصوصیت پنجابی زبان و ادب سے ان کی واقفیت اور تخلیقی وابستگی تھی۔ اسی لیے وہ اگر ایک طرف مادھولال حسین اور بلھے شاہ کے گرویدہ تھے تو ساتھ ہی انہوں نے خواجہ فرید کی منتخب کافیوں کا انگریزی زبان میں بہت اچھا ترجمہ بھی کر رکھا تھا۔ پنجابی زبان کے صوفی شعرا سے انہیں خصوصی رغبت تھی اور وہ ان کی شاعرانہ فطرت اور روحانی واردات کے بڑے مداح تھے۔ وہ مقالہ ''مغنیہ لاہور کی تین نظمیں'' میں لکھتے ہیں:

''صوفیا کی شاعری کا ماخذ انسان کا وہ کردار ہے جسے اصطلاح میں باعمل صوفی کہا جاتا ہے۔ مسلمان دانش وروں نے انسان اور صوفی کے مابین جو فرق دکھایا ہے وہ شخصیت کے حوالے سے نمایاں ہوتا ہے۔''

دیکھا جائے تو یہ نکتہ ان کی تنقید کے مابعد الطبیعی اساس کی تفہیم کے لیے بھی کارآمد ثابت ہو سکتا ہے۔ پروفیسر جیلانی کامران کا یہ رویہ انہیں تصوف اور مابعد الطبیعیات کی جانب لے گیا۔ غالباً جیلانی کامران واحد ایسے نقاد تھے جو اگر ایک طرف میراجی، فیض، راشد اور اختر شیرانی پر قلم اٹھا سکتے تھے تو اسی سہولت سے وہ صوفی شعرا کی متصوفانہ واردات کی تحسین بھی کر سکتے تھے۔ میں اس ضمن میں ان کے ایک اہم مقالے ''خواجہ فرید اور بدلتی ہوئی دنیا'' کو بطور مثال پیش کروں گا۔ وہ مقالے کا آغاز یوں کرتے ہیں:

''خواجہ فرید کے کلام اور ان کے صوفیانہ منظر نامے تک پہنچنے کے لیے تین حوالے بروئے کار آتے رہے ہیں۔ ان میں سے پہلا حوالہ چولستان کا ہے، دوسرا روہی کا اور تیسرا اس دنیا کا جسے خواجہ فرید اپنے کلام کے ذریعے مخاطب کرتے ہیں ان تین حوالوں کی مناسب پہچان کے بغیر خواجہ فرید کے کلام کے ساتھ وہ شناسائی ممکن نہیں ہو سکتی جو زمانی اعتبار سے ماضی کے رویے کو مرتب کرتی ہے اور اس طرح عہد حاضر کے ساتھ گفتگو میں اسے شریک کرتی ہے تاہم جن تین حوالوں کا ذکر کیا گیا ہے ان میں سب سے زیادہ ضروری اس دنیا کا تذکرہ ہے جو خواجہ فرید کا فکری ماحول مرتب کرتی ہے اور جس کے ساتھ ہمارے عہد کا رشتہ بھی وابستہ ہے''۔

اگرچہ یہ مقالہ خواجہ فرید کی فکر کی تفہیم کے لیے ہے لیکن اس میں کئی ایسے کارآمد اشارے بھی مل جاتے ہیں جن کی روشنی میں جیلانی کامران کی تنقید کے بعض پہلوؤں کو سمجھا جا سکتا ہے۔ اس ضمن میں اس اقتباس کی طرف توجہ دلاؤں گا۔

''اس ماحول کے منظر نامے میں عہد حاضر کی جدید (مغربی) دنیا اور خواجہ فرید کی مانوس اور مشرقی روایت کی دنیا ایک ساتھ موجود دکھائی دیتی ہیں۔ ایسی صورت حال سے انسان ایک ایسی پریشانی سے دوچار ہوا ہے جو ایک جانب احساس گناہ بن کر ظاہر ہوتی ہے اور دوسری جانب دعاؤں کے وسیلے کو اختیار کرتے ہوئے رستگاری کی طلب کرتی ہے۔ اس لیے عہد حاضر میں نعت گوئی اور حمدیہ شاعری کا رواج بڑھ گیا ہے اور مزاروں اور صوفیا کی درگاہوں پر دعائیں مانگنے کی خواہش میں اضافہ بھی ہوا ہے''۔

جیلانی کامران کی انتقال سے چند ماہ قبل شائع ہونے والے تنقیدی مضامین کا مجموعہ ''ادب کے مخفی اشارے'' (۲۰۰۲ء) اب ان کا آخری مجموعہ ہے۔ میں نے جن مقالات کے حوالے دیے وہ اسی مجموعے میں شامل ہیں۔ اسی کتاب میں جیلانی صاحب کا ایک مقالہ ''خواب، کون میں؟ کون تم؟'' مجھے بہت بھایا کہ اس مقالے میں شاعر اور نقاد یوں آمیز ہوئے کہ ایک کو دوسرے سے جدا کرنا آسان نہیں۔ یہ مقالہ مجھے اس لیے بھی اچھا لگا کہ میں خود اس بات کا قائل ہوں کہ عصر حاضر نے بالعموم اور پاکستانی معاشرے کے تضاد در تضاد سلسلوں نے پہلے ہم سے دن سپنے چھینے، پھر رات کے حسین خواب نوچ لیے اور باقی بچے ''نائٹ میرز''۔ قلم کار کے لیے لفظ خواب بھی ہوتا ہے اور خواب کی تعبیر بھی لیکن لفظ جب تجارت میں تبدیل ہو جائے تو معاشرے کی منڈی میں شاید وہ زیادہ قیمت حاصل کرے اس طوائف کی مانند جو عفت مآب عورت کے مقابلے میں کہیں زیادہ مہنگی ہوتی ہے۔ میں خواب کے فرائیڈ اور ژونگ کے نظریات سے یہاں بحث نہیں کرتا کہ ذاتی طور پر میں تو یوسف کے خواب کا قائل ہوں قطع نظر اس سے کہ یوسف نے بھی اپنے خوبصورت خواب کی بھیانک تعبیر حاصل کی تھی۔ بہرحال جیلانی کامران نے اپنے مقالے کا آغاز کچھ اسی انداز سے کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

''عہد حاضر کے رویوں کی ایک نمایاں روش یہ ہے کہ خواب کا نہ تو کوئی مقام باقی رہا ہے اور نہ خواب کو انسانی زندگی کے اظہار اور امکانات کا کوئی اصول سمجھا جاتا ہے۔ زندگی کے تسلسل سے خواب کو الگ کر دیا گیا ہے..... عہد حاضر کی زندگی کا معمول بھی خواب کو اپنے اوقات میں شریک نہیں کرتا۔ سیاسی اور

اقتصادی حالات نے بھی انسان سے خواب کو چھین لیا ہے اور انسان کے اندر ڈر اور محرومی، اکیلے پن اور بے سہارا ہو جانے کی کیفیت نے خواب کے اثباتی منظر نامے کو توڑ کر ڈراؤنے خواب کے راستے کھول دیے ہیں۔ عہد حاضر کا انسان اپنی ہی دنیا میں کمزور اور مظلوم ہو کر اس نعمت سے محروم ہو رہا ہے جو اسے ہمت دیتی تھی تر و تازہ رکھتی تھی اور امید کا راستہ دکھاتی تھی جہاں خواب ان راستوں پر چل کر آتے تھے اب نہ وہ راستے نظر آتے ہیں نہ خواب ان پر چل کر آتے ہیں''۔

جیلانی کامران نے اس مقالے میں صرف خوابوں کے اجڑنے کا ماتم نہیں کیا بلکہ انہوں نے زندگی کے اس جدید وقوعہ کا شاعری کے ساتھ ناطہ جوڑا اور روحانیت کے حوالے سے یہ نتیجہ اخذ کیا:

''شاعر عالم خواب میں سیر الفاظ کا متن تحریر کرتا ہے اور یہ متن شاعری کے ایک نئے اسلوب اور رشتے کی خبر دیتا ہے۔ کائنات خاموش نہیں رہتی۔ نظارۂ وجود بے کلام نہیں رہتا اور لفظ بھی زندہ ہو جاتا ہے۔ سورہ العلق میں اسی لفظ کے بارے میں مرقوم ہے اور یہ لفظ اپنے پالن ہار کے اسم سے پڑھنا اس لیے بھی ضروری ہے کہ:

''انسان اپنے طور پر سرکش ہو گیا ہے اور اپنے آپ کو بے نیاز سمجھ چکا ہے''۔

زندگی کو خواب، کون میں؟ کون تم کے حوالے سے پہچاننا ضروری ہے کہ باطن کی زرخیزی سے ظاہر کی خوش نمائی رونما ہو''۔

بحیثیت مجموعی جیلانی کامران کی تنقیدی دنیا تین آفاق میں نظر آتی ہے۔ انہوں نے انگریزی ادب سے جدید تنقید کے اصول وضوابط کا اکتساب کیا۔ اردو شاعری کے کلاسیکی سرمائے سے اسلوب کی جمالیات کے نکات حاصل کیے اور صوفی شعرا سے متصوفانہ واردات کا شعور اور مذہبی مابعد الطبیعیات کا ادراک حاصل کیا۔ جدید انگریزی اندازِ نقد اور متصوفانہ واردات میں بعد المشرقین ہے لیکن جیلانی کامران نے دونوں کو ماہرانہ انداز میں ملا دیا اگرچہ اس ضمن میں وہ کوئی اپنا ذاتی تصور اور منفرد نظریہ پیش نہ کر پائے۔ انہوں نے خود کو تشریحات تک ہی محدود رکھا لیکن یہ بھی بہت ہے۔ یوں دیکھیں تو ان کی تنقید کی تین جہات (Dimentions) قرار پاتی ہیں۔ انگریزی تنقید، اردو کلاسیکس اور صوفی شعراء، اور ان تینوں کے تال میل سے ہی جیلانی کامران نے معاصر ناقدین میں اپنی انفرادیت تسلیم کروائی۔

پروفیسر جیلانی کامران متعدد تنقیدی کتابوں کے مصنف تھے۔ ''تنقید کا نیا پس منظر''، ''اقبال اور ہمارا عہد''، ''غالب کی تہذیبی شخصیت''، ''مغرب کے تنقیدی نظریے'' اور انتقال سے چند ماہ قبل طبع ہونے والی کتاب ''ادب کے مخفی اشارے'' جیسا کہ ان کتابوں کے ناموں سے ہی اندازہ لگایا جا سکتا ہے انہیں اگر ایک طرف تنقیدی نظریات و تصورات سے دل چسپی تھی تو دوسری جانب وہ اقبال اور غالب جیسے شعرا پر بھی قلم اٹھاتے تھے۔ چونکہ وسیع المطالعہ نقاد تھے، اس لیے اقبال شناسی اور غالب فہمی میں پیش پا افتادہ باتیں کرنے، یعنی کالج نوٹس کو بطور تنقیدی مقالات طبع نہ کرانے کی بنا پر دونوں کے بارے میں نئے انداز و اسلوب میں گفتگو کی۔ اب جب کہ وہ ہم میں نہیں رہے تو ان کی شاعری اور تنقید ہی ہم سے گفتگو کرنے کو باقی رہ گئی ہیں۔

ع مدت رہیں گی یاد یہ باتیں ہماریاں

# بیادِ افتخار احمد صدیقی

ڈاکٹر تحسین فراقی

قلب انسانی میں چبھتے ہوئے کانٹے یعنی موت کا میں نے جب بھی تصور کیا ہے، میرے حافظے کی لوح، لوحِ مزار بن گئی ہے جس پر طرح طرح کے مصرعے اور شعر سیاہ پوش نظر آتے ہیں۔ ذرا گوشِ ہوش سے سنیے غالب کیا کہہ رہا ہے:

خطے بر ہستی عالم کشیدیم از مژہ بستن     زخود رفتیم وہم با خویشتن بردیم دنیا را

مراد یہ کہ ہم نے آنکھیں کیا بند کیں گویا تمام عالم ہستی پر خط سیاہ کھینچ دیا بالکل جیسے پلکیں بند کر لینے سے ایک سیاہ لکیر سی کھنچ جاتی ہے۔ ہم از خود رفتہ کیا ہوئے گویا تمام دنیا کو بھی اپنے ساتھ سمیٹ لپیٹ کر لے گئے۔ مطلب یہ کہ ہم گئے تو دنیا بھی گئی۔

رفتیم و نکردیم نگاہے بقفا ہیچ

ہم گئے تو ہمارے لیے اس کا ہونا کیا اور نہ ہونا کیا۔ شاید ایسے ہی کسی احساس کے تحت برطانوی شاعرہ کرسٹینا روزیٹی (۱۸۳۰۔ ۱۸۹۴) نے کہا تھا:

" When I am dead,my dearest
Sing no sad songs for me
plant Thou no roses at my head,
nor shady cypress tree:
Be the green grass above me
with showers and dew drops wet
And if thou wilt,remember,
And if thou wilt,forget."

لیکن زندہ معاشرے اور بیدار مغز افراد اپنے بچھڑنے والوں کو ہمیشہ یاد کرتے اور ان کی چھوڑی ہوئی روشنی سے اپنے دیے جلانے کا اہتمام کرتے رہتے ہیں۔ مرحوم ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی بھی ایک ایسے ہی روشن چراغ تھے جن کی یاد کی لو ان کے سیکڑوں شاگردوں اور بیسیوں ملنے والوں کے دلوں میں آج بھی روشن ہے اور رہے گی۔

اے تو مجموعۂ خوبی بچہ نامت خوانم!!

ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی (اپریل ۱۹۱۷ء۔ ۱۸، جون ۲۰۰۰ء) سے میرا تعلق بہت دیرینہ نہ تھا مگر جتنا تھا اس کا تصور بڑا بہجت انگیز اور خوش کن ہے۔ مرحوم کی شخصیت اخلاص اور دردمندی کا مرقع تھی۔ وہ اعلیٰ تہذیبی روایات کے امین تھے۔ ان کی

شخصیت میں علم کا رچاؤ تھا۔ سلیم الفطرت اور سلامت رو تھے۔ میری ان سے نیاز مندی اس زمانے سے تھی جب میں ایم اے او کالج میں مدرس تھا۔ میرے پی ایچ۔ڈی کے مقالے کے ایک ممتحن صدیقی صاحب بھی تھے۔ زبانی امتحان لینے آئے۔ مقالے کی بہت تعریف کی مگر یہ تعریف بے آمیز نہ تھی۔ چند خامیوں کی بھی بڑی نرمی سے نشاندہی کی۔ بعد میں ایک نہایت محبت بھرا خط لکھا۔ بڑی ہمت افزائی کرتے تھے۔ ان کی خردنوازی ان کی وسعت نظر کی دلیل تھی۔

صدیقی صاحب نے کم وبیش تراسی برس عمر پائی۔ ان کی اس طویل عمری کے مقابل ان کا علمی سرمایہ بظاہر کم اور کوتاہ نظر آتا ہے مگر معیار کے نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو بے اختیار داد دینے کو جی چاہتا ہے۔ اللہ نے مرحوم کو بڑی علمی بصیرت عطا کی تھی۔ صدیقی صاحب محقق بھی تھے، مرتب بھی اور مترجم بھی۔ خوشگو شاعر بھی تھے مگر ان کی نمایاں ترین حیثیت محقق ومرتب کی تھی۔ میں ان کے متنوع علمی کارناموں کو دیکھتا ہوں تو ان میں ایک کمال درجے کی وحدت پاتا ہوں۔ ان کا بیشتر کام حالی، نذیر احمد اور اقبال پر ہے۔ غور کیا جائے تو یہ تینوں شخصیتیں ایک ایسی طلائی تثلیث ہیں جن کا سونا مرور وقت سے کبھی گہنا نہیں پائے گا۔

صدیقی صاحب کے تحقیقی وتدوینی کاموں میں ایک علمی شان پائی جاتی ہے۔ جو سلامت روی ان کی شخصیت میں تھی وہی ان کے علمی کارناموں میں بھی جھلکتی ہے۔ وہ اردو تحقیق کے دبستان لاہور کے ایک اہم رکن قرار دئے جاسکتے ہیں۔ اس تحقیقی زاویۂ نگاہ کی نمود اورینٹل کالج کی علمی فضا سے ہوئی۔ ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی "Marathon Race" کے معانی سے آگاہ اور اس کے مصداق تھے۔ لمبی اور مسلسل دوڑ میں ان کا سانس کہیں پھولا دکھائی نہیں دیتا۔ ان کا پی ایچ۔ڈی کا مقالہ "مولوی نذیر احمد دہلوی۔ احوال وآثار" ادبی وعلمی شخصیات پر تحقیقی کام کرنے والوں کے لیے راہب کا چراغ ہے۔ یہ ان کم حوصلہ محققین کے لیے تازیانہ بھی ہے جو تحقیق کے چند دانے چن کر منقار زیر پر ہو جاتے ہیں۔ جو اپنے تحقیقی مقالے چھپواتے نہیں چھپاتے پھرتے ہیں۔ جن کا مقصود محض ڈگری کا حصول ہوتا ہے تاکہ ترقی درجات کے لیے ایک ہی سانس میں بانس کی ایک سیڑھی انھیں مل جائے۔ صحرائے ہوس میں گم ہو کر جان ہار جانا ایسے محققین کا مقدر ہے:

ترسم نرسی بکعبہ اے اعرابی ! کیں رہ کہ تو می روی بہ ترکستان است

''کلیات نظم حالی'' کی ترتیب بھی افتخار احمد صدیقی کے لیے مایۂ افتخار کہی جاسکتی ہے۔ وہ موزوں طبع ہی نہ تھے، خود شاعر تھے اس لیے انھیں شعری متن کی تدوین کا حق حاصل تھا۔ اس دور زوال کا المیہ یہ ہے کہ شعری متن وہ لوگ مرتب کرتے ہیں جو نثر اور شعر کی تمیز سے قاصر ہیں۔ سنا ہے ایک مشہور علمی درسگاہ میں ایک صاحب جو شعر ونثر کو ایک آنکھ سے دیکھتے تھے، میر پڑھا رہے تھے۔ جب ایک گھنٹے کا لیکچر دے چکے تو ایک تیز بیں اور تیکھے موزوں طبع طالب علم نے استاد محترم سے شکوہ کیا۔ "سر آپ نے میر تو پڑھایا مگر اس کا ایک شعر تک نہیں سنایا۔ استاد محترم نے فرمایا۔ عزیزم ! آپ کی سماعت کا قصور ہے، میں نے کم وبیش پینتیس شعر سنائے تھے !! استاد محترم کا ارشاد بجا تھا۔ دراصل شعر ان کے دہن کے سنگیں حصار سے اس طرح ریزہ ریزہ ہو کر نکلتے تھے کہ نثر عاری کا روپ دھار لیتے تھے!

اقبالیات کے باب میں ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی کی کتاب "عروج اقبال" کو بڑا اہم مقام حاصل ہے۔ اس کتاب میں مرحوم نے تحقیق کا حق ادا کر دیا ہے۔ ریزہ ریزہ جزئیات کو اس خوبی سے سمیٹا ہے کہ ۱۸۷۷ء سے ۱۹۰۸ء تک کے اقبال کی ایک جیتی جاگتی، بولتی چالتی تصویر سامنے آجاتی ہے۔ ان کی شخصیت کی کشود اور ان کی فکر کے ارتقاء کو اس سلیقے اور گہرے استدلال کے ساتھ نمایاں کیا ہے کہ باید وشاید۔ عطیہ فیضی کی شخصیت کی پیچیدہ بنت کی گرہیں ہمارے محققوں یا نقادوں میں سے یا تو ڈاکٹر ابن فرید نے کھولیں یا ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی نے۔ حقیقت بھی یہ ہے کہ اقبال کی شخصیت پر عطیہ کے نہیں ایما (EMMA) کے اثرات مرتب ہوئے اور ان اثرات نے ان کے شعر کو ایک تیز دھار عطا کی۔

ڈاکٹر صاحب کے تراجم کو نقادوں نے بالعموم نظر انداز کیا ہے۔ حال آں کہ انھوں نے اقبال کی ڈائری "STRAY REFLECTIONS" کا بڑا رواں اور اصل متن سے کمال مطابقت پیدا کرتے ہوئے ایسا ترجمہ کیا ہے کہ اس پر کہیں کہیں تخلیق کا گمان ہوتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کی ذات اردو کلچر کی کڑھی ہوئی شخصیت تھی۔ فارسی ادبیات سے گہری واقفیت اس کلچر کا حصہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی نثر عمدہ علمی نثر کہی جاسکتی ہے۔ ایسی نثر بن میں نہ تو سپاٹ پن کا عیب ہے نہ شاعرانہ اسلوب کی بے اعتدالی۔ بے محل نہ ہوگا اگر میں یہاں ان کے بعض تراجم سے چند اقتباس معہ انگریزی متن کے درج کروں تاکہ ڈاکٹر صاحب کی کرشمہ کاری کا کسی قدر اندازہ ہو سکے۔ "شذرات فکر اقبال" میں "حیرت" کے زیر عنوان یہ ترجمہ عبارت ملتی ہے:

"افلاطون کا قول ہے کہ حیرت تمام علوم کی ماں ہے۔ میرزا عبدالقادر بیدل حیرت کو ایک مختلف زاویہ نظر سے دیکھتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں:

نزاکت ہاست در آغوش میناخانۂ حیرت مژہ برہم مزن تا نشکنی رنگ تماشا را

افلاطون کے نزدیک حیرت اس لیے قابل قدر ہے کہ اس سے فطرت کے بارے میں ہمارے تجسس کو تحریک ہوتی ہے۔ بیدل کے لیے حیرت اپنے ذہنی نتائج واثرات سے قطع نظر فی نفسہ قابل دید ہے۔" ۱

اصل انگریزی اقتباس از اقبال:

" Wonder,says Plato is the mother of all science.Bedil(Mirza Abdul Qadir) looks at the emotion of wonder from a different standpoint.Says he

نزاکت ہاست در آغوش میناخانۂ حیرت مژہ برہم مزن تا نشکنی رنگ تماشا را

To Plato wonder is valuable because it leads to our questioning of nature,to Bedil it has a value of its own,irrespective of its intellectual consequence." ۲

"شذرات فکر اقبال" میں "شکر گزاری" کے زیر عنوان ذیل کا ترجمہ ملتا ہے، ترجمہ کیا ہے نثر لطیف کا ایک ٹکڑا ہے:

"خدایا تیرا شکر ہے کہ تو نے مجھے اس دنیا میں پیدا کیا جہاں گلابی صبحیں، شعلہ پوش شامیں اور وہ گھنے جنگل ہیں جن کی آغوش میں فطرت کی شب ہائے رفتہ کے دھندلکے ابدی نیند سو رہے ہیں۔" ۳

اصل انگریزی عبارت:

" God ! I thank Thee for my birth in this world of rosy dawns,flame-clad sun-sets and thick forests, wherein the gloom of nature's bygone nights rests in eternal sleep." ۴

صدیقی صاحب مرحوم نے بعض اہم انگریزی مضامین کے اردو تراجم بھی کیے۔ ذیل کا ایک اقتباس دیکھیے جس سے

بخوبی اندازہ ہوگا کہ مرحوم کتنی صاف، روشن اور متوازن نثر لکھنے پر قادر تھے اور اصل متن کی روح کو کس خوبی سے برقرار رکھتے تھے۔ یہ اقتباس تاج محمد خیال کے مشہور مقالے "Iqbal's Conception of Satan" کے انگریزی اقتباس کا ترجمہ ہے:

"بدی کا فلسفہ ہر نظام فلسفہ کا ایک لازمی جز ہے اور جو مفکر ایک عالمی نظریہ پیش کرنے کی کوشش کرتا ہے اسے اس بارے میں متعدد اہم اور بنیادی سوالوں پر غور کرنا پڑتا ہے مثلاً بدی اور اس کی فطرت کیا ہے۔ کیا بدی کا کوئی حقیقی وجود ہے یا محض ایک مجازی روپ ہے جو انسان کی تنگ نظری اور حقیقت ناشناسی کے باعث رونما ہوتا ہے۔ اگر بدی کا وجود ہے تو اس کا سرچشمہ کہاں ہے۔ حیات و کائنات کے اس نقشے میں اس کی کیا جگہ ہے؟"۵

تاج محمد خیال کے مقالے کا اصل انگریزی متن:

"The problem of evil is an integral part of every philosophical system and anyone who tries to give a world-view has to consider a number of very important and fundamental questions about it.What is evil? what is its nature? Is evil real or only an unreal appearance ,caused by man's narrow vision and lack of undertaking of ultimate reality?If evil is real what is its source? what is its value in the scheme of things."۶

ڈاکٹر صدیقی صاحب کی تحقیقی و علمی سرگرمیاں جاری تھیں کہ انھیں زندگی کے ایک جانکاہ صدمے سے دوچار ہونا پڑا۔ ان کا نوجوان بیٹا عزیزی عرفان احمد غالباً کسی رقیبانہ دشمنی کی بھینٹ چڑھ کر ۴، جولائی ۱۹۸۳ء کو راہی دار البقا ہوا۔ عرفان احمد ان کا اکلوتا بیٹا تھا۔ ڈاکٹر صدیقی مرحوم یوں تو تقسیم کے قبل بھی شعر کہتے تھے لیکن اس دردناک حادثے کے نتیجے میں ان کی شاعری میں موثر رثائی عنصر کا اضافہ ہوا۔ مرحوم کی نظم "آہ عرفان احمد" ایک ذاتی دکھ سے ابتداء کرتی ہوئی پاکستانی سماج کی ابتری سے ہم رشتہ ہو کر ایک نئے کرب میں ڈھل جاتی ہے۔ مرحوم کی طویل بحر میں لکھی گئی نظم کے چند شعر دیکھیے اور اس کی تاثر آفرینی کا اندازہ فرمائیے۔ اس نظم کی ایک خوبی یہ ہے کہ اس میں خود صدیقی صاحب کی شخصیت کے بعض گوشوں کی جانب بھی معنی خیز اشارے ملتے ہیں:

اک معصوم جوان رعنا طاغوتی شعلوں میں گھرا تھا
داتا کی نگری میں یارو یہ کیسا اندھیرا ہوا تھا

دن کے اجالے، ہمدردوں کے ہالے میں کن بیدردوں نے
میری کشت حیات اجاڑی، ارمانوں کا چمن لوٹا تھا

آہ وہ عالم حملۂ شر میں، بے بس تھا وہ خیر مجسم
اف وہ سماں جب خطرۂ جاں میں وہ جان جاناں تنہا تھا

میں اک شاعر تھا من موجی ''ہر بر وادی میں سرگرداں''
وہ اس عمر میں ہر سو نگراں لیکن رہرو راہ ھدیٰ تھا

میں ہوں معلم لیکن گاہے" وتواصوا بالصبر " سے غافل
زہر غم و غصہ پی کر وہ پیار کا امرت برساتا تھا

اس کی جمالی سیرت گاہے مجھ کو دکھاتی تھی آئینہ
اس کے لہجے کی نرمی پر گاہے مجھ کو رشک آتا تھا

دونو خلق عظیم کے پیرو میں بہ ریاضت وہ بہ سہولت
میں کیسا ہوں یہ تم جانو وہ مجھ سے طبعاً اچھا تھا

اب سوچو ہم نے کیا کھویا، اب سوچو ہم پر کیا گزری
جب وہ چاند ہمارے گھر کا، قبر کی ظلمت میں ڈوبا تھا

لیکن ہم بندے وہ مولی، مرضی مولی از ہمہ اولی
میں اب بھی راضی برضا ہوں، میں جب بھی راضی بہ قضا تھا۷

اس حادثے نے ڈاکٹر صاحب کو ہلا کر رکھ دیا۔ قریباً دو برس بعد ۱۹۸۵ء میں وہ بہاولپور یونیورسٹی سے سبکدوش ہوئے۔ مگر اس کے بعد وہ جم کر کوئی کام نہ کر سکے۔ "عروج اقبال" کے بعد ان کی کتاب "فروغ اقبال" شایع ہوئی۔ اپنے بعض مباحث کے اعتبار سے یہ کتاب قابل توجہ ٹھہرتی ہے مگر یہ "عروج اقبال" کے معیار کو نہیں پہنچتی۔

بہاولپور یونیورسٹی سے سبکدوش ہونے کے بعد ڈاکٹر صاحب مستقلاً لاہور آ کر اپنے ذاتی گھر میں رہنے لگے۔ کبھی کبھار اورینٹل کالج کا پھیرا کرتے۔ اس زمانے میں ان سے کئی ملاقاتیں رہیں۔ میں نے انھیں اپنی بعض کتابیں پیش کیں ان میں ایک "مطالعۂ بیدل فکر برگساں کی روشنی میں" بھی تھی۔ کالج آتے تو ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی اور مجھ سے خاص شفقت فرماتے۔ کچھ دیر بیٹھ کر چل دیتے۔ وفات سے کوئی ایک ماہ قبل کالج تشریف لائے۔ میں شیرانی ہال کے برآمدے سے گزرتا اپنی کلاس کی طرف قدم زن تھا کہ صدیقی صاحب نظر آئے۔ میں ان کا حال احوال پوچھنے کے لیے رکا۔ مجھے ایک اچٹتی اجنبی نظر سے دیکھا۔ میں نے سلام کیا۔ فرمانے لگے: آپ یہاں پڑھتے ہیں؟ عرض کیا، نہیں ڈاکٹر صاحب! میں یہاں پڑھاتا ہوں۔ میں نے مزید یہ کہا کہ ہاشمی صاحب آپ کو بہت یاد کرتے ہیں۔ فرمایا۔ ہاشمی صاحب یہاں پڑھتے ہیں؟ میں نے عرض کیا نہیں جناب وہ بھی یہاں پڑھاتے ہیں۔ فرمانے لگے اب میں جا رہا ہوں پھر کسی وقت آؤں گا۔ اس ملاقات نے مجھے سخت دل گرفتہ کیا کیونکہ مجھے اندازہ ہوا کہ صدیقی صاحب کا حافظہ نہایت تیزی سے انحطاط کا شکار ہو رہا ہے۔ دل پر عجب طرح کا نقش عبرت مرتب ہوا۔ مجھے یاد آیا کہ چند برس قبل جامعہ ملیہ کے ڈین اور میرے عزیز دوست ڈاکٹر ضیاء الحسن ندوی نے حافظے کی گم شدگی کا ایک ایسا ہی دردانگیز واقعہ مجھے ممتاز ہندوستانی دانشور ڈاکٹر محمد مجیب کے بارے میں سنایا تھا۔ جنھیں انگریزی ادب پر دسترس تھی اور جن کی انگریزی زبان میں شعلہ بیانی ضرب المثل تھی۔ کہنے لگے کہ ریٹائرمنٹ کے بعد ڈاکٹر محمد مجیب کے حافظے کو تیزی سے زوال آنے لگا حتی کہ وہ سب کچھ بھول بھال گئے۔ انگریزی زبان کا نقش ان کی لوح حافظہ سے بالکل محو ہو گیا۔ کافی عرصہ زیر علاج رہنے کے بعد انھیں البتہ یہ احساس ہونے لگا کہ انھیں انگریزی نہیں آتی۔ ندوی صاحب راوی ہیں کہ ڈاکٹر صاحب کے شدید اصرار پر ان کے اہل خانہ نے ان کے لیے باقاعدہ ایک ٹیوٹر مقرر کیا جو روزانہ دو گھنٹے انھیں ابتدائی انگریزی قاعدے کی مدد سے انگریزی کے حروف تہجی سکھاتا تھا!!

جائے عبرت سرائے فانی ہے

چند دنوں بعد میں نے صدیقی صاحب کو فون کیا۔ اس دن ان کا حافظہ کچھ کچھ بیدار تھا۔ میرے اصرار پر کہ آپ کالج تشریف لائیں، کہنے لگے کہ آپ کی کتاب جو بیدل پر ہے، اس میں بہت سے سوال ہیں جنھیں میں حل کر رہا ہوں۔ یہ ہو چکے گا تو آؤں گا۔ چند دن بعد ان کی اہلیہ محترمہ سے فون پر بات ہوئی۔ فرمانے لگیں کہ صدیقی صاحب سب کچھ بھول گئے ہیں۔ صرف ایک بات تواتر سے کہتے ہیں کہ آپ لوگ مجھے ناگپور کیوں نہیں جانے دیتے۔ میں آپ پر بوجھ بن گیا ہوں۔ یہ کہتے کہتے تقریباً دوڑ کر گھر سے باہر نکل جاتے ہیں اور ہم انھیں بڑی مشکل سے خوشامد درآمد کر کے واپس لاتے ہیں۔ یہ باتیں میرے دکھ اور کرب کو اور بڑھا گئیں۔ میں نے انھیں تسلی دی اور صدیقی صاحب کی صحت اور عافیت کے لیے دعا کی۔ مگر سچی بات یہ ہے کہ دل ان کی طرف

سے ناامید ہو چکا تھا۔ دو ہفتوں بعد ان کی سناؤنی آ گئی۔ بس آن کی آن میں چل بسے:

مرگ آزاداں ز آنے بیش نیست

میں صدیقی صاحب مرحوم سے ملتا تھا تو ان کی ذات سے مجھے حالی کی خوشبو آتی تھی۔ اگلی شرافت کا بے مثل نمونہ تھے۔ سنا ہے وفات سے قبل آپ بیتی "نقش دوام" کے نام سے لکھ رہے تھے جو کئی ماہ کے ذہنی عارضے کے باعث نامکمل رہی۔ صدیقی صاحب رخصت ہو گئے مگر اپنے سیکڑوں شاگردوں اور ہزاروں صفحات پر مشتمل اپنے علمی کارناموں کی صورت میں ایک خط روشنی آنے والوں کے لیے چھوڑ گئے بالکل جیسے شہاب، سلک آتشیں کے ساتھ نور کی ایک لکیر چھوڑ جاتا ہے۔ فانظروا بعد نا الی الآثار۔

## حواشی

۱۔ "شذرات فکر اقبال" ، ص ۱۲۸

۲۔ "Stray Reflections",P:83

۳۔ "شذرات فکر اقبال" ، ص ۱۵۳

۴۔ "Stray Reflections",P:118

۵۔ "فلسفہ اقبال" ، ص ۲۷

۶۔ "Studies in Iqbal's Art & Thought" (مرتبہ سعید شیخ)، ص ۲۶۰_۶۱

۷۔ سہ ماہی سیارہ (لاہور) شمارہ ۲۱، دسمبر ۱۹۸۵ء، ص ۳۰۵_۳۰۶

# تعلیم نسواں اور بابا سرکھیم سنگھ بیدی

محمد عباس چغتائی

تعلیم نسواں ہر مہذب معاشرے کے بنیادی تقاضوں میں سے ہے۔ تعلیم نسواں کی اہمیت یوں بڑھ جاتی ہے کہ یہاں عورت کو تمدن کی جڑ سمجھا جاتا ہے، اسی کی گود کو اولین درس گاہ کا رتبہ حاصل ہے۔ پنجاب پر انگریزوں کے مکمل قبضے (۱۸۴۹ء) کے بعد تعلیم نسواں کے فروغ کی کوششیں ان مجموعی کوششوں کا نتیجہ تھیں جو صوبے کے لوگوں کی اخلاقی و ذہنی نشو و نما کے لیے کی گئیں۔ پنجاب میں ہر مذہب و ملت کے لوگوں اور یورپی افسران نے تعلیم نسواں کے سلسلے میں اپنے اپنے انداز میں خدمات انجام دیں۔ ان میں ڈاکٹر لائٹنر، نواب عبدالمجید خان، فقیر شمس الدین، پنڈت رادھا کشن، دیوان بیج ناتھ، مولوی علمدار حسین، رائے مول سنگھ، برکت علی خان، بابو نوبین چندرائے، بابو شمع چرن بوس، منشی ہروش رائے اور بابا سرکھیم سنگھ بیدی نمایاں ہیں۔

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ انگریزوں کے قبضے سے پہلے یہاں ایک وسیع اور منظم نظام تعلیم موجود تھا، جس سے خواتین کی ایک بڑی تعداد تعلیم حاصل کر رہی تھی، مگر انگریزوں نے مقامی نظام تعلیم کا خاتمہ کر کے ایک ایسا نظام تعلیم رائج کرنے کی کوشش کی جس کے لیے وہ لارڈ میکالے کے وقتوں سے کوشاں تھے کہ یہاں ایک ایسا طبقہ پیدا کیا جائے جو ان کی ماتحتی میں آسانی کے ساتھ کام کر سکے۔ ڈاکٹر جی ڈبلیو لائٹنر اپنی رپورٹ "The Indigenous Education in Punjab 1882" میں لکھتے ہیں کہ ہندوستان میں انگریزوں کے قبضے کے بعد روایتی تعلیم نسواں کا زوال شروع ہوا۔ ڈاکٹر لائٹنر اپنی تحقیق میں بہت سے حقائق پیش کرتے ہیں وہ لکھتے ہیں کہ ''زنانہ اسکولوں کو پبلک مقامات پر بنانے اور انہیں سرکاری افسران کے معائنے کے واسطے اجازت دینے سے بھی مقامی لوگوں کو مجبور کر دیا گیا کہ وہ اپنی لڑکیوں کو ان اسکولوں میں نہ بھیجیں۔ اس لیے تعلیم نسواں خاص طور پر بالائی طبقے میں غیر مقبول ہو گئی''۔

ڈاکٹر لائٹنر اپنی رپورٹ میں مزید لکھتے ہیں کہ ''زمانہ قدیم سے ہی ہندوستان میں ایک منظم اور وسیع بنیادوں پر پھیلا ہوا نظام تعلیم موجود تھا اور ایسا نظام تعلیم دنیا کے ان چند ممالک میں موجود تھا جبکہ یورپ کے کسی ملک میں اس جیسا نظام نہیں تھا۔ یہ نظام دو طرح کا تھا ایک میں بالائی طبقہ، مذہبی افراد اور مہذب شہری تعلیم حاصل کرتے جس کا مقصد مذہبی تعلیم اور ثقافت کا فروغ تھا، دوسرے میں تجارت پیشہ اور ہنر مند افراد تعلیم حاصل کرتے جس کا مقصد معاشی ترقی اور صنعت و حرفت میں مہارت حاصل کرنا تھا۔ یہ نظام تعلیم کیونکہ دیہی نظام کا حصہ تھا اور جب انگریزوں نے دیہی نظام ہی کو ختم کر دیا تو یہ مقامی نظام تعلیم بھی دم توڑنے لگا۔ انگریزوں نے اس نظام تعلیم کو جان بوجھ کر سمجھنے کی کوشش ہی نہ کی۔ چنانچہ انگریز منتظمین نے سیاسی وجوہ پر اس قدیم نظام ہی کو اکھاڑ پھینکا۔

قدیم مقامی اسکولوں کے کردار کے متعلق انگریز ماہرین تعلیم بے جا تنقید کرتے رہے۔ ان کا خیال تھا کہ یہ اسکول

روبرو اپنے بیان میں تعلیم نسواں کے متعلق دلچسپ تفصیلات بیان کرتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ پنجاب میں مسلمان خاندانوں میں خواتین پڑھ لکھ سکتی ہیں۔ کچھ فارسی زبان میں اعلیٰ پائے کی شاعری کرتی ہیں اور بہترین محقق ہیں۔ مسلمانوں اور سکھوں میں خواتین کو اعلیٰ حیثیت و مرتبہ حاصل ہے۔ حالانکہ عام طور پر اس کے برعکس خیال کیا جاتا ہے۔ ان خاندانوں میں تعلیم نسواں کے بارے میں کوئی تعصب نہیں پایا جاتا بشرطے کہ یہ ان کے رسم و رواج اور خلوت میں مخل نہ ہو۔

یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ پنجابی عورت نہ صرف خود تعلیم یافتہ تھی بلکہ دوسروں کو فیض پہنچانے کے بھی قابل تھی۔ ۱۸۵۴ء تک تعلیم نسواں کے بے شمار اسکول نجی گھروں میں کھلے ہوئے تھے۔ دہلی میں ۱۸۴۹ء میں چھ زنانہ اسکول ایسے تھے جنہیں پنجابی عورتیں چلا رہی تھیں جو صرف اسی نیک مقصد کے لیے ہجرت کر کے وہاں گئی تھیں۔ مسلمان خاندانوں میں بیوہ عورتیں لڑکیوں کو قرآن پاک کی تعلیم دینا مقدس فریضہ سمجھتی تھیں۔ بقول ڈاکٹر لائٹنر اس وقت دہلی اور شمال مغربی صوبہ جات تعلیم نسواں کے معاملے میں پنجاب سے بہت پیچھے تھے۔

ابتدا میں انگریزوں نے تعلیم نسواں کے بارے میں خاموشی اختیار کی۔ مگر جب شمال مغربی صوبہ جات میں تعلیم نسواں کے متعلق خوشگوار نتائج سامنے آنا شروع ہوئے تو ۱۸۵۷ء تک پنجاب میں بھی لڑکیوں کے لیے اسکول کھلنے شروع ہوئے جن میں طالبات کی تعداد تین سو کے لگ بھگ تھی۔ یہ بات دلچسپی سے خالی نہیں کہ یہ تمام طالبات مسلمان تھیں۔ سکھ اور ہندو خاندان اپنی لڑکیوں کو تعلیم کے لیے اسکولوں میں نہیں بھیجتے تھے۔ ۱۸۶۲ء میں لاہور میں ایک تعلیمی دربار کا انعقاد ہوا جس کی صدارت سر رابرٹ منٹگمری، گورنر پنجاب نے کی۔ انہوں نے تعلیم نسواں پر زور دیتے ہوئے مقامی رؤسا اور تعلیم یافتہ طبقے سے اپیل کی کہ وہ اس سلسلے میں آگے آئیں اور حکومت کی مدد کریں۔ اس اپیل کے بعد بابا سر کھیم سنگھ بیدی نے پنجاب میں تعلیم نسواں کی تحریک کا آغاز کیا۔ ۱۸۷۱ء تک انہوں نے راولپنڈی، جہلم اور جالندھر کے اضلاع میں جو اسکول کھولے ان کی تعداد ۱۰۸ تھی اور ۳۷۰۲ روپے کی رقم ان اسکولوں کے واسطے سرکاری خزانے سے بطور امداد دی جاتی تھی۔ بابا سر کھیم سنگھ بیدی اس رقم کے برابر خود اپنی جیب سے سالانہ ان اسکولوں پر خرچ کرتے تھے۔ یہ اسکول بہت معیاری تھے۔

## ۲

بابا کھیم سنگھ بیدی انتہائی اثر و رسوخ کی حامل شخصیت تھے۔ ان کے اثر و رسوخ کا اندازہ اس واقعے سے لگایا جا سکتا ہے کہ ایک دفعہ گورنر پنجاب دورہ پر راولپنڈی گئے اور بابا کھیم سنگھ بیدی ان سے ملنے کے لیے اپنے گاؤں کلر (تحصیل کہوٹہ) سے راولپنڈی آئے۔ گورنر سے ملاقات ہوئی تو باتوں باتوں میں بابا صاحب نے گورنر سے کہا کہ آپ راولپنڈی تو آئے ہی ہیں آپ ہماری ہاں بھی تشریف لے چلیے اور وہاں چائے پیجیے۔ گورنر صاحب نے بابا صاحب کی خواہش کے احترام میں دعوت قبول کر لی اور ڈپٹی کمشنر راولپنڈی کو کہا کہ وہ اگلے روز کلر جائیں گے۔ گورنر کا یہ حکم سن کر ڈپٹی کمشنر نے تحصیل دار کو حکم دیا کہ وہ انتظام کرے۔ درمیان میں صرف ایک روز کا وقفہ تھا اور یہ ناممکن تھا کہ سڑک کو درست کیا جا سکے۔ کلر راولپنڈی سے تقریباً ۱۲ میل کے فاصلے پر ہے۔ تحصیل دار کو ڈر تھا کہ اگر گورنر صاحب کا سفر ناہموار اور کچی سڑک کی وجہ سے آرام دہ نہ ہو سکا تو وہ ناراض ہو جائیں گے۔ تحصیل دار بابا صاحب کے اثر و رسوخ سے واقف تھا۔ اس نے بابا کھیم سنگھ کے ایک صاحبزادے کو ساتھ لیا اور گاؤں آیا۔ بارہ میل کے قریب کچی سڑک پر مٹی اڑ رہی تھی۔ وہاں پہنچ کر انہوں نے گاؤں کے لوگوں کو کہا کہ کل دوپہر کو گورنر صاحب کلر تشریف لا رہے ہیں اور بابا کھیم سنگھ نے حکم دیا ہے کہ راتوں رات سڑک تیار کر دی جائے۔ دیہات کے لوگوں نے جب بابا صاحب کا حکم سنا تو انہوں نے عورتوں اور بچوں کے ہمراہ اپنے اپنے علاقے کی سڑک ہموار کرنا شروع کر دی بلکہ ہموار کرنے کے ساتھ مزید اہتمام یہ کیا کہ سڑک پر پرالی ڈال دی۔ تحصیل دار جب صبح کلر سے راولپنڈی آیا تو اس نے دیکھا کہ تمام سڑک نہ صرف ہموار کر دی گئی ہے بلکہ اس پر پرالی بھی ڈال دی گئی ہے تاکہ مٹی نہ اڑے۔ تحصیل دار نے سڑک کی تیاری کی رپورٹ ڈپٹی کمشنر کو دی۔ ڈپٹی کمشنر حیران تھا کہ یہ کیسے ممکن ہے کہ رات رات میں بارہ میل لمبی سڑک تیار کر دی جائے۔ سہ پہر کو گورنر پنجاب، ڈپٹی کمشنر اور بابا کھیم سنگھ بھی میں راولپنڈی سے کلر روانہ ہوئے تو انہوں نے دیکھا کہ تمام سڑک تیار ہے۔ یہ سب حیران تھے کہ راتوں رات یہ سڑک کیونکر تیار کر لی گئی۔ امیری کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ مانچسٹر اور لنکا شائر کے صنعتی کارخانے اپنے مال پر بابا صاحب اور ان کے بیٹوں کی تصویر چھاپتے تھے تاکہ ان کا مال ہندوستان میں مقبول ہو سکے۔

گورنر پنجاب سر رابرٹ منٹگمری اور ڈونلڈ میکلوڈ نے بابا کھیم سنگھ بیدی کی تعلیم نسواں کے سلسلے میں بے لوث خدمات کی خوب حوصلہ افزائی کی اور انہیں قائل کیا کہ وہ لوگوں پر اپنا اثر و رسوخ استعمال کر کے لوگوں کو تعلیم نسواں کے لیے قائل کریں۔ بابا کھیم سنگھ بیدی نے کمشنر جالندھر کے منعقد کردہ دربار میں ایک زبردست تقریر کی جس کو تمام حاضرین نے بہت پسند کیا۔ انہوں نے لاہور میں سکھوں کا ایک اجلاس بلایا اور اپنی تقریر میں کہا کہ وہ اپنی لڑکیوں کو تعلیم دلائیں۔ بابا کھیم سنگھ نے ضلع راولپنڈی، جہلم اور گجرات میں ۷۵ زنانہ اسکول کھولے۔ جن میں ۱۱۷۲ طالبات تعلیم حاصل کر رہی تھیں بعد میں ان کی تعلیم بڑھ کر ۹ ہزار ہو گئی۔ حکومت نے ان اضلاع میں اسکولوں کے واسطے الگ الگ ناظم مقرر کیے جن کی تقرری کا کلی اختیار بابا صاحب کو تھا۔ ان اسکولوں میں لڑکیوں کو لکھائی، پڑھائی اور حساب کی تعلیم کے ساتھ ساتھ سلائی کڑھائی بھی سکھائی جاتی تھی۔

## ۳

بابا سر کھیم سنگھ بیدی کے مورث اعلیٰ گورو بابا نانک تھے جو سکھ مذہب کے بانی تھے۔ صاحب سنگھ (جن کی تیسری پشت میں بابا کھیم سنگھ بیدی تھے) اوہ ضلع جالندھر میں رہتے تھے۔ ان کی زندگی میں ان کا بڑا بیٹا بشن سنگھ گردونواح (اوہ) میں بہت سے پیروکار ہو جانے کی وجہ سے جالندھر آ گیا اور اس جاگیر پر قابض ہوا جو مہاراجہ رنجیت سنگھ نے صاحب سنگھ کو عطا کی تھی۔ مہاراجہ شیر سنگھ کے زمانے میں بکرم سنگھ نے اپنے بھتیجے عطر سنگھ جو کہ سپورن سنگھ اور کھیم سنگھ دونوں کا باپ تھا لڑائی میں مارڈالا اور جائیداد کے بہت بڑے حصے پر قبضہ کر لیا۔ ۴۹-۱۸۴۸ء کی جنگوں میں سپورن سنگھ اور کھیم سنگھ دربار لاہور سے وفادار رہے اور ان کے چچا بکرم سنگھ انگریزوں کے خلاف تھے۔

الحاق پنجاب (۱۸۴۹ء) کے وقت سپورن سنگھ اور کھیم سنگھ کے قبضے میں جالندھر، ساہیوال (اس وقت ضلع پاکپتن اور بعد میں ضلع منٹگمری کہلایا) تعلقہ بصیر پور اور تعلقہ جھجرہ میں جاگیرات مالیتی ۴۲۷۲۵ روپے کی تھی۔ بابا کھیم سنگھ بیدی بالغ ہوتے ہی سکھ قوم کے گورو مشہور ہوئے۔ انہوں نے پنجاب بھر میں دریائے راوی سے مغرب کی جانب یعنی ملتان سے پشاور تک اقتدار حاصل کیا اور اپنے اثر و رسوخ سے ہمیشہ برطانوی حکومت کے مقاصد کو پورا کرنے میں مدد کی۔ بابا کھیم سنگھ بیدی نے ضلع راولپنڈی کی تحصیل کہوٹہ میں سکونت اختیار کی تاہم وہ زیادہ تر لاہور میں رہائش پذیر رہے۔ کلکتہ یونیورسٹی کے فیلو اور پنجاب یونیورسٹی کالج کے ممبر ہونے کے باعث وہ پنجاب میں تعلیمی معاملات میں کافی سرگرم تھے۔ خصوصاً ضلع جالندھر، لاہور، راولپنڈی اور پشاور ڈویژنوں میں انہوں نے خاص دلچسپی ظاہر کی۔ وہ پنجاب میں انتظامی اور تعلیمی اصلاحات چاہتے تھے۔ وہ اسکولوں میں پرائمری نظام تعلیم سے مطمئن نہ تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ زنانہ اسکولوں کو ڈپٹی کمشنروں کی بجائے مقامی لوگوں کے زیر انتظام رکھا جائے۔ وہ گاؤں کی سطح پر اسکولوں کے معاملات وہاں کی پنچائت کے ذریعے سے چلانے کے خواہاں تھے۔ مروجہ

تعلیمی نصاب کے بارے میں ان کا خیال تھا کہ یہ مقامی لوگوں کی خواہشات کا آئینہ دار نہیں۔ وہ سکولوں میں با مقصد اور عملی تعلیم دینے کے خواہش مند تھے۔ ان کے خیال میں طلبا کو حفظانِ صحت، زراعت اور علم امراض جانوراں کی تعلیم دینی چاہیے۔ بابا صاحب کے نزدیک تعلیم کا مقصد صرف نوکری کا حصول نہ تھا بلکہ وہ لوگوں کی ذہنی نشوونما اور تربیت کے حق میں تھے۔ وہ تعلیم کے معاملے میں مذہبی رواداری اور غیر جانبداری کے قائل تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ جو بھی طالب علم جس بھی مذہب کا پیروہو اسے صرف اس مذہب کی تعلیم دینی چاہیے۔ وہ تعلیم نسواں میں امیر طبقے کی طرف سے دلچسپی نہ لینے پر متردد تھے۔ وہ دیکھ رہے تھے کہ صرف متوسط طبقہ ہی اپنی لڑکیوں کو تعلیم دلوا رہا ہے۔ اس طرح بالائی اور نچلا طبقہ تعلیم کے فوائد سے مستفید نہیں ہو رہا۔ لہٰذا انہوں نے تمام طبقات پر زور دیا کہ وہ اپنی لڑکیوں کو زیورِ تعلیم سے آراستہ کریں۔

۴

بابا کھیم سنگھ سمجھتے تھے کہ پنجاب میں ابھی تک تعلیم نسواں نے وہ ترقی اور مقام حاصل نہیں کیا جو اسے ملنا چاہیے۔ اس لیے وہ چاہتے تھے کہ طلبا کو زیادہ سے زیادہ وظائف اور انعامات دیے جائیں تا کہ وہ تعلیم کی طرف راغب ہوں۔ انہیں یقین تھا کہ اگر خواتین کے اسکول تیز رفتاری سے ترقی کی منازل سر کرتے گئے تو وہ وقت دور نہیں کہ جب پنجابی ماں نہ صرف خود تعلیم یافتہ ہو گی بلکہ اپنے بچوں کو بھی تعلیم حاصل کرتے دیکھ سکے گی۔ بابا کھیم سنگھ کے نزدیک بچوں کی جسمانی نشوونما کے لیے اسکولوں میں جمنیزیم بنانے چاہئیں کیونکہ متوازن زندگی گزارنے کے لیے ایک مضبوط ذہن کے ساتھ ایک مضبوط جسم بھی ضروری ہے۔

وہ مخلوط ذریعہ تعلیم کے حق میں نہ تھے۔ ان کا خیال تھا کہ مخلوط تعلیم صوبے کے لوگوں کے رسم و رواج اور عادات سے لگا نہیں کھاتی۔ اس لیے تعلیم نسواں میں اس کی کوئی گنجائش نہیں۔ ان کے مطابق زنانہ اسکولوں میں اساتذہ کے تقرر کا اختیار مقامی لوگوں کے پاس ہونا چاہیے۔ کیونکہ وہ بہتر طور پر جانتے ہیں کہ ان میں اس قسم کے اساتذہ کی ضرورت ہے۔ انہیں یقین تھا کہ جب تک مقامی لوگوں کو اساتذہ پر اعتماد نہ ہوگا وہ اس وقت تک اپنی لڑکیوں کو اسکولوں میں نہیں بھیجیں گے۔

ان کی نگاہ میں ایک استاد کو اعلیٰ اصولوں کا حامل، نیک اور خدا ترس ہونے کے ساتھ ساتھ اس حد تک تعلیم یافتہ ہونا چاہیے کہ وہ اپنے فرائض منصبی احسن طریقے سے سرانجام دے سکے۔ استاد چاہے مرد ہو یا عورت اس کا کردار اعلیٰ ہونا چاہیے اور خصوصاً لڑکیوں کی تعلیم کے لیے وہ پختہ عمر استاد کو موزوں خیال کرتے تھے۔

۵

بابا کھیم سنگھ ۱۸۷۷ء میں ضلع منٹگمری کے آنریری مجسٹریٹ مقرر ہوئے اور دوسرے سال انہیں ترقی دے کر آنریری جج بنا دیا گیا۔ وہ سکھ نیشنل ایسوی ایشن لاہور کے اعزازی صدر بھی رہے۔ ۱۸۷۹ء میں انہیں سی۔ آئی۔ ای کا خطاب ملا۔ ۱۸۸۲ء میں ان کی خدمات کے عوض ضلع لاہور کی اس جاگیر میں سے جو تاحین حیات ان کے نام تھی ۲۵۰۰ روپے کی ایک جاگیر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے عطا کر دی گئی اور بھیر پور کے علاقے سے آنے والی ۱۸۰۰ روپے کی رقم جسے ان کی وفات پر ضبط ہو جانا تھا متواتر دو پشتوں کے لیے جاری رہنا قرار پائی۔ ۱۸۸۷ء میں بابا جی کو حکومت نے ضلع منٹگمری میں ۱۱۸۰۰ ایکڑ اراضی کا ایک اضافی رقبہ عطا کیا۔ وہ پنجاب کی پہلی لیجسلیٹو کونسل جو ۱۸۹۷ء میں وجود میں آئی، کے رکن بھی رہے۔ حکومت ہند نے ان کی نمایاں خدمات کے اعتراف میں ۱۸۹۸ء میں انہیں کے۔ سی۔ آئی۔ ای کے خطاب سے بھی نوازا۔ ۱۹۰۴ء میں ان کا انتقال ہوا اور ان کے سب سے بڑے بیٹے بابا گورنجش سنگھ بیدی ان کے جانشین بنے۔

# پانچ کتابوں کا جائزہ

ڈاکٹر انور سدید

## نئے چراغ نئے گلے

اردو ادب میں محترمہ نثار عزیز بٹ کو یہ اہمیت حاصل ہے کہ انہوں نے زندگی کی چھوٹی چھوٹی قاشوں پر مختصر افسانے لکھنے کی بجائے اپنی سوچ کو وقت کے تناظر میں پھیلانے، زندگی کی وسعت کو سمیٹنے اور معاشرے کے ''کل'' پر گہری تجزیاتی، مشاہداتی اور بڑی حد تک نظریاتی نظر ڈالنے کی کوشش کی اور ''نگری نگری پھرا مسافر'' ...... ''نئے چراغ نئے گلے'' ...... ''کاروان وجود'' اور ''دریا کے سنگ'' جیسے ناول لکھے جن کا کینوس زمانی اور مکانی لحاظ سے وسیع ہے۔ انہوں نے واقعات اور کرداروں کے حوالے سے معاشرے کے تہذیبی تناظر کو ماضی سے زمانہ حال کے ایک مخصوص دور تک لانے کی کاوش کی اور تاریخ کو ایک اہم حوالہ بنایا۔ چنانچہ انہیں اردو کے ان معدودے چند ''فکشن رائٹرز'' میں شمار کرنا چاہیے جنہوں نے اپنے ہمہ جہت اور متنوع اظہار کے لیے صرف ناول کے فن پر انحصار کر کے اپنی انفرادیت کا ایک مستحکم نقش قائم کیا۔ بلاشبہ وہ اردو ادب کی ایک اہم ناول نگار ہیں اور ان کے فن کے زاویے منفرد ہیں۔ محترمہ نثار عزیز بٹ کا پہلا ناول ''نگری نگری پھرا مسافر'' ساٹھ کی دہائی میں شائع ہوا تھا۔

ان کا دوسرا ناول ''نئے چراغ نئے گلے'' ۱۹۷۳ء میں شائع ہوا اور اسے مصنفہ کا وہ نقش شمار کیا گیا جو پہلے سے بہتر تھا۔ اس ناول میں برصغیر کی تاریخ کو پس منظر کے طور پر استعمال کیا گیا تھا۔ سات برس کے بعد معروف نقاد شہزاد منظر نے ۱۹۷۰ء تا ۱۹۸۰ء کی دہائی میں لکھے جانے والے ناول کا جائزہ پیش کیا تو اعتراف کیا کہ...... ''نثار عزیز بٹ نے یہ ناول بڑے کینوس میں لکھا ہے جس کا موازنہ پاکستان کے بہت کم ناولوں سے کیا جا سکتا ہے''۔

ناول ''نئے چراغ نئے گلے'' کا تہذیبی، معاشرتی اور سیاسی تناظر اگرچہ ۱۸۵۷ء سے شروع ہوتا ہے اور اس پس منظر کی اس ناول میں بہت اہمیت بھی ہے لیکن درحقیقت یہ ناول آزادی کے اس دور کا مظہر ہے جو ہندوستان میں سائمن کمشن کی آمد سے شروع ہوا تھا اور سول نافرمانی کی تحریک نے جسے ایک طغیانی رو بنا دیا تھا۔ نثار عزیز بٹ نے آزادی کی اس تحریک کو شمال مغربی سرحدی صوبہ کی فعال معاشرتی زندگی سے ابھارا ہے۔ ناول میں حقیقت کی دو روئیں پہلو بہ پہلو چلتی ہیں، ایک رو معاشرتی نوعیت کی ہے جو ناول کو رومانوی لطافت اور جاذبیت عطا کرتی ہے۔ یہ رو تین نسلوں میں یکساں طور پر چلتی نظر آتی ہے اور دونوں قوموں کے نوجوانوں کی محبت کے چراغ روشن کرتی ہے۔ دوسری رو سیاسی نوعیت کی ہے اور یہ سول نافرمانی کی تحریک سے شروع ہو کر دو قومی نظریے کے فروغ اور آزادی کی منزل تک آتی ہے۔ دونوں صورتوں میں نثار عزیز بٹ نے اپنے مطالعے، عینی مشاہدے اور ذہنی تجزیے کا عمدہ ثبوت دیا ہے۔

نثار عزیز بٹ نے اس ناول میں تین نسلوں کی کہانی پیش کی ہے۔ پہلی نسل میں حبیب اللہ خاں، عثمان علی، خانم، جمال افروز، دیوان چند اور ضیاء اللہ اہم کردار ہیں۔ مجموعی طور پر یہ ایسا خاندانی معاشرہ ہے جس پر خانم کی حکمرانی ہے لیکن اس کا احوال

سے ہی ضیاء اللہ رونما ہوتا ہے جو تبدیلی کا مظہر ہے۔ اس فضا میں شار عزیز بٹ کا تجزیہ کچھ یوں ہے:

''تاریخ کی شطرنج پر مہروں کی طرح بے بس اور آزاد سیاسی راہنما وقت کے تقاضوں کے مطابق اپنی چالیں چلنے پر مجبور تھے''۔

کانگرس کی یک قومی سیاست کے تناظر میں محمد علی جناح مہاتما گاندھی کو مخاطب کر کے کہہ رہے تھے اور ان کا رخ سروجنی نائیڈو کی طرف بھی تھا:

''مجھے آپ سے اختلاف ہے، ہم ایک قوم نہیں ہیں، برطانیہ کی حکومت نے ہمیں عارضی طور پر ایک قوم بنا دیا ہے لیکن بنیادی طور پر ہمارے اختلافات بہت اہم ہیں''۔

مہاتما گاندھی پرزور احتجاج کرتے ہوئے کہتے ہیں: ''اگر مذہب قومیت کی بنا بن جائے گا تو پھر ہندوستان میں کئی قومیں ہیں۔ ہندو، مسلم، سکھ، عیسائی، پارسی ..... اس لحاظ سے تو پھر صوبوں کے اندر ضلع وار خود مختاری دینی پڑے گی۔ یہ سکھ ضلع ہے۔ یہ پارسی گاؤں ہے۔ یہ عیسائی محلہ ہے''۔

گاندھی کے اس احتجاج پر سر ظفر اللہ اور محمد علی جناح مایوسی سے ایک دوسرے کی طرف دیکھتے ہیں۔ جناح کہتے ہیں ..... ''تو پھر افسوس ہے ہمیں اختلاف پر اتفاق کرنا پڑے گا''۔

یک قومی نظریے کے اختلاف پر محمد علی جناح نے جو ''اتفاق'' کیا تھا اور دو قومی نظریے کے اثبات پر جس ثابت قدمی اور مستقل مزاجی کا ثبوت دیا تھا، اس کا نتیجہ ہی پاکستان کی صورت میں سامنے آیا جو ناول کے آخری باب میں خون کا دریا عبور کرنے کے بعد معرض وجود میں آ جاتا ہے۔ اس وقت ناول کی تیسری نسل روبہ منظر آ چکی ہوتی ہے۔ اس نسل کے کرداروں میں سراج، عالیہ، درشہوار، نوشابہ اور سارہ ہیں۔ دوسری نسل کے کرداروں میں خورشید، منیر، پدمنی، من موہن اور فرخندہ ہیں۔ یہ تشکیل وتحریک پاکستان کا دور ہے ہندوستان کی دستور ساز اسمبلی کے انتخابات کے تناظر میں پروان چڑھتا اور کانگرس اور مسلم لیگ کے اثرات کو ابھارتا ہے۔

مجموعی طور پر جو تین نسلیں سامنے آئی ہیں ان میں سے اول الذکر کی سوچ میں توازن، اعتدال اور ٹھہراؤ نمایاں ہے۔ اس میں حوصلہ، بردباری اور دوسروں کو برداشت کرنے کی صلاحیت زیادہ ہے۔ مسلمان گھرانوں پر تصوف کے اثرات بھی متاثر کرتے ہیں۔ دوسری نسل کی سوچ سیاسی ہے تاہم بعض نوجوان سرکاری ملازمت میں مستقبل کے اعلیٰ خواب دیکھ رہے ہیں اور لندن اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لیے جاتے ہیں تو زوال مغرب کا احساس بھی بیدار کرتے ہیں، ناول کا یہ حصہ اس لحاظ سے اہم ہے کہ اس میں مشرق کی تقدیس کا زاویہ نمایاں ہے اور قدروں کی عظمت فروغ پاتی ہے۔ تیسری نسل گاندھی اور نہرو کی یک قومی تھیوری اور قائداعظم محمد علی جناح کے دو قومی نظریے میں پروان چڑھتی ہے اور متحدہ ہندوستان سے جمہوری عمل اور ووٹ کی قوت سے پاکستان کے قیام کی راہ ہموار کرتی ہے۔ میرا خیال ہے کہ اس نسل کی نمائندہ خود شار عزیز بٹ بھی ہیں۔

میں نے یہ ناول کم وبیش بیس پچیس برس کے بعد دوبارہ پڑھا تو اس کے پس منظر اور پیش منظر، واقعات کے تسلسل اور اسلوب نے مجھے بہت متاثر کیا۔ یہ اسلوب سادہ لیکن داخلی قوت سے معمور ہے۔ اس قوت نے ہی ناول کے بیانیہ کو زوردار بنایا ہے۔ بلاشبہ ''نے چراغے نے گلے'' اردو ادب کا ایک اہم ناول ہے۔ جس کا مطالعہ ہماری نوجوان نسل کے لیے چشم کشا ثابت ہوگا۔ اس ناول کی ضخامت ۴۷۸ صفحات ہے۔ قیمت ۳۰۰ روپے۔ اس کے ناشر احمر اشعر پبلشرز ۳۵۔ بی مین روڈ لاہور ہیں۔

یہ ناول مکتبہ ''نوائے وقت'' لاہور میں سے بھی دستیاب ہے۔

## رائدین جدیدیت

تیرہ سال قبل ڈاکٹر فہیم اعظمی نے کراچی سے ایک نیا ماہنامہ ''صریر'' کے نام سے جاری کیا تو جدیدیت کے دو راہنما رسائل ''اوراق'' (مدیر: وزیر آغا) اور ''شب خون'' (مدیر: شمس الرحمٰن فاروقی) اپنی زندگی اور نصف العین کی ربع صدی پوری کرنے کے قریب تھے۔ یہ دونوں رسائل لاہور اور الہ آباد سے ۱۹۶۶ء میں بیک وقت شائع ہونا شروع ہوئے تھے۔ دونوں نے ادب کو ترقی پسند ''کلیشے'' سے نجات دلانے کی کوشش کی اور تخلیقی ادب کی ایک نئی کھڑکی کھول دی تاکہ اس راستے سے تازہ ہوائیں آزادی سے آئیں اور مضامین نو کے علاوہ مصنفین نو کے لیے تعارف کا نیا وسیلہ فراہم کر دیں، ۱۹۸۰ء کی دہائی کے آخر میں ماہنامہ ''صریر'' اپنے انوکھے نام کی وجہ سے اجنبی نظر آ رہا تھا لیکن وہ اپنا اپنا انداز اپنے ساتھ لے کر آیا اور تھوڑے سے عرصے میں اس نے برصغیر ہندو پاک کے ادیبوں کی توجہ اپنی طرف مبذول کرالی۔ سالنامہ ''صریر'' ۲۰۰۲ء میں، جو اس رسالے کی چودھویں جلد کا آغاز یہ ہے، فہیم اعظمی صاحب واضح کیا ہے کہ:

''زمانہ حال کو ماضی کا تسلسل سمجھتے ہوئے ہمیں ماضی اور حال دونوں سے استفادہ کرنا چاہیے اور جدلیات کے اس اصول کو مدنظر رکھنا چاہیے کہ ہر دور کے نظریات، فکری جہات اور اصولوں کو تھیسس Thesis اور اینٹی تھیسس (Anti Thesis) کے پروسس (Process) سے گزر کر سنتھسس (Synthesis) کے دور میں داخل ہونا ہوتا ہے''۔

اہم بات یہ ہے کہ ''صریر'' نے روز اول سے لے کر اب تک اس موقف کو ہی فروغ دیا اور ماضی کی روایت کو شکستہ کرنے کی بجائے اس کا انضمام مستقبل کے نئے ترقی یافتہ تجربے سے کیا۔ ڈاکٹر فہیم اعظمی نے اس رویے کو اولاً ماہنامہ ''صریر'' کے اداریوں میں ابھارنے کی سعی مسلسل کی اور ثانیاً ایک نیا سلسلہ ''رائدین جدیدیت'' جاری کیا جس میں ادب کے ان پائینرز (Pioneers) کو بازیافت کیا جاتا تھا، جنہوں نے ذہنی تجدد اور فکری تنوع سے نئے خیال کو فروغ دیا اور کسی مخصوص ادبی تحریک کا بانی شمار ہونے کی بجائے ادب کے جدید رویوں کو اپنی ذاتی مساعی سے متعارف کرانے کی سعی کی۔ فہیم اعظمی کی اس عطا کا ابتدا میں ہی اعتراف ضروری ہے کہ انہوں نے لفظ ''پائینیر'' کی اردو میں سابقہ مقبولیت کے باوجود اس کے متبادل لفظ ''رائد'' کو متعارف کرانے کی طرح ڈالی اور اب یہ لفظ انہیں کی اختراع شمار ہوتا ہے۔ فہیم اعظمی کی جدیدیت نواز اور جدیدیت انگیز اداریوں کی دو کتابیں شائع ہو چکی ہیں اور مؤخر الذکر قسم کے تحقیقی اور تنقیدی مضامین کی کتاب ''رائدین جدیدیت'' چھپ کر منظر عام پر آ گئی ہے تو یہ بلاتردد نہ صرف ایک اہم کارنامہ ہے بلکہ غیر جانبدار اور غیر متعصب قاری اسے الطاف حسین حالی، امداد امام اثر، محمد حسن عسکری، ڈاکٹر وزیر آغا، شمس الرحمٰن فاروقی اور گوپی چند نارنگ کی طرح ڈاکٹر فہیم اعظمی صاحب کو بھی ایک رائد (Pioneer) شمار کرنے میں تامل نہیں کرے گا۔ انہوں نے جدیدیت کے فروغ کے لیے قوسوں کو توڑنے کی بجائے انہیں جوڑنے اور ماضی کی روایت سے تعلق اور ربط قائم رکھنے کی سعی کی ہے۔ ہر چند یہ رویہ ہمارے ہاں نامقبول نہیں، لیکن فہیم اعظمی نے اس کی عملی صورت کو نہ صرف مستحکم کیا بلکہ جدیدیت کے بکھرے ہوئے نقوش کو چوتھی صدی عیسوی سے بازیافت کر کے ہمیں اپنے بعض مفروضوں پر نظر ثانی کی دعوت بھی دی اور بعض خود ساختہ ''بانیاں ادب'' کو اپنی حیثیت کو جگنوؤں کی اس روشنی میں قائم کرنے کی دعوت دی جو اب چکا چوند اجالے میں نظر نہیں آتے۔

ڈاکٹر فہیم اعظمی کے نزدیک ''جدید'' سے مراد کوئی خاص تھیوری یا تحریک نہیں بلکہ وہ ذہنی اور فکری رویہ ہے جس نے ہمیں ادب میں آگے بڑھنے کا راستہ دکھایا۔ انہوں نے اس کتاب میں اس جدید عنصر کو ابھارا ہے جو ایک ستارے کی صورت میں کسی مفکر ادیب کے ہاں پہلی مرتبہ چمکا تھا اور پھر اپنی روشنی سے تاریکی کو لمحہ بھر کے لیے منور کرنے کے بعد غائب ہو گیا، اس ضمن میں اعظمی صاحب کا موقف بڑا واضح ہے کہ:

''جدید اور انقلابی رجحانات کے پیش رو کو اکثر اپنی طبعی زندگی میں اہمیت حاصل نہیں ہوتی لیکن ان کی طبعی عمر کے بعد اور بہت بعد وہ ''رائد'' کی حیثیت میں ابھرتے ہیں''۔

اس ضمن میں انہوں نے ہولڈرلن کی مثال دی ہے جسے سو سال کے بعد دریافت کیا گیا تو فلسفی مارٹن ہائیڈگر نے اسے شاعروں کا شاعر قرار دیا، اور جدید شاعری کا جوہر ہولڈرلن کے فن پاروں سے بازیافت کیا۔ ہمارے ہاں معروف ترین مثال نظیر اکبر آبادی کی ہے جسے اس کے اپنے دور نے نظر انداز کر دیا تھا لیکن بیسویں صدی میں ترقی پسند شاعری کے زمانے میں اسے زمین اور انسان سے جڑا ہوا تسلیم کیا گیا اور وہ ایک اہم رائد شمار ہوا۔ یہاں اعظمی صاحب نے اپنا نقطہ نظر ایک مرتبہ پھر واضح کر دیا ہے کہ:

''جدیدیت کے معنی روایت اور تاریخ کو بھلانا یا مٹانا نہیں بلکہ یہ دیکھنا بھی ہے کہ ہم سے پہلے کتنے لوگوں نے بہتے ہوئے دھارے کے خلاف تیرنے کی کوشش کی اور ہمارے لیے مثال چھوڑ گئے''۔

اکیسویں صدی کے آغاز میں جب ہم سابقہ صدیوں کی کئی اہم ترین مثالوں کو وقت کی گرد میں گم کر چکے ہیں تو، یہ کتاب احساس دلاتی ہے کہ روشنی کا بہت بڑا ماخذ تو ہمارے عقب میں موجود ہے جس سے پورا استفادہ نہ کر کے ہمارا عہد نہ صرف خود فریبی میں مبتلا ہے بلکہ اپنے آپ سے دھوکا بھی کر رہا ہے۔ چنانچہ کیا یہ بات عجیب نہیں کہ وجودیت کے تذکرے میں نطشے، ارنسٹ ہیوم کے مارٹن ہیڈگر اور سارتر وغیرہ کا ذکر تو افراط سے ہوتا ہے لیکن چوتھی صدی کے روم کے مفکر سینٹ آگسٹین اور اٹھارویں صدی کے جرمنی کے مفکر ہولڈرلن کا ذکر تاریخ کے دھارے میں گم کر دیا جاتا ہے۔ اس کتاب میں ۱۲۴ رائدین کا تذکرہ کیا گیا ہے جن میں سے ایک سو کے لگ بھگ بیرونی ممالک اور دوسری زبانوں کے ادیب ہیں۔ زمانی اعتبار سے ان رائدین کی پیدائش کا زمانہ ۳۴۵ عیسوی سے شروع ہوتا اور ۱۹۳۲ء تک آتا ہے۔ آغاز سینٹ آگسٹین سے ہوتا ہے جنہوں نے وجودیت کو اپنا نرید مارک بنائے بغیر اس فلسفے کے خدوخال ابتدائی زمانے میں تراشے، دوسرا اہم مصنف مائیکل ڈی مانٹین ہے، انہوں نے سولہویں صدی میں فرانس میں ''ایسے'' کو فروغ دیا، جس کی نشاۃ ثانیہ پاکستان میں بیسویں صدی کے وسط میں ''انشائیہ'' کے نام سے کی گئی اور اس کا اعزاز ڈاکٹر وزیر آغا کو دیا گیا۔ ڈاکٹر فہیم اعظمی نے وزیر آغا کو ''اردو ادب میں انشائیہ کی صنف کا بانی'' شمار کیا ہے تاہم انہوں نے اس ضمن میں سرسید احمد خان کے مقام فضیلت کو بھی قائم رکھا ہے۔ غیر ملکی مصنفین کا اختتام جیکس دریدا اور جان ایڈائیک پر ہوتا ہے۔ اول الذکر کو ساختیات کی تھیوری کی وجہ سے رائد کی حیثیت حاصل ہے اور جان ایڈائیک نے اپنی کہانیوں میں اساطیری، روحانی، روزمرہ کی زندگی اور نفسیاتی الجھنوں کو علامتی روپ دے کر جدید فکشن کو بے پناہ وسعت اور معنویت دی اور رائد کا مقام حاصل کیا۔ اس مختصر تبصرے میں سب مصنفین اور ان کی رائدیت کا اظہار ممکن نہیں۔ تاہم جدید روسی ادب میں الگزینڈر پشکن، نثری نظم میں مارس ڈی گورن، علامت نگاری میں بودلیر، ادب میں معنی کے بجائے ہیئت پر زور دینے کے لیے پال ورلین اور ان کے علاوہ نطشے، موپساں، فرائد، ہرمن ہیس، کافکا، ایلیٹ، فاکنر، آئی اے رچرڈز، آندرے مارلو، آرویل، سارتر اور ساختیاتی فکر کے جدید تر دور کے بانی کلاڈ لیوی سٹراس کا ذکر، حالات حیات، ادبی کارناموں اور فکری زاویوں کا ذکر مربوط، بامعنی اور استدلالی انداز میں اس طرح کیا گیا ہے کہ انہیں اپنے کسی ایک مخصوص زاویے کا رائد تسلیم کرنے میں کوئی عذر نظر نہیں آتا۔

ڈاکٹر فہیم اعظمی نے اس فکری اور نظری کتاب میں اردو ادب اور ادیبوں کی اہمیت قائم رکھنے اور عالمی مفکروں کے ساتھ ان کا مقام امتیاز قائم رکھنے کی سعی بھی کی ہے۔ اس ضمن میں نظیر اکبر آبادی کو غیر کلاسیکی شاعری کا موجد اور روایتی شاعری کا پہلا منحرف قرار دیا گیا ہے۔ غالب کو تخیل کی جدت طرازی، شعر میں کثیر المعنویت اور جدید مراسلہ نگاری کا رائد شمار کیا گیا ہے۔ اس حصے میں محمد حسین آزاد، الطاف حسین حالی، اکبر الہ آبادی، پریم چند، علامہ اقبال، میراجی، وزیر آغا، قمر جمیل، گوپی چند نارنگ، محمد حسن عسکری اور شمس الرحمٰن فاروقی کے علاوہ مزید ایک درجن رائد بھی شامل ہیں لیکن یہ سلسلہ ابھی جاری ہے اور توقع کی جا سکتی ہے کہ فہیم اعظمی صاحب اپنی تحقیق کی روشنی میں اس فہرست میں مزید اضافہ کرتے چلے جائیں گے۔ بقول اقبال:

ہر چند کہ ایجادِ معانی ہے خدا داد　　کوشش سے کہاں مرد ہنر مند ہے آزاد

علمی اور فکری لحاظ سے یہ اپنی نوعیت کی ایک منفرد کتاب ہے جو حضرت علی رضی اللہ عنہ کے اس پیغام عالیہ سے آغاز کرتی ہے۔

''ہو علم کے لیے ہر وقت باحث و جویا''

کتاب کا انتساب ڈاکٹر وزیر آغا کے نام ہے جو فہیم اعظمی صاحب کے بقول ''اردو ادب میں فکری اور علمی تازگی کے علمبردار ہیں'' میں اس تالیف کو اکیسویں صدی کی پہلی معرکہ آرا کتاب شمار کرتا ہوں جو مؤلف کی علمی لگن، ادبی جستجو اور کشادہ نظری کی آئینہ دار ہے۔

## حیات جاوید

''حیات جاوید'' برصغیر کے اس مرد فرید کی داستان حیات ہے جس کی زندگی کا آغاز علم و ادب کے گہوارے میں ہوا تھا لیکن جب وہ عمل کی دنیا میں داخل ہوئے تو انہوں نے انگریزی سرکار کی ملازمت اختیار کر لی جو انیسویں صدی میں آہستہ آہستہ سلطنت مغلیہ پر غالب آ چکی تھی، یہ سرسید احمد خان تھے جو ۱۷ اکتوبر ۱۸۱۷ء کو دہلی میں ایک حسینی سید خاندان میں پیدا ہوئے اور تاریخ مسلمانان پاک و ہند میں سرسید احمد خان کے نام سے معروف و ممتاز ہوئے۔ ان کی بسم اللہ شاہ غلام علی رحمۃ اللہ علیہ نے پڑھائی تھی۔ والد میر تقی کو اکبر شاہ کے دربار سے ہر سال تاریخ جلوس پر خلعت ملتی تھی، جو بعد میں سرسید کو عطا ہونے لگی۔ ایک مرتبہ عطائیگی خلعت کے دربار میں دیر سے پہنچے۔ اکبر شاہ بادشاہ نے پوچھا تو آداب بجا لا کر کہا کہ ''سو گیا تھا'' بادشاہ مسکرائے، خلعت عطا کی اور کہا ''بہت سویرے اٹھا کرو''۔ والد کی وفات کے بعد انہوں نے انگریزی سرکار کی ملازمت اختیار کر لی، قلعہ معلی سے تعلق ٹوٹنے کے بعد یہ ''خواب استراحت'' تھا جو اس وقت ٹوٹا جب لال قلعہ پر انگریزی حکومت کا پرچم لہرا رہا تھا اور بہادر شاہ ظفر معزول ہو کر رنگون بھیج دیے گئے تھے۔ سرسید احمد خان دیر سے جاگے لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ قوم کی دردمندی نے پھر انہیں سونے نہ دیا اور پھر وہ اس قوم کو بیدار اور فعال کرنے میں مصروف ہو گئے جس نے برصغیر پر صدیوں حکمرانی کی تھی اور اب غلام بنا دی گئی تھی۔

سرسید نے اس حقیقت کو بھانپ لیا تھا کہ مسلمانوں کی ترقی کے لیے علوم نو کا حصول ضروری ہے۔ انہوں نے علی گڑھ میں ایک چھوٹے سے مدرسے کی بنیاد رکھی جو آہستہ آہستہ مدرسۃ العلوم بن گیا، علی گڑھ یونیورسٹی سے ہی یہ احساس بیدار ہوا کہ ہندو اور مسلمان دو الگ الگ قومیں ہیں۔ ان کی الگ الگ تہذیبیں ہیں اور ان کا باہم مل کر زندگی کرنا ممکن نہیں، پاکستان سرسید کا خواب نہیں تھا لیکن اس کے دو قومی تصور کا ابتدائی بیج ان کے نہاں خانہ خیال سے پیدا ہوا اور پھر ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو قائداعظم محمد علی جناح نے پاکستان کو وجود میں لا کر اس کی تعبیر تصور اقبال کی روشنی میں کر دی۔

ڈاکٹر فہیم اعظمی کے نزدیک ''جدید'' سے مراد کوئی خاص تھیوری یا تحریک نہیں بلکہ وہ ذہنی اور فکری رویہ ہے جس نے ہمیں ادب میں آگے بڑھنے کا راستہ دکھایا۔ انہوں نے اس کتاب میں اس جدید عنصر کو ابھارا ہے جو ایک ستارے کی صورت میں کسی مفکر ادیب کے ہاں پہلی مرتبہ چمکا تھا اور پھر اپنی روشنی سے تاریکی کو لمحہ بھر کے لیے منور کرنے کے بعد غائب ہو گیا۔ اس ضمن میں اعظمی صاحب کا موقف بڑا واضح ہے کہ:

''جدید اور انقلابی رجحانات کے پیش رو کو اکثر اپنی طبعی زندگی میں اہمیت حاصل نہیں ہوتی لیکن ان کی طبعی عمر کے بعد اور بہت بعد وہ ''رائد'' کی حیثیت میں ابھرتے ہیں''۔

اس ضمن میں انہوں نے ہولڈرلن کی مثال دی ہے جسے سو سال کے بعد دریافت کیا گیا تو فلسفی مارٹن ہائیڈگر نے اسے شاعروں کا شاعر قرار دیا، اور جدید شاعری کا جوہر ہولڈرلن کے فن پاروں سے بازیافت کیا۔ ہمارے ہاں معروف ترین مثال نظیر اکبر آبادی کی ہے جسے اس کے اپنے دور نے نظر انداز کر دیا تھا لیکن بیسویں صدی میں ترقی پسند شاعری کے زمانے میں اسے زمین اور انسان سے جڑا ہوا تسلیم کیا گیا اور وہ ایک اہم رائد شمار ہوا۔ یہاں اعظمی صاحب نے اپنا نقطہ نظر ایک مرتبہ پھر واضح کر دیا ہے کہ:

''جدیدیت کے معنی روایت اور تاریخ کو بھلانا یا مٹانا نہیں بلکہ یہ دیکھنا بھی ہے کہ ہم سے پہلے کتنے لوگوں نے بہتے ہوئے دھارے کے خلاف تیرنے کی کوشش کی اور ہمارے لیے مثال چھوڑ گئے''۔

اکیسویں صدی کے آغاز میں جب ہم سابقہ صدیوں کی کئی اہم ترین مثالوں کو وقت کی گرد میں گم کر چکے ہیں تو، یہ کتاب احساس دلاتی ہے کہ روشنی کا بہت بڑا ماخذ تو ہمارے عقب میں موجود ہے جس سے پورا استفادہ نہ کر کے ہمارا عہد نہ صرف خود فریبی میں مبتلا ہے بلکہ اپنے آپ سے دھوکا بھی کر رہا ہے۔ چنانچہ کیا یہ بات عجیب نہیں کہ وجودیت کے تذکرے میں نطشے، ارنسٹ ہیوم کے مارٹن ہیڈگر اور سارتر وغیرہ کا ذکر تو افراط سے ہوتا ہے لیکن چوتھی صدی کے روم کے مفکر سینٹ آگسٹین اور اٹھارویں صدی کے جرمنی کے مفکر ہولڈرلن کا ذکر تاریخ کے دھارے میں گم کر دیا جاتا ہے۔ اس کتاب میں ۱۲۴ رائدین کا تذکرہ کیا گیا ہے جن میں سے ایک سو کے لگ بھگ بیرونی ممالک اور دوسری زبانوں کے ادیب ہیں۔ زمانی اعتبار سے ان رائدین کی پیدائش کا زمانہ ۳۴۵ عیسوی سے شروع ہوتا اور ۱۹۳۲ء تک آتا ہے۔ آغاز سینٹ آگسٹین سے ہوتا ہے جنہوں نے وجودیت کو اپنا ٹریڈ مارک بنائے بغیر اس فلسفے کے خدوخال ابتدائی زمانے میں تراشے، دوسرا اہم مصنف مائیکل ڈی مانٹین ہے، انہوں نے سولہویں صدی میں فرانس میں ''ایسے'' کو فروغ دیا، جس کی نشاۃ ثانیہ پاکستان میں بیسویں صدی کے وسط میں ''انشائیہ'' کے نام سے کی گئی اور اس کا اعزاز ڈاکٹر وزیر آغا کو دیا گیا۔ ڈاکٹر فہیم اعظمی نے وزیر آغا کو ''اردو ادب میں انشائیہ کی صنف کا بانی'' شمار کیا ہے تاہم انہوں نے اس ضمن میں سرسید احمد خان کے مقام فضیلت کو بھی قائم رکھا ہے۔ غیر ملکی مصنفین کا اختتام جیکس دریدا اور جان اپڈائیک پر ہوتا ہے۔ اول الذکر کو ساختیات کی تھیوری کی وجہ سے رائد کی حیثیت حاصل ہے اور جان اپڈائیک نے اپنی کہانیوں میں اساطیری، روحانی، روزمرہ کی زندگی اور نفسیاتی الجھنوں کو علامتی روپ دے کر جدید فکشن کو بے پناہ وسعت اور معنویت دی اور رائد کا مقام حاصل کیا۔ اس مختصر تبصرے میں سب مصنفین اور ان کی رائدیت کا اظہار ممکن نہیں۔ تاہم جدید روسی ادب میں الگزینڈر پشکن، نثری نظم میں مارس ڈی گوئرن، علامت نگاری میں بودلیر، ادب میں معنی کے بجائے ہیئت پر زور دینے کے لیے پال ورلین اور ان کے علاوہ نطشے، موپساں، فرائد، ہرمن ہیس، کافکا، ایلیٹ، فاکنر، آئی اے رچرڈز، آندرے مارلو، آرویل، سارتر اور ساختیاتی فکر کے جدید تر دور کے بانی کلاڈ لیوی سٹراس کا ذکر، حالات حیات، ادبی کارناموں اور فکری زاویوں کا ذکر مربوط، بامعنی اور استدلالی انداز میں اس طرح کیا گیا ہے کہ انہیں اپنے کسی ایک مخصوص زاویے کا رائد تسلیم کرنے میں کوئی عذر نظر نہیں آتا۔

ڈاکٹر فہیم اعظمی نے اس فکری اور نظری کتاب میں اردو ادب اور ادیبوں کی اہمیت قائم رکھنے اور عالمی مفکروں کے ساتھ ان کا مقام امتیاز قائم رکھنے کی سعی بھی کی ہے۔ اس ضمن میں نظیر اکبر آبادی کو غیر کلاسیکی شاعری کا موجد اور روایتی شاعری کا پہلا منحرف قرار دیا گیا ہے۔ غالب کو تخیل کی جدت طرازی، شعر میں کثیر المعنویت اور جدید مراسلہ نگاری کا رائد شمار کیا گیا ہے۔ اس حصے میں محمد حسین آزاد، الطاف حسین حالی، اکبر الہ آبادی، پریم چند، علامہ اقبال، میراجی، وزیر آغا، قمر جمیل، گوپی چند نارنگ، محمد حسن عسکری اور شمس الرحمن فاروقی کے علاوہ مزید ایک درجن رائد بھی شامل ہیں لیکن یہ سلسلہ ابھی جاری ہے اور توقع کی جا سکتی ہے کہ فہیم اعظمی صاحب اپنی تحقیق کی روشنی میں اس فہرست میں مزید اضافہ کرتے چلے جائیں گے۔ بقول اقبال:

ہر چند کہ ایجادِ معانی ہے خدا داد　　کوشش سے کہاں مرد ہنر مند ہے آزاد

علمی اور فکری لحاظ سے یہ اپنی نوعیت کی ایک منفرد کتاب ہے جو حضرت علی رضی اللہ عنہ کے اس پیغام عالیہ سے آغاز کرتی ہے۔

''ہو علم کے لیے ہر وقت باحث و جویا''

کتاب کا انتساب ڈاکٹر وزیر آغا کے نام ہے جو فہیم اعظمی صاحب کے بقول ''اردو ادب میں فکری اور علمی تازگی کے علمبردار ہیں'' میں اس تالیف کو اکیسویں صدی کی پہلی معرکہ آرا کتاب شمار کرتا ہوں جو مؤلف کی علمی لگن، ادبی جستجو اور کشادہ نظری کی آئینہ دار ہے۔

## حیات جاوید

''حیات جاوید'' برصغیر کے اس مرد فرید کی داستان حیات ہے جس کی زندگی کا آغاز علم و ادب کے گہوارے میں ہوا تھا لیکن جب وہ عمل کی دنیا میں داخل ہوئے تو انہوں نے انگریزی سرکار کی ملازمت اختیار کر لی جو انیسویں صدی میں آہستہ آہستہ سلطنت مغلیہ پر غالب آ چکی تھی، یہ سرسید احمد خان تھے جو ۱۷ اکتوبر ۱۸۱۷ء کو دہلی میں ایک حسینی سید خاندان میں پیدا ہوئے اور تاریخ مسلمانان پاک و ہند میں سرسید احمد خان کے نام سے معروف و ممتاز ہوئے۔ ان کی بسم اللہ شاہ غلام علی رحمۃ اللہ علیہ نے پڑھائی تھی۔ والد میر تقی کو اکبر شاہ کے دربار سے ہر سال تاریخ جلوس پر خلعت ملتی تھی، جو بعد میں سرسید کو عطا ہونے لگی۔ ایک مرتبہ عطائیگی خلعت کے دربار میں دیر سے پہنچے۔ اکبر شاہ بادشاہ نے پوچھا تو آداب بجا لا کر کہا کہ ''سو گیا تھا'' بادشاہ مسکرائے، خلعت عطا کی اور کہا ''بہت سویرے اٹھا کرو''۔ والد کی وفات کے بعد انہوں نے انگریزی سرکار کی ملازمت اختیار کر لی، قلعہ معلی سے تعلق ٹوٹنے کے بعد یہ ''خواب استراحت'' تھا جو اس وقت ٹوٹا جب لال قلعہ پر انگریزی حکومت کا پرچم لہرا رہا تھا اور بہادر شاہ ظفر معزول ہو کر رنگون بھیج دیے گئے تھے۔ سرسید احمد خان دیر سے جاگے لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ قوم کی دردمندی نے پھر انہیں سونے نہ دیا اور پھر وہ اس قوم کو بیدار اور فعال کرنے میں مصروف ہو گئے جس نے برصغیر پر صدیوں حکمرانی کی تھی اور اب غلام بنا دی گئی تھی۔

سرسید نے اس حقیقت کو بھانپ لیا تھا کہ مسلمانوں کی ترقی کے لیے علوم نو کا حصول ضروری ہے۔ انہوں نے علی گڑھ میں ایک چھوٹے سے مدرسے کی بنیاد رکھی جو آہستہ آہستہ مدرسۃ العلوم بن گیا، علی گڑھ یونیورسٹی سے ہی یہ احساس بیدار ہوا کہ ہندو اور مسلمان دو الگ الگ قومیں ہیں۔ ان کی الگ الگ تہذیبیں ہیں اور ان کا باہم مل کر زندگی کرنا ممکن نہیں۔ پاکستان سرسید کا خواب نہیں تھا لیکن اس کے دو قومی تصور کا ابتدائی بیج ان کے نہاں خانۂ خیال سے پیدا ہوا اور پھر ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو قائداعظم محمد علی جناح نے پاکستان کو وجود میں لا کر اس کی تعبیر تصور اقبال کی روشنی میں کر دی۔

''حیات جاوید'' سرسید احمد خان کی علمی، تہذیبی اور عملی جدوجہد کا تذکرہ ہے جس کا ایک ایک لفظ ان کے نجب الحسین کی وضاحت کرتا اور آج کے اس ترقی یافتہ دور میں بھی ہمیں اصلاح اور ترقی کے راستے دکھاتا ہے۔ ''حیات جاوید'' سرسید دور کے نامور ادیب مصلح اور قومی شاعر مولانا الطاف حسین حالی نے لکھی اور سوانح نگاری کا ایک ایسا نقش قائم کر دیا جسے شبلی نعمانی نے تو مدلل مداحی قرار دیا لیکن جس کے معیار کی مثال بعد کے ادوار میں بھی پیش نہ کی جا سکی۔ وجہ ظاہر ہے کہ قوم کو اقبال اور قائداعظم تو نصیب ہو گئے جنہوں نے پاکستان تعمیر کر دیا لیکن تشکیل پاکستان کے بعد قوم کو سرسید احمد خان اور الطاف حسین حالی میسر نہ آئے جو باشندگان پاکستان کے تعلیمی افق کو روشن کرتے۔

اس دور میں ضرورت اس بات کی تھی کہ ''حیات جاوید'' کے مطالعۂ عام کی عادت ڈالی جائے اور اس کتاب کی اشاعت بار بار کی جائے۔ اس کتاب کا ایک ضخیم ایڈیشن مولانا صلاح الدین احمد نے ''اکادمی پنجاب'' سے چالیس برس پہلے شائع کیا تھا جو عرصے سے نایاب تھا۔ اب اس کتاب کا حصہ اول ٹرسٹ سکول لاہور کے منتظم طاہر یوسف صاحب نے شائع کیا ہے۔ ٹرسٹ سکول انہیں مقاصد کی تکمیل کے لیے معرض وجود میں لایا گیا جو سرسید احمد خان کے پیش نظر تھے۔ اسی سکول میں ذہین بچوں کو معیاری تعلیمی سہولتیں بلا معاوضہ فراہم کی جاتی ہیں اور سائنس ٹیکنالوجی اور کمپیوٹر کے وسیع تر میدان میں نوجوانوں کو کامیابیاں حاصل کرنے کی تربیت دی جاتی ہے۔ ان طلبہ کے لیے ہی نہیں پوری قوم کے لیے سرسید کی زندگی ''دعوت عمل'' ہے۔ یہ کتاب طلبہ کے شعور کو عمل سے منور کرنے کے لیے شائع کی گئی ہے اور قوم کو دعوت دیتی ہے کہ وہ سرسید احمد خان کے جذبے سے اس تحریک میں شامل ہوں جو ٹرسٹ سکول نے جاری کر رکھی ہے۔ کتاب پر قیمت لکھ کر منادی گئی ہے۔ آپ اسے تحفتاً بھی حاصل کر سکتے ہیں۔ لیکن بہتر یہ ہے کہ ٹرسٹ سکول میں اپنا ہدیہ پیش کر کے کتاب حاصل کریں اور اس عبادت میں شریک ہو جائیں جو یہ ادارہ انجام دے رہا ہے۔ ہمیں توقع ہے کہ ''حیات جاوید'' کا دوسرا حصہ بھی جلد شائع کیا جائے گا۔ حصہ اول کی ضخامت ۲۳۰ صفحات ہے۔ ملنے کا پتہ ''ٹرسٹ فار ایجوکیشن'' ۱۸۰ شادمان II لاہور۔

## مولانا صلاح الدین احمد پر دو کتابیں

عاتکہ صدیقہ اردو ادب کی گم شدہ محقق اور نقاد ہیں، میں نے ان کا نام پہلی مرتبہ 1966 میں سنا اور حیرت ہوئی کہ وہ اس مرد درویش پر تحقیقی مقالہ لکھ رہی تھیں جسے حق نے تمام انداز خسروانہ عطا کیے تھے۔ یہ مولانا صلاح الدین احمد تھے جو ادب کے گھمسان میں موجود ہونے اور ربع صدی سے زیادہ عرصے تک کارہائے تصنیف و تالیف نمایاں کرنے کے باوجود شہرت عام سے نفرت کرتے تھے اور فن کے حوالے سے بقائے دوام کا تاج دوسروں کے سر پر رکھ کر بڑی طمانیت محسوس کرتے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ ''نقوش'' کے شخصیات نمبر میں ڈاکٹر وزیر آغا نے ان کا شخصیت نامہ لکھا تو وہ ناراض ہو گئے اور کچھ یوں فرمایا کہ:

''میں مر جاؤں تو میرے ساتھ جو سلوک چاہے کیجئے''۔

ڈاکٹر وزیر آغا ان پر ایک نہیں کئی کتابیں لکھ سکتے تھے لیکن مولانا صلاح الدین احمد کا ارشاد ان کی زندگی میں مانع رہا۔ مولانا کی وفات کا حادثہ ناگہانی تھا۔ قبولہ ضلع منٹگمری میں (جو اب ساہی وال ہے) مقالہ پڑھنے کے لیے گئے تو رستے میں کوہ ندا کی صدا سنائی دی اور وہ اپنا مقالہ ''جان آفریں'' کو سنانے کے لیے عقبیٰ کو سدھار گئے۔ ان کی وفات پر پورا ملک بالعموم اور سارا لاہور بالخصوص غم کی لہر میں ڈوب گیا۔ مولانا پاکستان میں اردو زبان و ادب کے سچے خادم اور پنجاب کے بابائے اردو تھے۔ عاتکہ صدیقہ نے غم کی اس لہر میں وہ کام انجام دینے کا بیڑہ اٹھایا جسے مولانا نے اپنی زندگی میں انجام دینے سے منع فرمایا تھا لیکن اب ممانعت کا عرصہ گزر چکا تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ عاتکہ صدیقہ مولانا صلاح الدین احمد پر مقالہ لاہور میں لکھ رہی تھیں لیکن ان کا تذکرہ سرگودھا میں زیادہ ہوتا تھا، جہاں مولانا صلاح الدین احمد کے بہت سے نیازمند موجود تھے اور عاتکہ صدیقہ کے کام میں گہری دلچسپی لے رہے تھے۔ عاتکہ صدیقہ کا مقالہ ڈاکٹر وحید قریشی کی نگرانی میں مکمل ہوا تو اسے ایم اے کے مقالات کے لیے نظیر قرار دیا گیا اور عاتکہ صدیقہ اپنی اس گراں قدر کاوش سے شہرت کے ہفت آسمان پر پہنچ گئیں۔

حادثہ یہ ہوا کہ عاتکہ صدیقہ نے اس مقالے کو بروقت چھپوانے کی زحمت نہ کی لیکن اب میں اندازہ لگا سکتا ہوں کہ مولانا صلاح الدین احمد کی شخصیت اور فن پر مقالہ نگاری کے دوران مولانا کی سیرت عاتکہ صدیقہ کے مزاج پر بھی اثر انداز ہوئی ہوگی۔ میرا خیال ہے کہ عاتکہ صدیقہ نے ادب کے مادی اور دنیاوی فائدے کے برعکس مولانا صلاح الدین کی طرح ادب کے روحانی زاویے کو فوقیت دی اور اپنے مقالے کی فوری اشاعت سے شہرت کشید کرنے کا نسخہ استعمال نہ کیا۔ اس مقالے کی تحقیق و تسوید کے دوران عاتکہ صدیقہ کی شخصیت میں مجھے ایک اور تغیر بھی نمایاں نظر آتا ہے۔ مولانا صلاح الدین احمد جنرل ایوب خان کے مارشل لا دور میں جسم کی قید سے آزاد ہو گئے تھے۔ انہوں نے اپنی زندگی میں مارشل لاء کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اس عظیم آمر کو للکارا تھا جس نے مالک کو غافل دیکھ کر گھر پر قبضہ کر لیا تھا۔ وہ بڑے دکھ سے کہتے تھے:

''اب بلا نے گھر دیکھ لیا ہے، یہ بلا بار بار آئے گی''۔

ان کی یہ پیش گوئی وقت نے درست ثابت کی اور مارشل لاء کا جن مولانا کی وفات کے بعد دو مرتبہ بوتل سے اس طرح باہر آیا کہ پھر لمبے عرصے تک اسے بوتل میں بند کرنا مشکل ہو گیا۔ میرا خیال ہے کہ مولانا کی اس آزادہ روی اور مارشل لا نظام سے نفرت کا اثر عاتکہ صدیقہ نے بھی لیا اور وہ پاکستان سے باہر ایک ایسے ملک میں چلی گئیں جہاں مارشل لاء لگنے کا خطرہ نہیں تھا۔ میں نے اگلے دن اس بات کا تذکرہ اردو کی ممتاز افسانہ نگار فرخندہ لودھی سے کیا تو وہ بولیں:

''عاتکہ کے باطن میں ایک باغی روح ہمیشہ سے موجود تھی، وہ اس ملک میں بھی انقلاب لانا چاہتی تھیں لیکن وہ ایوب خان کے انقلاب کی مخالف تھیں، عاتکہ نے جب یہاں گھٹن محسوس کی تو وہ اس دور میں امریکہ چلی گئیں جب امریکہ خالہ جی کا گھر نہیں بنا تھا''۔

ادبی نقصان یہ ہوا کہ عاتکہ صدیقہ کا مقالہ نظروں سے اوجھل ہو گیا لیکن ان کا یہ اعزاز برقرار ہے کہ انہوں نے مولانا صلاح الدین احمد پر پہلا مقالہ لکھا اور اردو ادب کے اس غنی مزاج ادیب کی خدمات کا اعتراف اس انداز میں کیا کہ عاتکہ صدیقہ کو ڈاکٹر وحید قریشی، مولانا حامد علی خان، ڈاکٹر عاشق بٹالوی، ڈاکٹر وزیر آغا اور مولانا کے متعدد دوستوں نے خراج تحسین ادا کیا۔ عاتکہ صدیقہ کا یہ اعزاز تاریخی ہے۔

مولانا صلاح الدین کی وفات کے بعد رسالہ ادبی دنیا کی وراثت مولانا کے صاحبزادوں نے نفع مندی کا کاروبار سمجھ کر سنبھال لی اور یہ بات نظر انداز کر دی کہ مولانا نے یہ معاملہ زیاں کے لیے اختیار کر رکھا تھا۔ وہ اس رسالے کے لیے نہ سرکاری گرانٹ لیتے تھے، نہ کرم فرماؤں کے نذرانے قبول کرتے تھے، وہ ہر روز کنویں سے نیا پانی نکالتے، تالیف، ترجمہ اور ریڈیو سے جو کچھ حاصل کرتے اسے ''ادبی دنیا'' پر صرف کر ڈالتے تھے۔ ''ادبی دنیا کی وراثت منتقل ہوئی تو اس کے آخری دور کے مدیر معاون ڈاکٹر وزیر آغا نے مولانا کی وفات کے بعد ان کے ادبی مشن کو فروغ دینے کے لیے ''اوراق'' کا آغاز کر لیا اور ''ادبی دنیا'' کی ادارت عبداللہ قریشی صاحب کو تفویض کر دی گئی۔ وزیر آغا ان دنوں سرگودھا شہر میں منتقل ہو گئے تھے جہاں ہر شام دوستوں کی محفل میں مولانا کا ذکر عقیدت اور نیازمندی سے ہوتا تھا۔

میں نے مولانا کو پہلی مرتبہ ۱۹۴۴ء میں اسلامیہ کالج لاہور کی ''مجلس فروغ اردو'' اور ''حلقہ ارباب ذوق'' میں دیکھا تھا لیکن میں ''ادبی دنیا'' کا انوکھا خریدار بھی تھا۔ یعنی ساڑھے تین صد صفحات کا پہلا پرچہ ایک روپے میں خریدا۔ اس کے بعد سابقہ پرچہ دکھا کر مولانا سے نیا پرچہ مفت حاصل کر لیتا تھا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان سے نیاز مندی ان کی وفات کے بعد وزیر آغا صاحب کی ''شام داستاں آباد'' سے پیدا ہوئی، آغا صاحب کی رہنمائی سے ہی میں نے مولانا کے اسلوب پر اپنا پہلا مقالہ لکھا۔ ان کی معیت ہی میں مولانا پر ایک کتاب مرتب کی جو مشفق خواجہ صاحب نے انجمن ترقی اردو اور پاکستان سے شائع کی، اس کتاب کے موضوعات میں کمی نظر آئی تو میں نے ایک اور کتاب ''مولانا صلاح الدین احمد، فن اور شخصیت'' لکھی اور ان کی کتابیات مرتب کی۔ اس تمام عرصے میں میرے سامنے عاتکہ صدیقہ کی نظیر تھی۔ جس نے مولانا پر پہلا وقیع مقالہ پیش کیا تھا۔ ان کا کام مجھے ہمیشہ عمدہ نظر آیا۔

۳۶ برس کے بعد اب عاتکہ صدیقہ ادب کے افق پر اچانک دوبارہ نمودار ہوئی ہیں تو انہوں نے مولانا صلاح الدین احمد سے اپنے دیرینہ تعلق کی نشاۃ ثانیہ دو کتابوں سے کی ہے۔ ان کی ایک کتاب کا نام ''مولانا صلاح الدین احمد ..... فن اور شخصیت'' ہے۔ دوسری کتاب ''مولانا صلاح الدین کا خیالستان'' کے عنوان سے موسوم ہے۔ ایک میں مولانا کی شخصیت کے نادر و نایاب گوشوں کو دریافت کیا گیا، دوسری کتاب ان کے گم شدہ رسالے ''خیالستان'' کی بازیافت ہے۔ خوبی کی بات یہ ہے کہ انہوں نے مولانا کے موضوع کی پرورش ۳۶ برس تک دیدہ و دل سے کی اور اس کے لیے نیا مواد تلاش کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ میں نے کل رات ان دو کتابوں کی ورق گردانی کی تو احساس ہوا کہ نئی تحقیق کا دروازہ ہمیشہ کھلا رہتا ہے اور عاتکہ صدیقہ کی جو بائی نے ہمارے سامنے دو ایسی کتابیں پیش کر دی ہیں جن سے بقول ڈاکٹر وحید قریشی ''پنجاب میں اردو ادب کی تاریخ کا سنہرا باب مکمل ہو گیا ہے۔ ایک اور رائے یہ ہے کہ:

> ''اردو ادب کی تاریخ لکھنے والے، مولانا صلاح الدین احمد کے بارے میں اس عالمانہ مقالے کے حوالے کے بغیر آگے نہیں بڑھ سکیں گے''۔

عجیب بات ہے کہ یہ پیش پا افتادہ اور برسوں کی گھسی پٹی رائے عاتکہ صدیقہ کے مقالے پر صادق آتی ہے۔

ان کتابوں میں عاتکہ صدیقہ کا تحقیقی انداز بہت اہمیت رکھتا ہے۔ انہوں نے اورینٹل کالج کی ادبی تحقیق میں تلاش صداقت کی اس روایت کو قائم رکھا ہے جس کا آغاز محمود شیرانی نے کیا تھا اور ڈاکٹر سید عبداللہ، ڈاکٹر وحید قریشی اور خواجہ محمد زکریا سے ہوتی ہوئی اب ڈاکٹر تحسین فراقی اور زاہد منیر عامر تک پہنچ چکی ہے۔ میرا خیال ہے کہ مولانا کے نایاب اور غیر مدون خطوط کی دریافت عاتکہ صدیقہ کا ایک بڑا کارنامہ ہے۔ انہوں نے مولانا کی ادبی خدمات کا جائزہ نئے موضوعات اور نئے زاویوں سے لیا ہے اور ان کے سارے کام کو حتیٰ کہ ''خیالستان'' میں ان کے آغاز بلوغت کے کام کو بھی مرتب کر دیا ہے۔ انہوں نے ایک کتاب کے لیے مولانا کے صاحبزادے وجیہ الدین احمد سے ایک خیال افروز ''پیش لفظ'' لکھوانے میں بھی کامیابی حاصل کی ہے۔ میں اسے بھی عاتکہ صدیقہ کا کارنامہ شمار کرتا ہوں۔ یہ پیش لفظ اردو ادب کی ایک ''بڑی'' بلکہ ''بہت بڑی'' تحریر ہے جس میں مولانا صلاح الدین احمد کے اسلوب کے تمام محاسن جگمگاتے نظر آتے ہیں۔ بلاشبہ اس برس تحقیق کے جو ثمرات سامنے آئے ہیں ان میں یہ دو کتابیں قدر اول کی کتابیں ہیں۔ ان کی اشاعت سے نہ صرف وہ نقصان پورا ہو گیا ہے جو عاتکہ صدیقہ کے امریکہ جانے اور مقابلہ غیر مطبوعہ رہنے سے ہوا تھا بلکہ اس میں اصل زر کے ساتھ بہت سا منافع بھی شامل ہے۔

# تعارف دیوانِ مانی مشہدی

پروفیسر سید امیر حسن عابدی

مانی مشہدی کا آبائی پیشہ کاسہ گری تھا، لیکن خود وہ ایک شاعر کی حیثیت سے سلطان حسین بایقرا[1] کے صاحبزادے محمد محسن مرزا کے دربار سے وابستہ ہوئے اور ۹۱۳ ہجری/۸-۱۵۰۷ عیسوی میں انتقال کیا۔

دیوان مانی کا ایک قلمی نسخہ استنبول یونیورسٹی کے کتب خانے میں موجود ہے[2]، جو اس طرح شروع ہوتا ہے:۔

الٰہی از کرمت رحمتی کہ بار گناہ
بسوخت از تف خود مغز استخوان مرا

اور اس طرح ختم ہوتا ہے:۔

شعر او را چنانکہ می دانی
ھیچکس غیر او دوبارہ نخواند

اس دیوان کا ایک مختصر سا دوسرا قلمی نسخہ رام پور رضا لائبریری میں ہے[3]۔ جس کی کتابت ۱۲۲۳ھ میں مرزا ابراہیم اصفہانی نے کی تھی۔ یہ نسخہ اس طرح شروع ہوتا ہے:۔

زھی زجود تو پیدا شدہ نشان ھمہ
خدایی از تو بود بندگی از آن ھمہ

اس میں کل اشعار کی تعداد تقریباً ۲۰۰ ہے۔ مانی نے اپنے کلام کو اپنے مربی کے سامنے پیش کرتے ہیں:۔

از مانی شکستہ دل ای باد صبحدم
ایں نو غزل بخدمت شاہ جہان ببر

نیز ان کی بزم کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں:۔

چنگ در بزم خاص حضرت شاہ
ساز ما پرنواست می گرید

نامی کو زندگی میں عیش و آرام نہ مل سکا۔ نیز وہ لوگوں کی بے مروتی کے شاکی نظر آتے ہیں:

مانی وفا و مہر مجو از جہانیان
چیزی طلب مکن کہ در این روزگار نیست
مانی کجا و منزل عیش و طرب کجا
گوئی بلا و گوشۂ غم خانۂ من است

کسی کے خط آنے پر وہ خوشی کا اظہار اس طرح کرتے ہیں:

روشن شد است دیدہ مانی زمانہ ات
یعنی سواد خط تو در دیدہ توتیاست

وہ نظامی گنجوی[۳] کے مداح تھے:۔

جز نالہ کہ باشد کہ برد نامہ مانی
ایں نظم روان را بہ نظامی کہ رساند

مانی کو ایسی شاعری پر فخر ہے:۔

چنین کہ ہست سخنہای مانی از سر سوز
عجب مدار کہ آتش زند کباب مرا

---

برنگ خاص سخن ہر دم آورم بزبان
کہ مانیم من و ایں بانگہا از آن من اند

---

مانی از ملک جہان ہیچ نخواہد کہ مرا
از سر ملک جہان ملک سخن بس باشد

---

بوصف بیانش بین شعر مانی
کہ ہر بیت او بی خیالی نباشد

نیز وہ اپنے کو کمال سے بہتر سمجھتے ہیں:۔

کسی کہ گفتۂ مانی شنید داد انصاف
کہ شعر اوست ز شعر کمال نازکتر

مگر پتہ نہیں اس سے مراد خلاق المعانی کمال الدین اصفہانی[۵] یا کمال خجندی[۶] ہیں۔

حسب ذیل اشعار میں شاعر محبوب کے قد، اس کی خرام میں آمد اور کوٹھے پر جانے کا نقشہ کھینچتے ہیں:

بالا کشید طفل من و سرو ناز شد
نخل غمش نمونۂ عمر دراز شد

---

خوبان بدید تو بہ خرام آمدند
سر پا برہنہ بین بچہ اندام آمدند

---

تو سر بام آمدی مانی و خلقی در بلا ہر سو
بہ بین بر مردم عالم بلا از آسماں آمد

اب یہاں ان کے دیوان سے کچھ منتخب اشعار نقل کیے جا رہے ہیں۔

زان بی وفا خوش است بجور و جفا مرا
من عاشقم چہ کار ز مہر و وفا مرا

---

ای شمع زکوی تو ہوای سفرم نیست
پروانۂ پر سوختہ ام بال و پرم نیست

---

مانی حدیث زلف و رخش گفت در چمن
آتش زشرم در گل و ریحان فتاد و سوخت

---

در جہاں شکستہ دل و زار آمدیم
بہر متاع درد خریدار آمدیم

---

تا بدیدیم ترا شور جہانی شدہ ای
قد برافروختہ ای سرو روانی شدہ ای

---

ای مہ مرا بکلبۂ احزان در آمدی
درکف پیالہ مست وغزل خوان در آمدی

## حواشی وحوالہ جات

۱۔ ۸۴۲_۹۱۱ھ/۱۴۳۸_۱۵۰۶ء

۲۔ فہرست نسخہ ہای خطی فارسی، کتابخانہ دانشگاہ استنبول، گردآورندہ: توفیق ہاشم پورسبحانی وحسام الدین اختر، پژوہشگاہ علوم انسانی ومطالعات فرہنگی تہران، ۱۳۷۴

۳۔ نمبر ۳۳۳

۴۔ وفات: در حدود ۶۰۲ھ/۱۲۰۵ء

۵۔ وفات: ۶۳۵ھ/۳۸_۱۲۳۷ء

۶۔ وفات: ۸۰۳ھ/۱۴۰۱_۱۴۰۰ء

# مختصر تبصرے

## اصول تحقیق وترتیب متن

ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا

ڈاکٹر تنویر احمد علوی اردو کے مشہور محقق اور نقاد ہیں۔ وہ سال ہا سال دہلی یونیورسٹی، دہلی سے بطور معلم وابستہ رہے ہیں۔ انہوں نے تحقیق وتدوین متن کے سلسلے میں جو کام کیا ہے وہ اس شعبے میں مثالی کارنامے کی حیثیت رکھتا ہے۔

۱۹۷۷ء میں ڈاکٹر علوی نے اصول تحقیق و ترتیب متن کے نام سے ایک کتاب ہندوستان میں شائع کی تھی جو فن تحقیق وتدوین پر اولیں کتاب تو نہیں تھی، لیکن اسے اپنی پیش رو کتابوں سے زیادہ جامع اور زیادہ معیاری تصنیف قرار دیا جا سکتا ہے۔ یہ کتاب زیادہ تر اصول تدوین کے بارے میں ہے، لیکن فن تحقیق کی مبادیات کے بارے میں بھی انہوں نے عمدہ اشارے کیے ہیں۔

چند برسوں سے اردو میں فن تحقیق اور فن تدوین پر کتابیں اور مضامین لکھنے کا سلسلہ شروع ہوا ہے۔ فن تحقیق پر زیادہ تر اور فن تدوین پر نسبتاً کمتر توجہ صرف کی گئی ہے۔ ڈاکٹر خلیق انجم کی متنی تنقید (مطبوعہ ۱۹۶۷ء) اس سلسلے کی اولیں تصنیف ہے۔ مبادیات تحقیق (عبدالرزاق قریشی)، تحقیق کا فن (ڈاکٹر گیان چند)، ادبی تحقیق مسائل اور تجزیہ (رشید حسن خان) وغیرہ میں بھی فن تدوین کے بارے میں بھی بہت کچھ لکھا گیا ہے اور ڈاکٹر نذیر احمد، قاضی عبدالودود اور بعض دیگر اہل علم کے مضامین بھی اس سلسلے میں تازہ واردان تدوینِ کتب کی رہنمائی کر سکتے ہیں، لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ تنویر احمد علوی کی زیر نظر تصنیف اس سلسلے کی اہم ترین کتاب ہے۔

ڈاکٹر تنویر احمد علوی اردو کے علاوہ عربی، فارسی، ہندی اور انگریزی زبانوں سے بھی بخوبی آگاہ ہیں اس لیے انہوں نے انگریزی، ہندی اور اردو میں فن تدوین پر لکھی ہوئی تحریروں سے استفادہ کیا ہے اور عربی/فارسی سے وضع اصطلاحات میں مدد لی ہے۔ اردو، فارسی وغیرہ میں تدوین متن کے بہترین نمونے بھی ان کے پیش نظر رہے ہیں۔ چنانچہ وہ ایک ایسی کتاب لکھنے میں کامیاب رہے ہیں جو اس فن پر اردو کی سب سے جامع کتاب ہے۔

کتاب گیارہ ابواب میں تقسیم کی گئی ہے جس میں ترتیب وارتدوین متن کے تمام مسائل زیر بحث لائے گئے ہیں اور اس سلسلے میں درپیش الجھنوں کی نشاندہی کرنے کے ساتھ ساتھ انہیں سلجھانے کے طریقے تجویز کیے گئے ہیں۔ بحث کا انداز واضح اور منطقی ترتیب کا حامل ہے۔ پیچیدگی اور ابہام سے مبرا اسلوب میں تمام مباحث تحریر کیے گئے ہیں۔ تاہم یہ احساس ہوتا ہے کہ اصطلاحات عام طالب علم کے لیے قدرے دقیق ہیں۔ مشفق خواجہ اس کتاب کے بارے میں رقمطراز ہیں:

''ڈاکٹر تنویر احمد علوی کا شمار برصغیر کے نامور محققین میں ہوتا ہے۔ وہ ہماری قدیم علمی روایت کے امین ہیں۔ ڈاکٹر صاحب متون کی تدوین کے نظری اور عملی مسائل ومباحث پر گہری نظر رکھتے ہیں۔ انہوں نے اپنی کتاب 'اصول تحقیق وتدوین متن' میں قدیم وجدید رجحانات کی روشنی میں ان عملی ونظری مباحث پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ ان کی کتاب اصول تحقیق وترتیب کی پاکستان میں اشاعت خوش آئند ہے۔ مجھے امید ہے کہ پاکستان کے علمی حلقے اس کی پاکستان میں اشاعت کی پذیرائی کریں گے''۔

پاکستان میں یہ کتاب سنگت پبلشرز ۲۵ سی لوئر مال لاہور نے ۲۰۰۳ء میں شائع کی ہے۔ تقریباً ساڑھے تین سو صفحات پر محیط اس کتاب کی قیمت تین سو روپے ہے۔

## پوشیدہ تری خاک میں۔ (سفرنامہ اندلس)

جعفر بلوچ

زیر نظر کتاب بنام ''پوشیدہ تری خاک میں .....'' پروفیسر ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی کا سفرنامۂ اندلس ہے۔ یہ سفرنامہ ''اقبالیات'' کے حوالے سے ہے اور کتاب کا نام بھی حضرت علامہ کی مشہور نظم ''ہسپانیہ'' سے لیا گیا ہے جو ''بال جبریل'' میں شامل ہے۔ اس نظم کے پہلے دو شعر درج ذیل ہیں:۔

ہسپانیہ تو خونِ مسلماں کا امیں ہے — مانند حرم پاک ہے تو میری نظر میں
پوشیدہ تری خاک میں سجدوں کے نشاں ہیں — خاموش اذانیں ہیں تری باد سحر میں

جناب پروفیسر ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی نومبر ۱۹۹۱ء میں قرطبہ کی بین الاقوامی اقبال کانگریس میں شرکت کے لیے سپین گئے۔ ان کے اپنے قول کے مطابق:

''زیر نظر کتاب تقریباً دو ہفتے تک اندلس کے تین اہم تاریخی شہروں، قرطبہ، غرناطہ اور اشبیلیہ کی سیر وسیاحت، خصوصاً مسجد قرطبہ کی زیارت اور اقبال کانگریس اور سفر کے مجموعی مشاہدات وتاثرات کی روداد پر مشتمل ہے''۔

یہ سفرنامہ پہلی بار ''سفرنامہ اندلس'' کے نام سے مجلّہ ''نقوش'' لاہور کے ۱۹۹۶ء کے شمارے میں شائع ہوا تھا اور اس پر مصنف کو نقوش ایوارڈ بھی ملا تھا۔ نومبر ۱۹۹۷ء میں ڈاکٹر ہاشمی نے پیرس کا دوسرا سفر کیا۔ زیر نظر کتاب کے مراحل ترتیب ۱۹۹۸ء کے اوائل میں مکمل ہوئے۔ اس کتاب کی ترتیب میں ہاشمی صاحب نے پیرس کے اس دوسرے سفر کی یادداشتوں سے بھی کچھ مدد لی ہے۔

سپین یا ہسپانیہ پر مسلمانوں کی حکومت قریباً آٹھ سو سال (۷۱۱ء۔۱۴۹۲ء) تک رہی۔ اس لیے یہ ملک عالم اسلام کی محبت اور عقیدت کا مرجع ہے۔ ان جذبات محبت وعقیدت کو علامہ اقبال کی سیاحت سپین اور اسلامی سپین کی یادگاروں خصوصاً مسجد قرطبہ سے متعلق منظومات اقبال نے اور بھی روشن کر دیا۔ ہسپانیہ کے ذکر خیر سے مسلمانوں کے ملی جذبات کا متموج ہونا ایک فطری بات ہے۔ چنانچہ اسلامی زبانوں کے ادب میں ہسپانیہ کا ولولہ انگیز تذکرہ جا بجا ملتا ہے۔ اردو زبان بھی اس حدیث شوق سے خالی نہیں ہے اور زیر نظر سفرنامہ بھی اسلامیت اور اقبالیات ہی کے حوالوں کو مزید اجاگر کرنے کے لیے شائع کیا گیا ہے۔

اس سفرنامہ میں ہسپانیہ کے متعدد شہروں مثلاً قرطبہ، غرناطہ، اشبیلیہ وغیرہ اور وہاں کے تاریخی مقامات کے بارے میں

بہت تاثر آفریں معلومات فراہم کی گئی ہیں۔ مسجد قرطبہ کے احوال وظروف کا اس سفرنامہ میں خصوصیت اور تفصیل کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے۔ کچھ ذکر ان تبدیلیوں کا بھی ہوگیا ہے جو مختلف تاریخی ادوار میں اس مسجد میں ہوتی رہیں۔ کتاب کے ضمیمہ میں پیرس میں چند روزہ قیام کا ذکر بھی آ گیا ہے۔

اس سفرنامہ میں قرطبہ کی اقبال کانگریس میں شریک ہونے والے عالمی مندوبین کا بھی اجمالی ذکر آ گیا ہے۔ اس سے دنیا بھر میں اقبال شناسی کے آفاق واعمال کا کچھ اندازہ ہوتا ہے۔ کانگریس کے زیادہ اہم شرکا میں سے ڈاکٹر این میری شمل (جرمنی) جگن ناتھ آزاد (بھارت) سید مظفر حسین برنی (بھارت) ڈاکٹر ابوسعید نورالدین (بنگلہ دیش) ڈاکٹر سعید اختر درانی (برطانیہ) پروفیسر ڈاکٹر حسین نجیب المصری، ڈاکٹر احمد معوض (مصر) موسیو لامان (فرانس) عزیزالدین احمد (برطانیہ) عبدالرزاق مدیر ''وطن'' (لندن)، ولیسولیر (فرانس) ڈاکٹر ستالیا پری گارنیا (روس) ہیروشی کان کگایا (جاپان) ڈاکٹر اکبر ترسون زادہ (تاجکستان) مصطفیٰ الکیتری (مراکش) عبدالحمید بن حمدہ (تیونس) پروفیسر دتیوسالیرنو (اٹلی)، ڈاکٹر ایرکن ترکمان (ترکی) ڈاکٹر ژاں ماریک (پراگ) کے نام خصوصاً قابل ذکر ہیں۔ کانگریس کے پاکستانی مندوبین میں مصنف کے علاوہ پروفیسر مرزا محمد منور، ڈاکٹر جاوید اقبال اور سہیل عمر بھی شامل تھے۔ ان حضرات سے زیرنظر کتاب کے دوران مطالعہ میں ہماری تفصیلی ملاقاتیں ہوتی ہیں۔ ''پوشیدہ تری خاک میں.....'' زبان وبیان کے حوالے سے بھی دلچسپ اور شگفتہ ہے اور مصنف اپنے پرکشش اسلوب بیان کی بنا پر قاری کو اپنا ہم سفر بنانے میں کامیاب نظر آتا ہے۔ امید ہے یہ سفرنامہ اپنی اہمیت ونافعیت اور اپنے اقبالیاتی اختصاص کی بنا پر قبول عام حاصل کرے گا۔

۲۸۰ صفحات اور ۱۵۰/- روپے قیمت کی اس کتاب کے ناشر دارالتذکیر غزنی سٹریٹ اردو بازار لاہور ہیں۔

## یادنامہ داؤدی

رفاقت علی شاہد

مرحوم خلیل الرحمٰن داؤدی ہمارے محققین علما کے اس طبقے سے تعلق رکھتے تھے، جو ستایش وصلے کی تمنا سے بے نیاز ہو کر شجر تحقیق کو ثمر بار کرنے میں اپنی قوتیں اور عمر عزیز صرف کر دیتے ہیں۔ ایسے علما کے تحقیقی کام ہی آیندہ کے لیے مشعل راہ بنتے ہیں اور تاریخ ادب میں ان مٹ نقوش چھوڑ جاتے ہیں۔ زیر تبصرہ کتاب، مرتبین، ڈاکٹر تحسین فراقی اور جعفر بلوچ نے داؤدی صاحب کی ایسی ہی خدمات کے اعتراف میں مرتب کی ہے۔

کتاب ہذا کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ حصہ اول: ''شخص وعکس'' میں داؤدی صاحب مرحوم کی شخصیت اور فکر وفن پر آٹھ مضامین ومقالات موجود ہیں۔ حصہ دوم: ''منتخبات داؤدی'' میں مرحوم داؤدی کے رشحات قلم اور ان کے نام مشاہیر ادب کے خطوط شامل ہیں۔

حصہ اول میں رابعہ رضوی کے دو مضامین شامل ہیں جو داؤدی صاحب کے احوال وآثار اور شخصیت پر مباحث کا احاطہ کرتے ہیں۔ شقائق النعمان داؤدی نے اپنے والد مرحوم کی خانگی زندگی اور ان کے فطری رجحانات سے متعلق مشاہدات لکھے ہیں جب کہ ڈاکٹر وحید قریشی، ڈاکٹر عارف نوشاہی، محمد اکرام چغتائی، محمد اقبال مجددی اور ڈاکٹر تحسین فراقی نے علم وتحقیق، مخطوطات شناسی اور علم پروری کے حوالے سے داؤدی صاحب سے متعلق اپنی یادداشتیں قلم بند کی ہیں۔ اس کے علاوہ تسلیم احمد تصور کا داؤدی صاحب سے کیا گیا انٹرویو اور جعفر بلوچ کی نظم: ''تو زندہ ہے (خلیل الرحمٰن داؤدی مرحوم کی نذر)'' بھی ''شخص وعکس'' کا حصہ ہیں۔

دوسرا حصہ تحریرات داؤدی کا احاطہ کرتا ہے۔ اس حصے میں داؤدی صاحب کے مرتبہ وغیر مطبوعہ قدیم اردو قصے ''طلسم حیرت'' کا مقدمہ، ''بعض اہم مخطوطات کے دو اہم مکتوب بنام ڈاکٹر وحید قریشی'' شامل ہیں۔ داؤدی صاحب کی یہ تحریریں غیر مطبوعہ وغیر مدون تھیں اور اس کتاب کے ذریعے سے پہلی بار منظر عام پر آ گئی ہیں۔ اسی حصے میں داؤدی صاحب کے مطبوعہ مضامین: ''گلدستہ نازنیناں''، ''دیوان غالب اردو۔ ایک نادر مخطوطہ''، ''۱۸۵۷ء سے قبل کی اردو مطبوعات''، "Muslim Contribution to Mathematics" اور "Religion and Morality" بھی شامل کیے گئے ہیں۔ اس کے علاوہ درج ذیل مشاہیر کے داؤدی صاحب کے نام خطوط کے عکس بھی اس حصے میں شامل کیے گئے ہیں۔ ڈاکٹر محمد حمیداللہ، ممتاز حسن، سید امتیاز علی تاج، جناب امتیاز علی، مشفق خواجہ، ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہان پوری، ڈاکٹر محمد انصاراللہ، امداد صابری اور محمد ادریس سندھی۔ کتاب کے آخر میں ''انتظاریہ'' کے تحت داؤدی صاحب کے بارے میں مشفق خواجہ کی یادداشتیں ''داؤدی صاحب۔ چند تاثرات'' کے عنوان سے شامل ہیں۔

مضمون نگاروں نے اپنی یادداشتوں میں داؤدی صاحب مرحوم کے علمی مرتبے، لگن، محنت، فطری خوبیوں، ذرہ نوازی اور علم پروری کے کئی پہلو واضح کیے ہیں۔ اس سے داؤدی صاحب کی ایک واضح تصویر سامنے آتی ہے۔ داؤدی صاحب کی تحقیقی تحریروں سے ان کے انداز تحقیق، موضوعات تحقیق، مخطوطات کی جمع آوری، تحقیق اور حفاظت کے لیے ان کی خدمات اور بیان کی جملہ خوبیاں واضح ہوتی ہیں۔

داؤدی صاحب کی قاموسی علمی وتحقیقی شخصیت کی پہلی برسی کے موقع پر یہ ''یادنامہ'' پیش کر کے مرتبین نے اپنا خراج تحسین پیش کر دیا ہے۔ امید ہے یہ کتاب داؤدی صاحب کی شخصیت اور فکر وفن (داؤدیات) پر کام کے لیے خشت اول ثابت ہوگی۔

## دنیا جن سے روشن ہے

محمد سعید

کسی بھی قوم یا معاشرے میں علم اور نور کے استعارہ اور مینارہ، اساتذہ کے علاوہ، دنیا کن سے روشن ہو سکتی ہے؟ علم وآگہی کے گہوارہ اور استعارہ، اساتذہ ہی ہیں کہ ''دنیا جن سے روشن ہے'' اور خوش قسمت ہے وہ معاشرہ جو اس بات کا احساس اور شعور رکھتا اور اس حقیقت کو مانتا ہے کہ اساتذہ ہی کے دم سے دنیا روشن ہے۔

اچھا استاد ابلتے ہوئے چشمے کی مانند ہوتا ہے۔ ایسا چشمہ جو کبھی خشک نہیں ہوتا جو تشنگان کی پیاس بجھانے سے کبھی عاجز نہیں آتا اور جس کی سیرابی میں کوئی تخصیص بھی نہیں ہوتی۔ پانی کا چشمہ تو ایک ہی طرح کا ہو سکتا ہے، ٹھنڈا میٹھا یا نمکین یا پھر کھاری یا بے ذائقہ۔ استاد ایسا چشمہ ہوتا ہے جس میں سب ذائقے موجود ہوتے ہیں اور وہ خوب جانتا ہے کہ کس وقت شاگرد کو کس طرح کے پانی کی ضرورت ہے وہ پھر اس کے ظرف اور ضرورت کے مطابق اسے نوازتا ہے اور جو شاگرد زرخیز مٹی سے نہیں بنے ہوتے، سخت زمین یا پتھر کی مانند ہوتے، وہ خود ہی استاد کی سیرابی سے کم فیض یاب ہو سکتے ہیں یا پھر محروم رہتے ہیں۔ جس میں ذرا نم ہو تو استاد

اسے ضرور زرخیز بنا دیتا ہے ورنہ اوپر اوپر ہی بہتا رہتا ہے۔

استاد ایک ماہر مالی کی طرح شاگرد کی نگہداشت بھی کرتا ہے ان کی پرورش کرتا ہے اور انہیں بار آور دیکھنے کی خواہش رکھتا ہے۔ وہ انہیں اپنے سے اونچا ہوتے دیکھ کر اپنی ایڑیاں نہیں اٹھا لیتا بلکہ اس کے پاؤں تلے ہاتھ رکھ کر اسے اور اونچا کر دیتا ہے۔ وہ شاگرد کے لیے کندھا تو بنتا ہے اس کا کندھا استعمال نہیں کرتا۔ اچھا شاگرد بھی مٹی کی دیواروں پر کھڑا ہونے کے بجائے اپنے استاد کے کندھوں پر کھڑا ہونا سعادت سمجھتا ہے۔ اس کی بھی خواہش ہوتی ہے کہ اس کی مضبوط بنیاد اس کا استاد ہی ہو، کوئی دوسرا عارضی یا جز وقتی سہارا نہ ہو۔

اچھے استاد کو شجر سایہ دار بھی کہا جاتا ہے جو اپنے سائے کے نیچے شاگردوں کو صرف اس وجہ سے نہیں رکھتا کہ ان پر کسی اور کا ''سایہ'' نہ پڑے یا وہ پنپنے نہ پائیں۔ وہ اپنا سایہ عاطفت انہیں گرم و سرد زمانہ سے بچانے کے لیے رکھتا ہے۔ وہ اپنے اردگرد سے خوراک بھی کشید کرتا ہے اور حوادث بھی، لیکن شاگردوں کو صرف خوراک دیتا ہے۔ ان کی جڑوں کو سیراب کرتا ہے اور خود اپنی مثال دے کر انہیں بڑا ہونے کی تحریک اور ترغیب دیتا ہے۔ جب اسے یقین ہو جاتا ہے کہ شاگرد اپنے پاؤں پر کھڑا ہو سکتا ہے تو وہ آہستہ آہستہ اس میں جذب ہونے لگتا ہے حتیٰ کہ وہ خود ختم ہو جاتا ہے اور شاگرد کے روپ میں اپنا نیا جنم لیتا ہے۔ غرض یہ کہ اچھا استاد وہی ہو سکتا ہے جو اچھا شاگرد بھی رہا ہو۔

استاد اور شاگرد کے تعلق پر مبنی یہ اور اس نوع کے متعدد معیارات و تصورات ہماری مذہبی تاریخ خصوصاً اسلامی تعلیمات کا حصہ رہے ہیں۔ جو آج کے مادیت پرست دور میں زوال آشنا ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ استاد اور شاگرد کا رشتہ اور تعلق کیسا ہونا چاہیے اور کیسا نہیں ہونا چاہیے؟ آئیڈیل یا مثالی استاد اور استاد کا روحانی باپ کا تصور کیا حقیقت اور معنویت رکھتا ہے؟ عقیدت مند اور نیاز مند شاگرد کون ہوتا ہے؟ صحیح اور سچے معنوں میں علم کے طالب کو کیسا ہونا چاہیے اور کیسا نہیں ہونا چاہیے؟ آج ان سوالات پر غور کرنا اور اپنے اپنے عمل اور رویے کی جانچ پرکھ کرنا ہر استاد اور شاگرد کے فرائض میں شامل ہے۔ یہ پہلے بھی رہا ہے لیکن آج اس کی کچھ زیادہ ہی ضرورت ہے کہ استاد اور شاگرد کے گہرے ربط اور تعلق کی پختہ روایت پامال اور بے حال ہوتی جا رہی ہے اور پیشہ پیغمبری اور حواری یا مرشد اور مرید کی یہ اعلیٰ اقدار جیسے کم اور گم ہو کر رہ گئی ہیں۔ اس قدر رفتہ کی رفتگی کے اسباب و علل جاننا نہایت ضروری ہے۔

خوش فکر استاد جناب ڈاکٹر نثار احمد قریشی (صدر شعبہ اردو علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی اسلام آباد) نہایت خوش قسمت ہیں کہ انہوں نے اس قدر رفتہ و گزشتہ کو محسوس کرتے ہوئے، اسے بحال کرنے اور استاد اور شاگرد کے تعلق کی موجودہ صورت حال کو ختم یا کم کرنے کی طرف توجہ دلانے کی سعادت حاصل کی ہے۔ یہ اعزاز اور امتیاز انہی کا ہے کہ انہوں نے ''دنیا جن سے روشن ہے'' کے نام سے کتاب مرتب کر کے استاد اور شاگرد کے گہرے قلبی اور روحانی تعلق کی دم توڑتی ہوئی روایت کی تجدید حیات کی طرف قدم اٹھایا ہے۔

''دنیا جن سے روشن ہے'' میں سے بیشتر اہل علم و قلم عہد حاضر کے استاذ الاساتذہ ہیں جنہوں نے اپنے مثالی اساتذہ کے بارے میں بیش قیمت تحریریں رقم کی ہیں۔ اس کتاب کے مقالات کو پڑھ کر مشرقی تہذیب و تمدن کی نمائندہ اور اسلام کے سانچے میں ڈھلی، عظیم شخصیات سے تعارف ہوتا ہے۔ نابغہ روزگار، آئیڈیل، ہمہ جہت اور ہمہ وقت استاد کا تصور ابھرتا اور اپنا انمٹ نقش چھوڑتا ہے۔ ''دنیا جن سے روشن ہے'' کے اہل قلم آج کے دور کے نامور اساتذہ ہیں جنہوں نے شاگرد بن کر ماضی کی یادوں کو سمیٹا اور اپنے محبوب اور مثالی اساتذہ کو یاد کیا ہے۔

نئی نسل استاد اور شاگرد، ہر دو کو ان کے مقام و مرتبے اور فرائض سے آگاہ کرنا ایک قرض تھا جسے ڈاکٹر نثار احمد قریشی صاحب نے بہ احسن چکایا ہے۔ یہ کتاب نہ صرف شاگردوں کو استاد کے مقام و مرتبے کو پہچاننے کا درس دیتی ہے بلکہ اساتذہ کو بھی اپنا زوال آشنا ہوتا مقام دوبارہ حاصل کرنے کے گُر بتاتی ہے، گویا بیسویں صدی کے مثالی اساتذہ کے تذکرے پر مبنی یہ کتاب رواں صدی کے اساتذہ کے لیے ارمغانِ علمی اور کتاب رہنما کا درجہ رکھتی ہے۔

قابل قدر اور لائق صد تحسین و آفرین ہیں ڈاکٹر نثار احمد قریشی صاحب کہ یہ عظیم خدمت ان کے حصے میں آئی اور مبارک باد کے مستحق ہیں قارئین کہ جنہیں استاد اور شاگرد کے تصورات و معیارات سے، ڈاکٹر صاحب کی اس کاوش علمی کے طفیل آگاہی اور آشنائی ہوگی۔ ڈاکٹر صاحب کی معصوم اور مطہر آرزو کو بر آنے کی امید کی جا سکتی ہے کہ:

''کیا بعید کہ ان اوراق کے مطالعے سے پھر کسی میں ڈپٹی نذیر احمد یا میر حسن بننے کی تڑپ پیدا ہو جائے''

## ہمدرد فاؤنڈیشن کراچی کی دو کتابیں

سیدہ مصباح رضوی

### ادبی مقالات سعید:

حکیم محمد سعید شہید کی شخصیت اور افکار آج بھی لوگوں کو عملی کاموں کی طرف راغب کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ ان افکار کو نئے لوگوں اور اگلی نسل تک پہنچانا یقیناً ایک خدمت اور کارِ خیر ہے۔ جناب مسعود حسن برکاتی لائق تحسین ہیں کہ انہوں نے اس کام کا بیڑا اٹھایا۔ انہوں نے ایک طویل عرصہ حکیم صاحب سے فیض حاصل کیا۔ وہ اس فیض سے دوسروں کو مستفید ہوتے دیکھنا چاہتے ہیں۔ اس سلسلے میں ان کی کوششوں کی ایک جہت یہ بھی ہے کہ وہ حکیم محمد سعید کے متعلق آرا کو مرتب کرتے رہتے ہیں۔ ''انکل محمد سعید''، ''کتابوں کی کتاب'' اور اب ''ادبی مقالات سعید''۔ ان کی یہ تازہ کاوش زبان و ادب پر حکیم محمد سعید شہید کی تحریروں پر مبنی ہے۔ ۱۰۴ صفحات پر مشتمل یہ کتاب ۲۰۰۰ء میں شائع ہوئی۔ حرف اول کے تحت مسعود احمد برکاتی نے بڑے سلیقے سے حکیم صاحب کے کاموں کا مختصر تعارف پیش کیا ہے۔ حکیم محمد سعید شہید براہ راست تو ادب کے آدمی نہ تھے مگر انہوں نے ادبی شخصیات اور ان کی کتابوں پر کئی ایک مضامین لکھے۔ مسعود احمد برکاتی نے ان کی ادبی تحریروں کو کتابی شکل دے کر نہ صرف ضائع ہونے سے بچایا ہے، بلکہ قارئین کی ضیافت طبع کا سامان بھی بہم پہنچایا ہے تاکہ وہ حکیم صاحب کے ادبی مزاج سے آشنا ہو سکیں۔ اس کتاب کے کل مضامین کی تعداد چھبیس (۲۶) ہے جو کہ درج ذیل چند ادبی موضوعات کا احاطہ کرتے ہیں:

- اردو بحیثیت قومی زبان
- ادب اور ادبی اصناف
- اقبال اور اقبال شناسی
- شعرا اور نثر نگاروں کی ادبی قدر بندی

مذکورہ موضوعات کے تحت ہمیں ایک طرف تو حکیم صاحب کے بصیرت افروز افکار سے آگاہی ہوتی ہے تو دوسری طرف ادب اور ادبی اصناف پر مباحث ملتے ہیں۔ حکیم صاحب نے اپنے ان مقالات میں سادہ گفتگو کے انداز میں بعض اہم ادبی

مسائل کی نشاندہی کی ہے اور اس سلسلے میں چند تجاویز بھی پیش کی ہیں۔ اردو زبان کی اہمیت اور ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے حکیم صاحب اس کی ترقی اور استحکام کو انتہائی ناگزیر خیال کرتے ہیں۔ وہ واضح طور پر اس بات کا پرچار کرتے ہیں کہ پاکستان کی بقا کے لیے دو الف ''اسلام اور اردو'' نہایت اہم ہیں۔ اردو میں حکیم صاحب کی سنجیدہ دلچسپی کی ایک اہم مثال یہ ہے کہ ہمدرد کی دفتری زبان اردو ہی ہے۔

حکیم صاحب کے خیال میں ادب کے ذریعے سے بہترین کام لیا جا سکتا ہے اور لوگوں کے دلوں کو بھلائی اور اچھے جذبات کی طرف راغب کیا جا سکتا ہے۔ ان کی رائے ہے کہ محض جدیدیت کے شوق میں نئے شعراء اور نثر نگاروں کو ادب کی روح کو فنا نہیں کرنا چاہیے۔ نعت کے حوالے سے فرماتے ہیں کہ نعت کو رسمی میلادوں کے چکر سے نکال کر اس انداز سے پیش کرنے کی ضرورت ہے کہ اس سے اصلاح ملت کا کام لیا جا سکے۔ یقیناً ان کی اس تجویز سے نعت کا دائرہ وسیع تر ہونے کا امکان ہے۔

''اقبال فہمی'' اور ''اقبال کا فلسفہ خودی اور عہد حاضر'' کے مضامین میں حکیم صاحب ایک نقاد اور شارح کی حیثیت سے اقبال کے فکر کی تصویر اس کے اشعار کی روشنی میں سامنے لاتے ہیں اور فلسفہ خودی اور مرد مومن کے تصور کی وضاحت کرتے ہیں۔

حکیم محمد سعید شہید اپنے مضامین ''ہمکلام''، ''ڈاکٹر شان الحق حقی''، ''آغا شاعر قزلباش''، ''عطاالحق قاسمی'' اور ''تہذیب و شائستگی کی شاعرہ'' میں شاعروں اور ادیبوں کے فن اور شخصیت کے تعارف کے ساتھ ان کے کام کی قدر بندی بھی کرتے ہیں۔ یہ مقالات حکیم صاحب کے تنقیدی شعور کو سمجھنے میں بہت مدد دیتے ہیں۔ ان کی بعض تحریروں میں خوشگوار اور دلچسپ مزاح کی جھلک بھی نظر آتی ہے۔ ''طبیب اور شاعر'' میں حکیم صاحب طبیب اور شاعر کے قریبی تعلقات کو ثابت کرنے کے بعد ایک مشاعرے کی صدارت کے لیے اپنے انتخاب کا جواز بڑے لطیف پیرائے میں بیان کرتے ہیں۔ مختصر یہ کہ زیر نظر کتاب ادب سے تعلق رکھنے والے افراد کے ذوق اور معیار پر پورا اترتی نظر آتی ہے اور ساتھ ہی حکیم صاحب کو ایک طبیب اور مصلح قوم سے ہٹ کر ایک ادبی دانشور کے طور پر بھی متعارف کرواتی ہے۔

## روبرو: شہید حکیم محمد سعید کے انٹرویو:

زیر نظر دوسری کتاب ''روبرو'' حکیم محمد سعید شہید کے انٹرویوز کا مجموعہ ہے جو ان کی شہادت کی دوسری برسی کے موقع پر ۲۰۰۰ء میں شائع ہوئی۔ اس کتاب کے مرتب رفیع الزماں زبیری ہیں۔ کتاب ۲۵۵ صفحات پر مشتمل ہے۔ مرتب نے انٹرویوز کو طب، تعلیم، قومی زندگی اور نجی زندگی کے عنوانات کے تحت چار حصوں میں ترتیب دیا ہے۔ موضوعات کے مضامین کو زبیری صاحب نے زمانی ترتیب دی ہے کہ جس کی وجہ سے ان کے کام اور کارناموں کے علاوہ ان کی فکری صلاحیت میں ارتقا کا پتہ چلتا ہے۔ جبکہ دو (۲) مضامین کے سنہ کا اندراج نہیں کیا گیا۔ پیش لفظ میں زبیری صاحب نے اس بات کا اظہار کیا ہے کہ ''روبرو'' میں انٹرویوز کا انتخاب پیش کیا جا رہا ہے۔ ان انٹرویوز کی کل تعداد اکیس (۲۱) ہے۔ جو ٹی وی اور مختلف اخبارات و رسائل کے لیے کیے گئے اور شائع بھی ہوئے۔ ان انٹرویوز میں حکیم صاحب کے افکار و نظریات، پسند و ناپسند، معمولات زندگی، خاندان و دیگر حالات اور علمی و ادبی اور فلاحی معرکوں کی مدد سے ان کی شخصیت کے نقوش واضح ہوتے ہیں۔ یقیناً کسی بھی شخصیت کا گہری نظر سے مشاہدہ کرنے کے لیے خطوط اور انٹرویوز ناگزیر حیثیت کے حامل ہوتے ہیں۔ حکیم صاحب کے پرجوش اور باعمل نظریات قاری کو حقیقتاً سماجی انقلاب کو ممکن بنانے کے لیے کچھ کر گزرنے کے طرف مائل کرتے ہیں۔ ''روبرو'' کا صوری حسن، رنگین تصاویر اور جلد وغیرہ طباعت کے اعلیٰ ذوق کا پتہ دیتی ہے۔

یہ دونوں کتابیں علم میں اضافے کے علاوہ سوچ میں مثبت تبدیلی لانے کا بھی پیش خیمہ ہوں گی۔

# ترک نادری عرف سیاحت نامۂ ہند

شفیق الرحمن

رقمزدہ: اعلیٰ حضرت جناب نادر شاہ سابق شہنشاہ، سابق ابن شمشیر ابن شمشیر، سابق مرحوم و مغفور، سابق وغیرہ وغیرہ

## پیش لفظ۔ عرف کرنا مرتب اس تزک کا ہمارا

آج جو اتفاق سے پرانی پوستین کو جھاڑا تو متعدد اشیاء کے ساتھ ہمارے خود نوشتہ اوراق کرم خوردہ بھی زمین پر گر پڑے، جنہیں ہم نے وقتاً فوقتاً لکھا تھا۔ پڑھا تو حیران رہ گئے۔ سوچا کہ سیاحت ہند کے بعد معترضین نے ہم پر جو طرح طرح کی افترا پردازی کی ہے کیوں نہ اس کے جواب میں یہ اوراق پیش کیے جائیں۔ اگرچہ ہم مقامی مورخین کی لگام بندی فرما چکے تھے تاہم غیر ملکی پریس نے واویلا مچا کر جو غلط فہمی پیدا کر دی ہے اس کا ازالہ بہت ضروری ہے۔ تصویر کا یہ رخ دکھا کر کیوں نہ معترضین کو ہمیشہ کے لیے خاموش کر دیں۔ اور پھر ہمیشہ سے لوگوں کو گلہ بھی رہا ہے کہ تاریخ عموماً غلط پیش کی جاتی ہے، تبھی ہمیشہ تاریخ کی غیر جانب دار اور مستند کتابوں کی کمی محسوس کی گئی ہے۔

خدا گواہ ہے کہ ہم ہندوستان محض حملے کی غرض سے ہرگز نہیں گئے۔ دراصل ہمیں اپنی دور افتادہ پھوپھی محترمہ سے ملاقات مقصود تھی، حملے کا خیال ہمیں راستے میں آیا۔ تخت طاؤس اور کوہ نور ہیرا ہم نے زبردستی ہرگز نہیں ہتھیایا، عزیزی محمد شاہ عرف رنگیلے میاں نے بصد منت سماجت ہمارے سامان میں یہ چیزیں بندھوا دیں۔ اور قتل عام؟ قتل عام کس مسخرے نے کرایا تھا؟ وہ تو ایک معمولی سا لاٹھی چارج تھا، یہ اور بات تھی کہ اہل ہند نحیف و نزار ہونے کی وجہ سے اس کی تاب نہ لا سکے۔ سنا ہے ہمارے متعلق لوگوں نے طرح طرح کی کہانیاں گھڑ لی ہیں۔ مثلاً شامت اعمال ماصورت نادر گرفت۔ ہمارے دل کو خصوصاً اس مثل نے سخت صدمہ پہنچایا ہے۔ یعنی اگر اس نادر سے مراد ہم ہیں تو ہم یقین دلاتے ہیں کہ یہ نادر کوئی اور شخص تھا۔ اگر ہمیں علم ہوتا کہ ہماری سیاحت کے بعد اس قدر غل غپاڑہ مچے گا تو واللہ کبھی ہند کا رخ نہ کرتے اور اگر دلی میں پتہ چل جاتا تو وہاں سے کبھی نہ لوٹتے۔

## والی کابل سے ناچاقی

مدت سے ارادہ تھا کہ والی کابل کی گوشمالی کریں۔ وہ لگاتار بلا کسی وجہ ہمارے خلاف زہر اگل رہا تھا۔ جب ہم نے خط لکھ کر اس خواہ مخواہ پراپیگنڈے کی وجہ پوچھی تو اور بھی زیادہ زہر اگلنے لگا۔ چنانچہ موسم کو مناسب پا کر حملہ آور ہوئے۔ غالباً ان لوگوں کو ہماری قوت کا غلط اندازہ تھا۔ ہم نے دریائے ہلمند کو جگہ جگہ سے کاٹ کر ان کے ہوش ٹھکانے لگا دیئے۔

دریائے ہلمند نہایت خوشنما دریا ہے۔ فرمانبردار خاں معروض ہوا کہ شاہان سلف کا رواج رہا ہے کہ حملہ کرتے وقت جو دریا راستے میں آئے تیر کر عبور کرتے ہیں۔ اس کے کہنے پر غلطی سے ہم نے بھی چھلانگ لگا دی اور شاہان سلف میں شامل ہوتے ہوتے بال بال بچے۔ کنارے کی طرف آنے کی بہت کوشش کی۔ ہم پوستین کو چھوڑتے تھے لیکن پوستین ہمیں نہ چھوڑتی تھی بمشکل

ہمیں باہر نکالا گیا۔ بڑے پشیمان ہوئے۔ تہیہ کیا کہ جب تک تیراکی کے ماہر نہ ہو جائیں پانی میں کبھی قدم نہیں رکھیں گے۔

## شہباز خاں کو خطاب کا عطیہ

مقامی باغ میں چند اُلو دکھائی دیے۔ یہاں کا اُلو ایرانی اُلو سے بڑا اور بہتر ہوتا ہے۔ اُلوؤں کا ایک جوڑا ہمارے ساتھ ہولیا۔ شام کو ہماری قیام گاہ کے پاس بسیرا کرتا اور رات بھر ہاؤ ہو مچاتا۔ ہم نے فرمانبردار خاں سے پوچھا کہ یہ جوڑا کیا چاہتا ہے؟ وہ بولا گستاخی کرتا ہے اور ہمیں واپس جانے کو کہتا ہے۔ ہم بے حد خفا ہوئے اور فرمانبردار خاں کو پاپوش مبارک سے زدوکوب کر کے سرفراز فرمایا۔ ساتھ ہی شہباز خاں کی رائے دریافت کی۔ وہ جاں نثار معروض ہوا کہ فال نیک ہے۔ اُلو جیسا منحوس پرندہ بھی ہم سے بلند طالع شہنشاہ کی آمد پر خوش آمدید کہتا ہے۔ ہم اس جواب پر خوش ہوئے اور نمک حلالی کی قدر کرتے ہوئے اس کو اُلو شناس کے لقب سے نوازا اور اس کے ہم جنسوں میں اس کی عزت افزائی فرمائی۔

## سیاحت ہند کا ارادہ

کابلی افواج کے ساتھ ہماری جنگ خاصی رہی۔ یہ ان تمام خصوصیات کی حامل تھی جس نے نادر شاہی جنگوں کو اس قلیل عرصے میں اس قدر حیرت انگیز شہرت بخشی۔ اب ماشاء اللہ نادر شاہی حکم، نادری قہر، نادر موقعے اور نادری حکومت بچے بچے کی زبان پر ہیں۔ والی کابل اپنے کیے پر نادم تھا اس نے وفاداری کا حلف اتنی مرتبہ اٹھایا کہ ہم نے تنگ آ کر منع کر دیا۔

شہباز خاں اُلو شناس ہر روز ملک ہندوستان کی خبریں سناتا کہ کابل سے میوہ جات کثیر مقدار میں ہند بھیجے جاتے ہیں اور اس کے بدلے تجار ہینگ، بھنگ، چرس و دیگر تفریحات لاتے ہیں۔ ہم نے اس ذکر میں دلچسپی لی تو اُلو شناس بھی چست ہو گیا۔ اس نے ہمیں پھوپھی محترمہ کی یاد دلا دی، جو غالباً ہند میں مقیم تھیں۔ حقیقت یہ تھی کہ ہم نے اپنی پھوپھی کا محض ذکر ہی سنا تھا۔ نہ کبھی انہیں دیکھا تھا اور نہ شرف ملاقات بخشا تھا۔ گستاخ فرماں بردار خاں کا خیال تھا کہ ہماری کوئی پھوپھی تھیں ہی نہیں۔ خیر، چونکہ کابل کی مہم اندازے کے خلاف بہت جلد ختم ہو گئی، سوچا کہ یہ بیکار وقت کیوں نہ سیاحت ہند میں صرف کیا جائے۔

ہمیں بتایا گیا کہ حملہ آوروں کی سہولت کے لیے اہل ہند نے دو راستے صاف کروا رکھے ہیں:۔

براہ افغانستان: خیبر ایجنسی۔ پشاور۔ لاہور۔ پانی پت۔ دلی

براہ بلوچستان: سمہ سٹہ۔ بٹھنڈہ۔ دلی

ہم نے پہلا راستہ پسند فرمایا کیونکہ بلوچستان کے راستے میں جیکب آباد پڑتا ہے جو دنیا کے گرم ترین مقاموں میں سے ہے۔

## کابل سے کوچ

چار گھڑی گزرنے پر کابل سے کوچ کیا۔ عمایدین شہر فصیل تک بلکہ جلال آباد تک چھوڑنے آئے۔ وہ آگے جانے نہ دیتے تھے۔ والی کابل مفارقت کا سوچ کر روتا تھا اور ہمارے ہمراہ سیاحت ہند میں شریک ہونے کی اجازت طلب کرتا تھا، لیکن ہم جانتے تھے کہ یہ رونا پیٹنا دکھاوے کا ہے، یہ لوگ بڑے کائیاں ہیں۔ ہمارے رخصت ہوتے ہی پراپیگنڈا دوبارہ شروع کر دیں گے اور پھر ہم اہل ہند پر مہمان نوازی کا زیادہ بوجھ ڈالنا قرین مصلحت نہیں سمجھتے تھے۔ چنانچہ اسے سمجھایا کہ جب ہم سیاحت ہند سے واپس لوٹ آئیں تب اس کا جانا زیادہ موزوں ہوگا۔ وہ پھر بھی روتا تھا۔ اسے ازراہ غریب پروری ایک ریشمی رومال آنسو پونچھنے کے لیے مرحمت فرمایا اور بڑی مشکل سے پیچھا چھڑایا۔

اس منزل سے کوچ کر کے ذرہ خیبر میں پہنچے۔ نہایت پرفضا مقام ہے۔ سکندر یونانی، محمود غزنوی اور دوسرے نامی سیاح بھی اسی راستے سے گزرے تھے۔ ہم نے بھی ان کے نقش قدم پر چلنے میں بہتری سمجھی۔ اس درے میں پرند، چرند، درند، انسان، بلکہ نباتات و جمادات تک نظر نہیں آتی۔ خداوند باری تعالیٰ کی کیا قدرت بیان کی جائے۔

مغل فوجدار نے پشاور سے کچھ دور آ کر سعادت آستاں بوسی حاصل کی اور مشورہ دیا کہ ہمارا واپس چلا جانا بہتر ہوگا کیونکہ اس موسم میں سیاحت لطف نہیں دیتی۔ اس نے دو سو مہر طلائی نذر کیں اور ایک مرصع گھوڑا بطور پیش کش گزارا۔ ہم نے بھی ازراہ مروت ایک دنبہ عنایت کر کے ٹالا۔ پشاور سے آگے شیر ملا۔ پہلی دفعہ دیکھا تھا طبیعت بڑی خوش ہوئی۔ بندگان درگاہ تو بھاگ گئے، ہم وہیں کھڑے رہے۔ ہم کو کھڑا دیکھتا رہا۔ یہ ایک گربہ کی مثال ہوتا ہے۔ نہایت نفاست پسند اور بورژوا قسم کا چوپایہ ہے۔ کچھ دیر ہمیں دیکھنے کے بعد اس درجہ مرعوب ہوا کہ بھاگ نکلا۔ اگلے روز ہمیں کسی نے بتایا کہ وہ شیر نہیں تھا کوئی اور چیز تھی۔ واللہ اعلم بالصواب۔

## سفر کا حال:

دریائے سندھ عبور کرنے کا ارادہ کر رہے تھے: معلوم ہوا کہ سید بایزید ابن یزید یزدانی آستاں بوسی کی سعادت کے متلاشی ہیں۔ جب بلایا تو دیکھا کہ فقط ایک آدمی تھا۔ ہم نے ازراہ تلطف اسے گلے سے لگا لیا اور پیار سے بھینچا۔ وہ بیہوش ہو گیا۔ اسے فوراً اٹھا کر باہر لے گئے۔ نخلۂ سنگھایا گیا، مالش کی گئی۔ دیر کے بعد اسے ہوش آیا تو وہ نذریں جو پیش کرنے لایا تھا لے کر رفو چکر ہوا۔ ہم نے اہل کاروں کو اس کے پیچھے دوڑایا کہ اگر خود نہیں آتا نذریں تو بھجوا دے، مگر اس کا کوئی پتہ نہ چلا۔

قلعے کا فوجدار ہماری سواری کے لیے ایک عجیب و غریب چوپایہ لایا جسے ہاتھی کہتے ہیں۔ نہایت پرشوکت فیل جسم جانور ہے۔ اس کے دو دانت ہوتے ہیں جو صرف دکھانے کے لیے ہیں۔ ناک جس کو سونڈ کہا جاتا ہے زمین کو چھوتی ہے۔ ہاتھی پر چڑھ کر آدمی دوسروں کے گھروں کے اندر سب کچھ دیکھ سکتا ہے۔ ہم نے سواری کا قصد کیا اور باگ ہاتھ میں لینی چاہی۔ وہ بولا اس کی لگام نہیں ہوتی ڈرائیور علیحدہ بیٹھتا ہے۔ ہم نے ایسے بے لگام جانور پر سواری سے انکار کر دیا۔

## لطیفہ:

سندھ کے علاقے سے وفد آیا کہ وہاں کے عمائدین بے تاب ہیں کہ ہم ان کو سرفراز فرمائیں۔ ساتھ ہی ایک مشہور خانقاہ کی گدی کی پیش کش بھی تھی۔ ہمیں بتایا گیا کہ اس ملک میں عجیب دستور ہے۔ کوئی گھاگ چند ہتھکنڈے دکھا کر بھولے بھالے انسانوں کو رام کر لیتا ہے۔ یہ شخص پیر کہلاتا ہے اور معتقدین مرید کہلاتے ہیں۔ مرید اپنی آمدنی کا ایک حصہ پیر کو باقاعدگی کے ساتھ نذر کرتے ہیں۔ پیر کوئی کام خاص کام نہیں کرتا۔ سوائے اس کے کہ کبھی کبھی کاغذ کے پرزوں پر کچھ لکھ دیتا ہے جنہیں تعویذ کہتے ہیں۔ ان تعویذوں سے بوڑھوں کے ہاں اولاد ہو سکتی ہے اور اولاد کے سرپرستوں کا انتقال بھی ہو سکتا ہے وغیرہ وغیرہ۔ یہ لطیفہ سن کر ہم بہت ہنسے کہ کسی نے کیا بے پر کی اڑائی ہے۔

لیکن جب اُلو شناس تین چار پیروں کو ہماری ملاقات کے لیے لایا تو ہمیں معلوم ہوا کہ لطیفہ دوسروں پر نہیں ہم پر ہوا ہے۔ پیروں کی زندگی کی طرح طرح کی دلچسپیاں اور ان گنت مشغلے۔ ہمارے منہ میں پانی بھر آیا۔ اپنی گزشتہ زندگی پر بڑا افسوس ہوا کہ ناحق خراب ہوتے پھرے۔ اگر پہلے سے پتہ ہوتا تو سیدھے ہندوستان پہنچ کر پیر بن جاتے اور مزے لوٹتے۔

ایسا سنہری موقعہ ملنے پر ہم نے خداوند تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ادا کیا اور وفد کے ہمراہ چلنے کا قصد ظاہر کیا لیکن اُلو شناس نے رائے دی کہ سندھ کے سیاسی حالات ہمیشہ کچھ ایسے ویسے ہی رہتے ہیں۔ چنانچہ اس تجویز کو التوا میں رکھا۔ اگر خدانخواستہ شہنشاہی کامیاب نہ رہی تو ضرور بضرور دربدر بن جائیں گے اور دل کی ساری امنگیں پوری کریں گے۔

انشاء اللہ العزیز!

## اختر شماری:

کل رات اختر شماری کی۔ دو سو پچاسی تارے گنے ہوں گے کہ نیند آ گئی باقی بشرط زندگی کل گنیں گے۔

## شتر غمزے:

مقامی قلعہ دار کی دعوت پر اس کے ساتھ گئے اور شتر غمزے ملاحظہ فرمائے۔ کافی محظوظ ہوئے کیونکہ ایران میں یہ چیز نہیں ہوتی، اور اس ملک میں عام ہے۔

## ایک مفید رسم:

جہلم کے قریب ایک قلعہ دار نے ہم پر دھاوا بول دیا لیکن فوراً ہی پھرتی سے قلعے میں محصور ہو گیا۔ ارادہ ہوا کہ اس کو اسی طرح محصور چھوڑ کر آگے بڑھ جائیں لیکن اُلو شناس ملتمس ہوا کہ نیا ملک ہے یہاں پھونک پھونک کر قدم رکھنا چاہیے۔ ہم نے فرمایا کہ اس طرح قدم رکھے تو دلی پہنچنے میں دیر لگے گی۔ اسے ڈر تھا کہ کہیں یہ لوگ عقب سے آ کر تنگ نہ کریں۔ اس روز ہمیں نزلہ سا تھا اور قصد لڑائی بھڑائی کا ہرگز نہ تھا۔ اُلو شناس کے اصرار پر دو دن تک قیام کیا لیکن کچھ نہ ہوا۔ تنگ آ کر ہم نے پوچھا کہ کوئی ایسی تجویز نہیں ہو سکتی کہ یہ معاملہ یونہی رفع دفع ہو جائے۔ اُلو شناس گیا اور جب شام کو لوٹا تو اس کے ساتھ ایک ہندی سپاہی تھا۔ اُلو شناس کے کہنے پر ہم نے سپاہی کو پانچ سو طلائی مہریں دیں۔ ابھی گھنٹہ نہ گزرا ہو گا کہ قلعے کے دروازے کھل گئے۔ ہم بڑے حیران ہوئے۔

ہند میں یہ ایک نہایت مفید رسم ہے۔ جب کٹھن وقت آن پڑے یا مشکل آسان نہ ہو تو متعلقہ لوگوں کو ایک رقم یا نعم البدل پیش کیا جاتا ہے۔ تحفے کی مقدار اور پیش کرنے کے طریقے مختلف ہوتے ہیں لیکن مقصد ایک ہے۔ اسے یہاں رشوت کہتے ہیں۔ کس قدر زود اثر اور کارآمد نسخہ ہے۔ اگر لاکھوں کے اٹکے ہوئے کام ہزار پانچ سو سے سنور جائیں تو اس میں ہرج ہی کیا ہے۔ رشوت دینے دلانے کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ اس عمل سے کرنسی حرکت میں رہتی ہے۔ ہم واپس ایران پہنچ کر اس رسم کو ضرور رائج کرائیں گے۔

ہمیں بتایا گیا کہ کچھ مہریں سپاہی نے اپنے استعمال کے لیے خود رکھ لی تھیں۔ باقی کوتوال کو دیں، جس نے اپنا حصہ لے کر بقیہ رقم قلعدار کے حوالے کی۔ قلعدار نے سنتریوں کو خوش کر کے دروازے کھلوا دیئے۔ واقعی یہ ملک عجوبہ روزگار ہے!

## گوجرانوالے میں قیام:

شیخ بوٹا شجر پوری ایک ایرانی النسل درویش ہیں۔ جو بڑے فاضل، ریاضت کار، مبارک نفس اور گوشہ نشین ہیں۔ گوجرانوالہ میں ان سے مل کر معرفت اور وجدان کی باتیں ہوتی رہیں۔ فیصلہ کیا کہ سب کچھ چھوڑ کر تارک الدنیا بنا جائے۔ پھر شبہ سا ہوا کہ کہیں یہ بھی پیر نہ ہوں۔ تحقیقات کرنے پر شبہ درست نکلا۔ آپ بڑے رنگیلے پیر ہیں اور پنجاب سے وادیٔ کانگڑہ کی طرف ہجرت کر رہے ہیں کیونکہ وہ علاقہ زیادہ رنگین ہے۔ دیر تک ان سے خفیہ باتیں ہوتی رہیں، جنہیں سینہ بسینہ رکھنے کا ارادہ ہے۔ یہ ملاقات کیا تھی گویا تجدید عہد شباب تھی۔

## ہمارا سنجیدہ ہو جانا:

گلستان بیکانیر سے ایلچی در دولت پر حاضر ہو کر ملتجی ہوا کہ چلیے مشتاقان دید اور راہ دیکھ رہے ہیں۔ تربوزوں کا موسم بھی ہے۔ ارادہ ہوا کہ کچھ دنوں کے لیے چلے چلیں مگر اُلو شناس کو حسب معمول شبہ ہوا کہ یہ کوئی چال ہے۔ بیکانیر لق و دق صحرا ہے۔ جس میں نہ پانی ہے نہ روئیدگی۔ یہ لوگ ہمیں صحرا میں چھوڑ کر بھوک پیاس سے ہلاک کرنا چاہتے ہیں۔

اس پر آنکھوں میں خون اتر آیا اور ہر چیز سرخ نظر آنے لگی۔ فوراً ایلچی کو بلوا کر الٹا لٹکوایا۔ جب پتا لگا کہ واقعی یہ چال تھی تو کھلوا کر سیدھا کیا۔ اس واقعے نے ہمارا موڈ خراب کر دیا۔ سوچا کہ اہل ہند سے کسی اچھے سلوک کی توقع کرنا حماقت ہے۔ کیوں نہ کسی بہانے اس ملک پر حملہ کر کے ان کی گوشمالی کریں۔ چنانچہ فرمانبردار خان کو حکم دیا کہ حملے کی چند وجوہات سوچے۔ اس نے یہ فہرست پیش کی:۔

۱۔ ہم بین الاقوامی مفاد کے لیے جنگی چالوں کی ایک کتاب ''رہنمائے حملہ آوران ہند'' لکھنا چاہتے ہیں۔

۲۔ ہندی گویے ترانوں کو ''نادر نادھیم تنانادھیم'' سے شروع کر کے ہماری توہین کرتے ہیں۔

۳۔ تاریخ میں اس سے پہلے ایران نے ہند پر باقاعدہ حملہ نہیں کیا۔

۴۔ ہند پر حملہ ہوئے کافی عرصہ گزر چکا ہے۔

۵۔ یوں بھی ان دنوں ہند پر حملے کا رواج عام ہے۔

ایسی بے معنی وجوہات معروض ہونے پر ہمیں غصہ آیا۔ ایک بھی بات خدا لگتی نہ تھی۔ قصد ہوا کہ فرمانبردار خاں سے وہی پرانا سلوک کریں۔ دیکھا تو وہ کبھی کا غائب ہو چکا تھا۔ بعد میں ہم نے خود ان سے بہتر وجوہات سوچنے کی دیر تک کوشش کی۔ جب کامیابی نہ ہوئی تو خوش ہو کر فرمانبردار خاں کو بحال فرمایا۔

## شاہدرے میں آمد آمد:

شاہدرے کے قریب ایک لڑکی نظر آئی۔ اس کی ہلکی ہلکی مونچھیں تھیں۔ چال ڈھال سب لڑکوں کی سی تھی۔ نام بھی عبداللطیف گویا مردانہ تھا۔ ہم نے پیش کاروں کو حکم دیا کہ اس کے باپ سے مل کر تحقیق کریں۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ عبداللطیف لڑکا ہی تھا اور کسی مقامی کالج میں پڑھتا تھا۔ خدا جانے ہم کو یہ کیسے خیال آیا کہ وہ لڑکی ہے۔

لاہور پہنچے ہی تھے کہ صوبیدار لاہور کے گوریلا دستوں نے ہم پر حملہ کر دیا۔ ہمارے سپاہی جدید جنگی طریقوں سے ناواقف تھے اور صوبیدار موصوف نہ صرف ہفت ہزاری تھا بلکہ گوریلا لڑائی کا ماہر تھا۔ ہم نے بھی فوراً چڑیا گھر سے سارے گوریلے نکال کر سدھائے۔ گھمسان کا رن پڑا۔ گوریلے گوریلے پر ٹوٹ پڑا اور سپاہی تماشا دیکھتے رہے۔ دشمن نے لڑائی کا رخ بدلا۔ صوبیدار ہمیں گھیرے میں لینے کی کوشش کرنے لگا اور ہم اسے دونوں فوجیں بار بار ایک دوسرے کے قریب سے کنی کترا کر گزر جاتیں۔ گرم جوشی کا یہ عالم تھا کہ گھیرے میں لینے کی کوشش میں آخر کار صوبیدار فوج سمیت جہلم جا پہنچا اور ہم فیروز پور غلطی کا احساس ہوا تو واپس لوٹے۔ اُلو شناس کے مشورے پر صوبیدار پر ہند کا مروجہ کارآمد نسخہ رشوت آزمایا اور شکست فاش دی۔ شکست دینے کے بعد ہم نے اس سے ہفت ہزار بصد دقت وصول کیا۔ شام کو اُلو شناس کچھ اور منصب داروں کو لایا جو بالترتیب پنج ہزاری،

سہ ہزاری، دو ہزاری تھے۔ انہیں کئی روز گرفتار رکھا تب کہیں دس ہزار روپیہ وصول ہوا۔ دیکھتے دیکھتے عہدیداروں کی قیمتیں گرنے لگیں لوگ پنج صدی، پونے دوصدی، ایک سینکڑی اور پچاسوی تک پہنچ گئے۔ یہ لوگ بڑے لالچی ہیں۔ ایک روز کا ذکر ہے کہ کوئی ہزاری بہت چلایا کہ وہ ہزارہ کا رہنے والا ہے۔ لیکن ہم نے اپنا اصول ترک نہیں کیا۔

## لاہور سے روانگی:

چاہیے تو یہ تھا کہ ان علاقوں میں چند روز رہ کر داد عیش و کامرانی دیتے۔ مگر یہاں کی پرانی رسم ہے کہ وہ سیاح جو درہ خیبر سے آتے ہیں انہیں سیدھے دلی جانا پڑتا ہے۔ راستے میں کہیں نہیں ٹھہر سکتے۔

جہلم، چناب، راوی عبور کر چکے تھے۔ ستلج کو عبور کیا اور پنجاب کے پانچویں دریا کو بہت ڈھونڈا۔ خبر ملی کہ بیاس تو پہلے ہی ستلج سے مل چکا ہے۔ سخت مایوسی ہوئی۔ مصاحبین نے دست بستہ عرض کی کہ اہل ہند کا دستور ہے کہ حملہ آوروں سے اس علاقے میں ضرور لڑتے ہیں۔ اس کے لیے پانی پت، تراوڑی وغیرہ کے میدان مخصوص ہو چکے ہیں۔ ہم نے فرمایا کہ لڑیں تو تب اگر مقابلے میں کوئی فوج آئی ہو۔ معلوم ہوا کہ حملہ آوروں کو انتظار کرنا پڑتا ہے۔ کیونکہ اگر اہل ہند اس علاقے میں نہ لڑیں تو پھر کہیں نہیں لڑتے۔

محمد شاہ کو ہماری تشریف آوری کا علم ہو چکا تھا۔ ایک مرتبہ تو اس نے ایلچی کو خط اور لفافے سمیت شراب کے مٹکے میں دھکیل دیا اور بولا۔ ایں ایلچی بے معنی غرق مے ناب اولی، کسی طبلچی نے حافظ کا یہ مصرع صحیح کرنا چاہا تو محمد شاہ نے اسے بھی مٹکے میں دھکیل دیا۔ آدمی باذاق معلوم ہوتا ہے۔

## ہمیں تحفہ دینے کا نتیجہ:

دلی سے ایک درباری قدم بوسی کے لیے حاضر ہوا۔ تحفے تحائف سے لدا ہوا تھا۔ اس لیے ہم نے بلا لیا۔ بولا، شہنشاہ سنا ہے کہ آپ تبدیلی آب وہوا کی غرض سے اس طرف تشریف لائے ہیں۔ جہاں تک آب وہوا کا تعلق ہے اس ملک کو یہاں ختم سمجھیے۔ اس سے آگے سخت گرمی پڑتی ہے۔ رعایا کی التجا ہے کہ آپ دو کروڑ کی حقیر رقم بطور سفر خرچ قبول فرما کر یہاں سے مراجعت فرما جائیں۔ ہمیں رضامند پا کر وہ نابکار بغلیں بجانے لگا۔ ڈانٹا تو معلوم ہوا کہ یہاں کا رواج ہے۔ ایک تو یہاں کے رسم ورواج نے ہمیں عاجز کر دیا ہے۔ واپسی کے لیے سامان بندھوا رہے تھے کہ اُلو شناس نے شبہ کرا دیا کہ اہل ہند ہم پر اپنا محبوب نسخہ استعمال کر رہے ہیں۔ یہ رقم ہمیں تحفۃً پیش کی جا رہی ہے۔ شام کو وہی درباری بغلیں جھانکتا ہوا پھر حاضر ہوا اور دلی چلنے کی ترغیب دینے لگا۔ عجب ڈھل مل یقین لوگ ہیں۔ اُلو شناس نے اصل وجہ بتائی جب درباری مذکور دلی دربار میں پہنچ کر انعام کا خواہاں ہوا تو کسی نے پوچھا تک نہیں، بلکہ خان بہادر کا خطاب کسی حریف کو مل گیا۔ اس نے جل بھن کر دھمکی دی کہ ٹھہرو، ابھی لاتا ہوں نادر شاہ کو۔

ہم نے سوچا کہ اب اتنی دور آ گئے ہیں تو دلی دیکھ کر ہی جائیں گے۔ کرنال کے مقام پر محمد شاہی فوج دکھائی دی جو ہمیں دیکھتے ہی ادھر ادھر ہو گئی۔ ہم نے کہلوا کر بھیجا کہ ہماری خواہش ہے کہ اس جنگ کو تاریخ میں پانی پت کی تیسری لڑائی یا کرنال کی پہلی لڑائی کا رتبہ ملے۔ اس پیغام پر باقی ماندہ فوج بھی بھاگ نکلی۔

## قطب صاحب کی لاٹھ:

نزول اقبال دلی کے باہر ہوا۔ قطب صاحب کی لاٹھ کے پاس نادر شاہی جھنڈے گاڑے گئے۔ یہ لاٹھ قطب صاحب کی تعمیر کردہ ہے۔ لیکن اس کا مقصد سمجھ میں نہیں آتا۔ پتہ نہیں قطب صاحب کا ارادہ کیا تھا۔ فرمانبردار خان نے عرض کیا کہ غالباً قطب صاحب آسمان تک پہنچنا چاہتے تھے لیکن تجویز کو تکمیل تک نہ پہنچا سکے۔ بصد وقت ہم اوپر تشریف لے گئے۔ واقعی بہت اونچا مینار ہے۔ آسمان یہاں سے کافی قریب ہے۔ ستانے کے بعد نیچے تشریف لائے۔

## حملہ آوری اور برادرم محمد شاہ کی ہماری ذات سے عقیدت:

صبح سے محمد شاہ اپنا لشکر لے کر سامنے آیا ہوا تھا مگر ابھی تک سعادت زیارت سے مشرف نہ ہوا تھا۔ دوپہر کو ایک ایلچی رنگین جھنڈا لہراتا آیا اور معروض ہوا کہ ''محمد شاہ صاحب نے دریافت کیا ہے کہ حملہ کرنے کا کس وقت ارادہ ہے؟'' ہم نے پوچھا ''اے حملہ کیسا؟'' ایلچی نے عرض کیا..... ''خداوند نعمت وہ تو عرصے سے آپ کے حملے کے منتظر ہیں۔ اتنے دنوں سے تیاریاں ہوتی رہی ہیں۔ اگر حملہ نہ ہوا تو سب کو سخت مایوسی ہوگی۔ کل بارش کی وجہ سے لشکر اکٹھا نہ ہو سکا اور پھر یہ رسم چلی آتی ہے کہ درہ خیبر سے آنے والے.....'' ''بس بس! آگے ہمیں پتہ ہے''۔ ہم نے اسے ڈانٹا۔

مجبوراً ہم نے حملے کا حکم دے دیا۔ لیکن لڑائی کا لطف نہ آیا۔ وہ لوگ فوراً تتر بتر ہو گئے۔ ہم شہر کے بڑے دروازے میں داخل ہوئے تو عزیزی محمد شاہ نے پھولوں کا ہار پہنایا۔ گھوڑے سے اتر کر بغل گیر ہوئے، اس کے بعد دو دن تک محمد شاہ کا کوئی پتہ نہ چلا۔

دلی میں نازل ہو کر ہم نے اور بندگان درگاہ نے خوب دادِ عیش دی کہ شیوۂ سیاحاں ہے۔ حمام گئے، الحمدللہ کہ آج پورے ایک سال کے بعد غسل فرمایا۔ صبح سے شام تک تختِ طاؤس پر بیٹھ کر شغلِ خورد ونوش وخوش فعلیوں اور خوش گپیوں سے اپنے دل کے بوجھ کو ہلکا کرتے اور رعایا کو اپنے دیدار سے فیضیاب کرتے۔ ہمارا ذاتی خیال ہے کہ ہمارے جیسا صاف باطن اور نیک دل بادشاہ تاریخ میں کوئی نہ ہوا ہوگا۔ سکندر نے پورس سے جو سلوک کیا اس سے کہیں بہتر سلوک ہم نے عزیزی محمد شاہ سے کیا۔ ہر چند کہ اس کی رنگین مزاجی ہمیں نہ بھاتی تھی، اس کو مانند اپنے عزیز کے سمجھا۔ حق تو یہ ہے کہ اس نے ہماری اتنی خدمت کی کہ کیا کوئی اپنے بزرگ کی کرتا ہوگا۔

ہمیں شاہی مہمان خانے کے بہترین حصے میں ٹھہرایا گیا جو مرہٹوں کے لیے مخصوص تھا۔ عزیزی محمد شاہ نے شام کو ہمارے لیے مسواکیں، لباس شب خوابی، سلیپر وغیرہ بھیجے۔ چادریں اور غلاف بدلوائے۔ یہ اور بات تھی کہ ہم راستہ بھول گئے اور نہ جانے کہاں پوستیں سمیت سیڑھیوں پر سو گئے۔ لال قلعہ باہر سے تو سیدھا سادا سا قلعہ معلوم ہوتا تھا لیکن اندر نفیس ونازک عمارتوں اور خوشنما باغوں کی بھول بھلیاں میں ہمیں گائیڈ کی ضرورت محسوس ہوا کرتی۔ ہماری آمد کی خبر پا کر (غالباً ہمیں متاثر کرنے کی غرض سے) حکومت ہند نے امتناع شراب کے احکامات جاری کر دیے تھے لیکن عزیزی کی وساطت سے ہمارے سپاہیوں کے لیے پینے پلانے کا انتظام ہو ہی جاتا تھا۔

## تختِ طاؤس:

ایک دفعہ جب ہم متواتر دس گھنٹے تختِ طاؤس پر بیٹھے رہے تو عزیزی بولا: ''معلوم ہوتا ہے کہ تختِ طاؤس سے آپ کو ازحد انس ہو گیا ہے۔ اگر آپ کا اس درجہ طویل قیام تختِ طاؤس کی وجہ سے، تو چشم ما روشن دل ما شاد۔ آپ اسے بخوشی لے جا سکتے ہیں''۔

ایسے خلوص ومحبت سے کس کا دل نہ پسیج جاتا۔ ہم نے اسے یقین دلایا کہ ہم جب یہاں سے عازم ایران ہوئے تختِ طاؤس ہمراہ لے جائیں گے۔ ہم انکار کر کے اس کا دل نہیں دکھانا چاہتے تھے۔

کچھ دیر سوچنے کے بعد اس نے پوچھا۔ ''دلی کو اپنی ذات بے مثال سے محروم کرنے کی تاریخ سے مطلع فرما دیا جائے تا کہ اہل دلی کو بتا دیا جائے۔ وہ اس دن کے لیے گھڑیاں گن رہے ہیں''۔

''گھڑیاں کیوں گن رہے ہیں؟ کیا وہ ہم جیسے مشفق بزرگ کو بن بلایا مہمان سمجھتے ہیں؟'' ہم نے غیض و غضب میں فرمایا۔

''جی نہیں، آپ نے غلط سمجھا۔ وہ الوداعی پارٹیوں کا انتظام کرنا چاہتے ہیں''۔ وہ بولا۔

''ہمیں ان گلیوں کو چھوڑنے کی کوئی ایسی جلدی نہیں، جن کے متعلق کوئی استاد ذوق شعر کہیں گے''۔ ہم نے فرمایا۔

''یوں ٹھہرنے کو آپ چھ ماہ، سال، دس سال ٹھہریے۔ بلکہ ایران کا دارالخلافہ دلی کو بنوا لیجیے''۔ عزیزی بڑی محبت سے ملتمس ہوا۔

''دیکھا جائے گا.........'' ہم نے بھی محبت سے فرمایا۔

## وہ گلقند والا قصہ:

بات کچھ بھی نہ تھی۔ مغلئی دستر خوان کی مرچیں ہمیں تیز معلوم ہوئیں تو حلوے کے مرتبان کی طرف متوجہ ہوئے۔ بمشکل کوئی پاؤ بھر حلوہ کھا سکے ہوں گے کہ فرماں بردار خاں نے بڑی بدتمیزی سے مرتبان ہمارے ہاتھ سے چھین لیا۔ اس معمولی واقعے پر لوگوں نے اتنا لمبا چوڑا افسانہ تراش لیا۔ ہمیں ہرگز علم نہ تھا کہ مرتبان میں حلوے کی جگہ گلقند ہے اور اگر علم ہوتا بھی تو کیا فرق پڑ جاتا۔

## ہنوز دلی دور است:

اس فقرے کو ہم نے اہل دلی کا تکیہ کلام پایا۔ جب ہم خیبر میں تھے تو سنا کہ ہمارے لیے ہنوز دلی دور تھی۔ جب لاہور پہنچے تب بھی دور رہی۔ لال قلعے میں پہنچ کر بھی لوگوں کا یہی خیال ہے کہ ہنوز دلی دور است۔ اچھا بھئی چلو دلی دور است......بس!

## محمد شاہ دربار:

مسز محمد شاہ لال قلعے میں اس دھوم دھڑلے سے رہتی ہیں کہ کانوں پڑی آواز سنائی نہیں دیتی۔ سیاسی دنگے فساد میں ہمیشہ ان کا ہاتھ ہوتا ہے۔ ملک کی خارجی و اندرونی پالیسی (جب کبھی اتفاق سے ہوتی ہے) وہ خود ترتیب دیتی ہیں۔ یہاں تک کہ اعلیٰ حکاموں کی پوسٹنگ وغیرہ بھی وہ خود ہی کرتی ہیں۔ وہ فارسی، ہندی، سنسکرت اور مدراسی بول سکتی ہیں۔ لیکن دیگر بیگمات کا خیال ہے کہ وہ سمجھ کوئی زبان بھی نہیں سکتیں۔ (ویسے دیگر بیگمات کا ہمیشہ کچھ اور ہی خیال ہوا کرتا ہے) ساری بیگمات بے حد ذہین ہیں۔ ایک برجیس جہاں بیگم نے برجس کو دیکھ کر چوڑی دار پائجامہ ایجاد کیا۔ دوسری نے شلوار کو ساڑھی سے ضرب دے کر دو پر تقسیم کر دیا اور غرارہ دریافت کیا۔ تعجب ہے کہ یہ خیال اسے علی الصبح غرارے کرتے وقت آیا۔

صبح شام شہر کی چیدہ چیدہ خواتین حاضر ہو کر آداب بجا لاتی ہیں اور شہر کی دوسری چیدہ چیدہ خواتین کے بارے میں تازہ ترین افواہیں سناتی ہیں۔

عزیزی محمد شاہ بھی لال قلعے ہی میں وہیں کہیں رہتا ہے۔

اس کا خیال ہے کہ وہ ہندوستان کا بادشاہ ہے۔ لہٰذا اپنے تئیں شہنشاہ ہند کہلاتا ہے۔ رنگین خواب دیکھتا ہے، رنگین لباس پہنتا ہے، رجعت پسند ادب اور غزل پسند شاعری کا گرویدہ ہے۔ لیکن حرکتیں سب ترقی پسند کرتا ہے۔

کل وزیر جنگ نے بتایا کہ ملک کے کچھ اور حصوں نے خود مختاری کا اعلان کر دیا ہے۔ عزیزی محمد شاہ خوش ہو کر کہنے لگا۔

''اب ملک کا بیشتر حصہ خود مختار ہو چکا ہے۔ جتنے صوبے اور ریاستیں خود مختار ہوں گی اتنا ہی ہمارا کام کم ہو جائے گا۔ ملک کے ریاستوں میں بٹتے ہی ان کی ریاست ہائے متحدہ بنانے کا ارادہ رکھتا ہوں''۔

عزیزی کے تعلقات مرہٹوں کے ساتھ ضرورت سے زیادہ خوشگوار ہیں۔ جب مرہٹے بیکار ہوتے ہیں تو سیدھے دلی آ دھمکتے ہیں۔ پچھلے ماہ آئے تھے تو نربدا، چنبل اور مالوہ کے علاقے لے کر ٹلے۔ خیر ہمیں کیا عزیزی جانے اور اس کا کام۔

ہندی فوج کو دیکھ کر ہمیں بڑی حیرت ہوئی۔ لڑتے جاتے ہیں تو پالکیوں میں بیٹھ کر میدان جنگ میں ڈھال ملازم اٹھاتا ہے۔ ہر وقت صلح کے خواہاں ہیں۔ ہر سپاہی کی وردی مختلف ہے۔ کرنال میں ہم سے لڑنے آئے تو جیسے عید کے کپڑے پہن رکھے تھے۔ ہمیں زیادہ نکتہ چینی نہیں کرنی چاہیے۔ انسان خاک کا پتلا ہے۔

## مینا بازار اور ہم:

محمد شاہ کے بزرگوں کے وقت سے رسم چلی آتی ہے کہ موسم بہار میں لال قلعے میں مینا بازار لگتا ہے جس میں طرح طرح کی دکانیں سجائی جاتی ہیں۔ دکانوں سے زیادہ بیگمات سجتی ہیں اور مختلف اشیا بازار سے چوگنے نرخ پر خریدتی ہیں۔ ان دنوں تو ذرا سے بہانے پر مینا بازار لگ جاتا ہے۔ ہماری طبیعت حاضر تھی۔ محمد شاہ سے مینا بازار دیکھنے کی خواہش ظاہر کی۔ اس نے ٹالنا چاہا۔ ہم نے اسے بتایا کہ ہم بزرگ بھی ہیں۔ وہ بولا کہ اگر آپ کو اتنا ہی شوق ہے تو چند روز سمند شوق کو لگام دیجیے۔ اس مینا بازار کے ختم ہوتے ہی ایک مردانہ مینا بازار کا انتظام کرائے دیتا ہوں جس میں سب مرد ہی مرد ہوں گے۔ پوچھا کہ ہم زنانہ شو میں کیوں نہیں جا سکتے؟ کہنے لگا کہ اس میں سوائے بادشاہ ہند کے کسی کا گزر نہیں ہو سکتا۔ ہم نے فرمایا کہ کچھ دیر کے لیے ہمیں بادشاہ ہند ہی سمجھ لیا جائے۔ آدمی عقلمند تھا، مان گیا۔

ہمارا فرزند علی قلی خاں جو بائیس سال کا ہونے کے باوجود اپنے آپ کو نابالغ سمجھتا ہے اور اپنے ہم جنسوں کی صحبت کی بجائے عورتوں میں اٹھنے بیٹھنے کو ترجیح دیتا ہے، ہمارے ساتھ مینا بازار جانے پر مصر ہوا۔ دیکھا کہ ہر طرف نازنینانِ گل بدن رنگ برنگے ملبوس پہنے چہلیں کرتی ہیں۔ نہ نگاہیں نیچی ہیں، نہ دوپٹے کا خیال ہے۔ دیکھ کر آنکھوں میں خون اتر آیا (آج صبح بھی ایک مرتبہ خون اترا تھا) ہمارے بارے میں سب کو علم ہو چکا تھا۔ ہمیں گھیر لیا گیا، ہمارے آٹوگراف لیے گئے، ساتھ ساتھ مناسب اشعار لکھنے کو کہا گیا۔ ہم سے طرح طرح کے پریشان کن سوالات پوچھے گئے۔

ارادہ ہوا کہ کچھ زنانہ سامانِ آرائش ایران لے جانے کے لیے خریدیں، پھر سوچا ہمارے واپس پہنچتے پہنچتے کہیں فیشن نہ بدل جائے۔

ایک ماہ رو نظر پڑی کہ کچھ سامان لیے جاتی ہے۔ ایک دکان کے سامنے اس نے آواز دی۔ قلی! قلی!! کیا دیکھتے ہیں کہ پس ناخلف علی قلی خدا جانے کہاں سے بھاگتا ہوا آیا اور اس کا سامان اٹھا لیا۔

''تم قلی ہو......؟'' اس نے پوچھا۔

''ہاں......بالکل......'' علی قلی نے جواب دیا۔

اگرچہ ہم علی قلی کے اس قسم کے قلی بن جانے پر خفا تھے مگر اس کی حس مزاح پر حیرت ہوئی کیونکہ ہمارا خاندان اس حس سے بے بہرہ ہے۔ ہم میں خود مذاق برداشت کرنے کی تاب نہیں۔ کچھ دیر بعد جب غلطی کا ازالہ ہوا تو نازنین بے حد محظوظ ہوئی اور بڑی معصومیت سے پوچھنے لگی ''آج شام کو آپ کیا کر رہے ہیں؟''

''کوئی خاص کام نہیں''۔ علی قلی نے جواب دیا۔

''مست قلندر صاحب کے عرس پر ایک سرکس آیا ہوا ہے.....'' وہ بدستور معصومیت سے بولی۔

''میں پہلے شو کے لیے دو نشستیں بک کرالوں گا اور باہر ٹکٹ گھر کے پاس انتظار کروں گا۔ خدا حافظ! میرے ابا مجھے گھور رہے ہیں''۔ علی قلی بھاگا۔

شام کو ہم اس کے کمرے میں گئے تو دیکھا کہ آئینے کے سامنے کھڑا مونچھیں تراش رہا ہے۔ باز پرس کی تو بولا عرس پر جا رہا ہوں۔ ہم نے پوچھا ٹکٹ کی قیمت کون دے گا۔ اس کے منہ سے نکل گیا کہ انکل محمد شاہ نے دو سیٹیں بک کرا دی ہیں۔ پوچھا دوسری کس کے لیے ہے تو چپ ہو گیا۔

''نامعقول! ایسے ہجوم میں جا کر خواہ مخواہ سیکنڈل کرائے گا.....'' ہم نے گرج کر کہا۔ ''کچھ ہماری پوزیشن ہی کا خیال کر.....''

''ابا جان میں وعدہ کر چکا ہوں.....'' اس نے ایسے عدم تشدد انہ انداز سے کہا کہ ہم لوٹ آئے۔

## ہندی کلچر:

ہندی کلچر کی بے حد تعریفیں سنی تھیں، چنانچہ دیکھنے کا شوق تھا (حملے کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی تھی۔ فرمانبردار خاں کو وقت پر سوجھتی نہیں)۔

عزیزی محمد شاہ سے ذکر کیا۔ وہ بولا کلچر وغیرہ کا تو پتہ نہیں۔ آپ نے ایگری کلچر سنا ہوگا۔ وہ البتہ مشہور ہے۔ ہم مصر ہوئے تو کہنے لگا آپ سنی سنائی باتوں کا یقین نہ کیجئے ویسے ہمارے ہاں چند ایک باتیں واقعی شہرہ آفاق ہیں۔ ایک تو یہی قدیمی دواخانے جن کے اشتہار آپ چپے چپے پر دیکھتے ہیں۔ دوسرے قدیم روایات جن کے لیے بھیس بدل کر شہر میں چلنا ہوگا۔ چنانچہ ہم دونوں گئے۔ ایک جگہ ایک شخص (جو کہ مدرس تھا) بھینسوں کے آگے بین بجا رہا تھا اور بھینسیں متوجہ نہیں تھیں۔ ایک سیاسی جلسے میں بہت سے حضرات اپنے سامنے ڈیڑھ ڈیڑھ اینٹ رکھے عبادت میں مشغول تھے۔ وہیں ایک شخص کہ باغیرت معلوم ہوتا تھا چلو میں پانی لیے ناک ڈبونے کی کوشش کر رہا تھا۔ ایک جگہ دو حکام شہر ایک پرندے کو کھینچ کر سیدھا کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ پرندہ اُلو تھا۔ ایک نہایت ضعیف بزرگ قبر کے کنارے پاؤں لٹکائے نوجوانوں پر تنقید کر رہے تھے۔ محمد شاہ کے متعلق تو ہم کہہ نہیں سکتے البتہ ہم از حد محظوظ ہوئے۔

## علی قلی کی گستاخی اور ہمارا تحمل:

آہستہ آہستہ برخوردار علی قلی اور اس لڑکی کا قصہ مشہور ہوتا جا رہا تھا۔ سوچا کہ اس معاملے کو فوراً ختم کیا جائے۔ چنانچہ اس کے کمرے میں گئے، وہ آئینے کے سامنے کھڑا بال گھنگھریالے بنانے کی کوشش کر رہا تھا۔ ہمیں دیکھ کر بولا۔ ''ابا جان معاف فرمایئے۔ دروازہ کھٹکھٹائے بغیر اندر آنا موجودہ آداب کے خلاف ہے.....''

ہمیں سخت غصہ آیا۔ یہ نئی پود ہمیں آداب سکھائے گی۔ یہ لڑکا دن بدن بگڑتا جا رہا ہے۔

''ہم تجھے جگالی کرتے دیکھ رہے ہیں..... جب سے دلی آیا ہے ہر وقت منہ چلتا رہتا ہے۔ کیا ہے تیرے منہ میں.....؟''

''پان کھا رہا ہوں۔ کسی نے دیا تھا''۔ وہ بولا۔

''یہ کسی کون ہے؟ وہی عرس والی لڑکی تو نہیں.....؟ وہ تو بے حد معمولی سی ہے.....'' ہم نے فرمایا۔

''ابا جان اس کی ٹھوڑی پر جو وہ خوشنما تل ہے وہ نہایت بھلا معلوم ہوتا ہے''۔

''مصیبت تو یہ ہے کہ آج کل کے نوجوان ایک خوش نما تل پر عاشق ہو کر سالم لڑکی سے شادی کر بیٹھتے ہیں.....''

''ابا جان محبت بہت بری چیز ہے.....'' وہ سرد آہ کھینچ کر بولا۔

''تو سپاہی ہے تجھے تلوار اور گھوڑے سے محبت ہونی چاہیے۔ ہم خود گھوڑوں کو چاہتے ہیں۔ گھوڑے جب پیار کریں تو ساڑیوں اور زیورات کی فرمائش نہیں کرتے''۔

''ابا جان بات دراصل یہ ہے کہ مجھے.....اس سے.....''

''خبردار۔ گستاخی کرتا ہے۔ جانتا نہیں کہ تو نادر شاہ ابن شمشیر ابن شمشیر کی اولاد نا خلف ہے''۔

''آپ کا مطلب ہے کہ دادا جان کا نام شمشیر تھا؟ شمشیر شاہ.....؟''

''اے گستاخ! شمشیر سے مراد تلوار ہے۔ سمجھا؟''

''سمجھ گیا..... ابا جان کیا آپ مجھے چار روپے آٹھ آنے دے سکیں گے۔ سرکس کے لیے''۔

ایسے نالائق کو ہم اور کیا کہہ سکتے ہیں۔

## ہمارا اصلاحات رائج کرنا:

مصاحب حضوری حقہ بردار خاں معروض ہوا کہ شہنشاہوں کا رواج رہا ہے کہ رعایا کی بہبود کے لیے حسب توفیق اصلاحات نافذ کرتے ہیں۔ کیا ہی اچھا ہو کہ ہم بھی چند مفید اصلاحات عمل میں لائیں تا کہ اہل ہند ہمیں رہتی دنیا تک یاد کیا کریں۔ ہم حیران ہوئے کیونکہ ہمارے خیال میں ہماری ہر حرکت میں اہل ہند کے لیے کوئی نہ کوئی اصلاح پوشیدہ تھی۔ جب دیکھا کہ وہ پیچھا ہی نہیں چھوڑتا تو کافی غور و خوض کے بعد مندرجہ ذیل فہرست مرتب فرمائی:

۱۔ درہ خیبر کو ڈھا کر ہموار کرایا جائے۔ وہاں سے دلی تک دس دس میل کے فاصلے پر عالیشان سرائیں تعمیر کرائی جائیں تا کہ حملہ آوروں کو کسی دقت کا سامنا نہ ہو۔ سڑک پر جگہ جگہ ''خوش آمدید'' نصب کیا جائے۔ ساتھ ہی ایک محکمہ کھولا جائے جو دوسرے ملکوں میں نشر و اشاعت کے ذریعے لوگوں کو ہند میں آنے کی ترغیب دے۔

۲۔ ستلج اور جمنا کے درمیان ایک وسیع علاقہ خشک اور غیر آباد پڑا ہے۔ اس قطعے کو سیراب کرنے کے لیے ایک عظیم الشان دریا کھدوایا جائے۔

۳۔ ہند کے تاریخی مقامات ملک بھر میں بکھرے ہوئے ہیں۔ سیاحوں کو بڑی قباحت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ تاج محل آگرے میں ہے، غار ہائے الورا، الورا میں تو جہانگیر کا مقبرہ لاہور میں۔ ان ساری تاریخی عمارات کو منہدم کرا کے دلی میں (کہ مرکزی مقام ہے) دوبارہ تعمیر کرایا جائے، تا کہ سب کچھ بیک وقت دیکھا جا سکے۔

۴۔ ہر سال درخت اکھاڑنے کا ہفتہ بڑے زور شور سے منایا جائے۔

۵۔ قطب صاحب کی لاٹھ کا نام تبدیل کر کے اگلے حملہ آور کے آنے تک نادر شاہ کی لاٹھ رکھا جائے۔ تا کہ لوگوں کو حملہ آوروں کے نام بآسانی یاد رہ سکیں اور تاریخ ہند مرتب کرنے میں آسانی ہو۔

وہ اصلاحات گنانے بیٹھیں جو ہم نے اس مختصر سے قیام میں نافذ کرائیں تو بے شمار ہیں۔ ہمیں یاد بھی نہیں رہیں۔ مثلاً بارہ دری کی جگہ تیرہ دری بھی تعمیر کرائی جائیں۔ جنگل میں منگل ہی نہیں بدھ بھی منایا جائے، وغیرہ وغیرہ۔

## محبت اور شادی کے متعلق ہمارے خیالات:

ہمارے خیال میں اگر محبت کو شادی سے اور شادی کو محبت سے دور رکھا جائے تو دونوں نہایت مفید چیزیں ہیں۔ لیکن نوجوان بڑی جلد بازی سے کام لیتے ہیں، دوسروں کے تجربے سے مستفیض نہیں ہوتے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ خواہ مخواہ شادی مول لے بیٹھتے ہیں۔

اکثر مشاہدے میں آیا ہے کہ جو لوگ شادی سے پہلے پچھتاتے تھے وہ شادی کے بعد بھی خوب پچھتاتے ہیں۔ ہم کبھی نہیں پچھتائے حالانکہ ہم کسی زمانے میں بڑے بانکے البیلے نوجوان مشہور تھے۔

جب ہمیں معلوم ہوا کہ برخوردار علی قلی شادی پر تلا بیٹھا ہے تو ارادہ ہوا کہ اسے من مانی کرنے دیں۔ یاد کرے گا۔ لیکن ان ہی دنوں ہم ایک ایسی حرکت کے مرتکب ہوئے جو ہم جیسے بزرگ کی شان کے شایان ہرگز نہ تھی۔ ویسے ہم چھپ کر کسی کی باتیں سننے کے عادی نہیں ہیں۔ اس روز جانے کیوں کر ہم نے یہ برداشت کیا اور اوٹ سے ان دونوں کی گفتگو سنی۔

لڑکی نے برخوردار علی قلی کی آمدنی کے متعلق پوچھا۔ علی قلی نے ہمارا حوالہ دیا کہ والد بزرگ شہنشاہ ہیں۔ وہ بولی ''شہزادوں کی تو خدا کے فضل سے یہاں بھی کوئی کمی نہیں۔ ہر تیسرا نوجوان شہزادہ ہے۔ بلکہ غیر شہزادہ ہونا زیادہ اہمیت رکھتا ہے''۔

''ہمارے ملک میں تیل کے چشمے ہیں......'' علی قلی کا یہ کہنا تھا کہ لڑکی کی باچھیں کھل گئیں۔

''تمہارے کنبے کے متعلق امی پوچھ رہی تھیں۔ تم مغل ہو؟''

''مغل وغیرہ کا تو پتہ نہیں۔ ویسے ہم ابن شمشیر ابن شمشیر ہوتے ہیں......'' علی قلی نے جواب دیا۔

''بہر حال ہمارے کنبے والے ایران سے تمہارے چال چلن کی تصدیق کرائیں گے''۔

''چال تو میں ابھی چل کر دکھا دیتا ہوں......'' علی قلی نے بھولپن سے کہا ''رہ گیا چلن...... شادی کے بعد ایران چلو گی تو وہ وہاں دیکھ لینا......''

''ایران جانا تو ذرا مشکل ہے کیونکہ امی جان مجھے بے حد چاہتی ہیں۔ وہ کہتی ہیں کہ شہزادہ علی قلی ہر سال ایک ماہ کی چھٹی لے کر آ جایا کرے گا۔ یا یوں ہو کہ اباجان شہنشاہ محمد شاہ سے مل کر تمہیں کوئی ریاست الاٹ کرا دیں''۔

''تجویز تو یہ بھی اچھی ہے......'' وہ ناخلف بولا۔ ''لیکن اگر میں ایران چلا گیا تو تم اداس رہا کرو گی''۔

''تم اس کی فکر نہ کرو۔ ہمارے ہاں کافی شہزادوں کا آنا جانا ہے''۔

علی قلی بگڑنے لگا ''تم پرسوں کس شہزادے کے ساتھ ہمایوں کے مقبرے کی طرف گئی تھیں؟''

''وہ تو بھائی جان کے دوست ہیں۔ ان کی پالکی بالکل نئے ماڈل کی ہے۔ تمہارے ساتھ پیدل چلنا پڑتا ہے اور شام کا لباس خراب ہو جاتا ہے''۔

ہم بقیہ گفتگو سنے بغیر تشریف لے آئے۔

## علی قلی کا علاج:

ہمیں یقین ہو چکا تھا کہ یہ لڑکی بہت زیادہ ماڈرن خیالات کی ہے۔ بیچارے علی قلی کو وہ تگنی کا ناچ نچائے گی کہ نراذن مرید بن کر رہ جائے گا۔ ہم نے برخوردار خاں فیلسوف سے ذکر کیا۔ اس نے بڑے پتے کی بات کہی، یہی کہ وہ دونوں محض فلرٹ کر رہے ہیں سنجیدہ کوئی بھی نہیں ہے۔ علی قلی لڑکی سے ہمیشہ شام کو ملتا ہے اور شام کو اس کے سانس میں مئے رنگیں کی بو ہوتی ہے۔ جسے وہ الائچی یا پان سے چھپانے کی کوشش کرتا ہے۔ ایک روز اس کی پوستین سے پوست کی کافی مقدار برآمد ہوئی۔

ہمارا تجربہ ہے کہ غروب آفتاب کے بعد قندیلوں کی جھلملاتی روشنی میں سب لڑکیاں حسین معلوم ہوتی ہیں۔ خصوصاً چند گھونٹ بادہ رنگیں چڑھا لینے کے بعد۔

ہم نے درویش کامل شیخ بوٹا شجر پوری کا نسخہ نکالا جو انہوں نے محبت اتارنے کے سلسلے میں بتایا تھا۔ اسے علی قلی پر آزمایا اور تیر بہدف پایا۔ شام ہوتے ہی علی قلی کو کہیں باہر کام پر بھیج دیا جاتا۔ پینا پلانا چھڑوا دیا گیا۔ لڑکی لگاتار علی الصبح اسے دکھائی گئی۔ سورج کی روشنی میں جب علی قلی نے لڑکی کی اصلی شکل بغیر میک اپ کے دیکھی، تو بہت سے رازہائے پنہاں آشکار ہوئے۔ چند ہی دنوں میں ایسا بدلا کہ لڑکی سے کوسوں دور بھاگنے لگا۔ دلی کا رخ ہی نہ کرتا تھا۔ بلکہ ایک روز معروض ہوا کہ میں تارک الدنیا بننا چاہتا ہوں۔ ہم نے اسے منع کر دیا۔

شیخ بوٹا شجر کاری کے بقیہ نسخے بھی استعمال کریں گے، انشاء اللہ تعالیٰ۔

## ہند کے بادشاہ گر:

ہند کے دو بادشاہ گر...... سید برادرز (حسین علی خاں اور پتہ نہیں کیا علی خاں) تقریباً ہر روز پریس کانفرنس منعقد کرتے اور انواع و اقسام کے بیان دیتے۔ چونکہ پریس ان کے ہاتھ میں تھا اس لیے ملک کی سیاست پر پورا قابو تھا۔ دونوں بھائی اکثر دورے پر رہتے تھے اس لیے ہماری خدمت میں حاضر نہ ہو سکے۔ ایک روز ہم نے بازار میں ایک بورڈ دیکھا جس پر ''اصلی شہنشاہی بادشاہ گران مملکت ہند'' لکھا تھا۔ اوقات ملاقات اور مشورے کی فیس بھی درج تھی۔ ہم نے انہیں اپنے دیدار سے سرفراز فرمایا اور انہیں بلا کا چست و چالاک و چار سو بیس پایا۔ کاش کہ ہم ایسے سمارٹ لوگوں کو اپنے ساتھ لے سکتے۔ محمد شاہ سے کہا کہ ہمیں ایک جوڑی بادشاہ گر درکار ہیں۔ وہ ملتمس ہوا کہ ''ان ہی کے دم سے تو دلی میں رونق ہے۔ لہٰذا انہیں چھوڑ جایئے۔ گداگر البتہ حاضر ہیں''۔

''وہ تو ہم ملتان سے خود لے سکتے ہیں......'' ہم نے فرمایا۔

## ایک رفیق دیرینہ سے ملاقات:

چاندنی چوک سے گزر رہے تھے کہ شور و غل سنائی دیا۔ دیکھتے ہیں کہ بہت بڑا جلوس آ رہا ہے۔ آگے آگے ہاروں سے لدا ہوا ایک شخص ہے کہ شکل اس کی زمانہ ساز خاں سے ملتی ہے۔ یہ زمانہ ساز خاں ہی تھا۔ ہمیں پہچان گیا، معانقہ کیا۔ معلوم ہوا کہ ملک کے بڑے لیڈروں میں شمار ہوتا ہے۔ خدا کی شان کہ یہی زمانہ ساز خاں کبھی زمانے کی ٹھوکریں کھاتا اور بھیڑوں کی اون تراشتا، آج اس شان و شوکت سے نکلتا ہے کہ شہنشاہ دیکھیں تو رشک کریں۔ شام کو ہم نے اسے مدعو کر کے اس کی عزت افزائی فرمائی۔ اور اس حیرت انگیز ترقی کی وجہ پوچھی۔ کہنے لگا کہ اس کی زندگی قربانیوں کا مرقع رہی ہے، ملک اور قوم کی خدمت کر کے

اس رتبے کو پہنچا ہے۔ شراب کا دور چلا تو بہت جلد آؤٹ ہو گیا۔ ہمارے دوبارہ استفسار کرنے پر اصلی بھید کھلا۔ اس نے اقبال کیا کہ ایران سے یہاں آ کر بکریوں کی اون تراشنے کی کوشش کی لیکن کامیابی نہ ہوئی۔ پھر پوسٹر چسپاں کرنے پر ملازم ہوا۔ ایک روز شومی قسمت سے کوئی خاص پوسٹر لگاتا ہوا گرفتار کر لیا گیا۔ صاحب پوسٹر سے جیل میں تعارف ہوا۔ رہائی کے بعد انہوں نے ایک سیاسی جلسے میں بلایا۔ سٹیج کے قریب یہ دھواں دھار تقریر سننے میں ہمہ تن گوش تھا۔ (جو خاک سمجھ میں نہیں آ رہی تھی) کہ لاٹھی چارج کی مہیب صدا کانوں میں پڑی۔ گھڑی بھر میں افراتفری مچ گئی۔ چنانچہ مخالف سمت میں جست لگائی اور اتفاقاً سٹیج پر اپنے تئیں کھڑے پایا۔ گرفتاری شروع ہوئی تو غلطی سے لیڈروں کے ساتھ دھر لیا گیا۔ جیل میں سیاسی قیدیوں والا سلوک ہوا جو کہ نہایت تسلی بخش رہا۔ رہائی ہوئی تو پبلک نے جھنڈوں، بینڈ باجوں، نعروں اور آتش بازی سے استقبال کیا۔ شہر بھر میں جلوس نکلا۔ گھر پہنچا تو بالکل جی نہ لگتا تھا۔ اگلے ہفتے سیاسی جلسے میں دانستہ طور پر سٹیج کے قریب رہا۔ لاٹھی چارج ہوتے ہی فوراً لیڈروں میں گھس گیا تا کہ گرفتاری کے وقت آسانی سے دستیاب ہو سکے۔ بڑے گھر میں قیام و طعام کا انتظام گھر سے کئی درجے بہتر تھا۔ چنانچہ تقریباً ہر ماہ یہی تماشا ہوتا۔ پبلک بھی اسے بار بار دیکھ کر نوٹس لینے لگی۔ اسے بھی محسوس ہونے لگا کہ آہستہ آہستہ وہ کچھ لیڈر سا بنتا جا رہا ہے۔ اب اس نے سنجیدگی سے کام شروع کیا۔ کتابوں سے تقریریں نقل کرنے لگا۔ آئینے کے سامنے مشق شروع کر دی۔

خدا نے دن پھیرے اور وہ لیڈروں میں شمار کیا جانے لگا۔

ہم نے یہ سنا تو رشک و حسد کے جذبات محسوس فرمائے۔ پھر سوچا کہ موجودہ پوزیشن بھی کوئی خاص بری نہیں ہے۔ زمانہ ساز خاں معروض ہوا کہ ''برخوردار علی قلی خاں کچھ کچھ پرولتاری سا معلوم ہوتا ہے۔ کیوں نہ اس کو اسی لائن پر ڈال دیں''۔ ہم نے فرمایا کہ ''علی قلی خاں روپے پیسے والا ہے۔ یہ تو جب چاہے لیڈر بن سکتا ہے''۔ وہ ملتمس ہوا کہ ''یہ بھی درست ہے لیکن فی زمانہ لیڈری افضل ترین پیشہ ہے''۔ ہم نے بات کاٹی اور فرمایا کہ ''نہیں لیڈری نمبر دو ہے اور پیری مریدی نمبر ایک''۔

## ہمارا مقامی سیاست میں حصہ لینا:

ان دنوں ایک الیکشن زوروں پر تھی۔ اُلوشناس معروض ہوا کہ ہم دلی میں اس قدر مقبول ہو چکے ہیں کہ خواہ کسی ٹکٹ پر کھڑے ہو جائیں انشاء اللہ کامیاب ہوں گے۔ بادشاہ گروں سے مشورہ لینا بیکار ہے۔ کیونکہ الیکشن کے معاملے میں وہ بالکل یوں ہی تھے۔ ایک ایک ٹکٹ پر لاتعداد امیدواروں کو نامزد کر دیتے تھے۔ یہاں تک کہ بعض اوقات امیدواروں کی تعداد رائے دہندگان سے زیادہ ہو جاتی۔ لطف یہ تھا کہ ہمارے مقابلے میں محمد شاہ بھی تھا۔ فرمانبردار خاں نے حسب معمول نہایت مایوس کن خبریں سنائیں۔ جب ہم نے اس کو برا بھلا کہا تو وہ بھی مان گیا کہ واقعی ہم شہر میں بے حد ہر دلعزیز ہیں اور الیکشن میں ضرور کامیاب ہوں گے۔ یہ شخص آہستہ آہستہ ہمارے مزاج سے واقف ہوتا جا رہا ہے۔

سات امیدواروں سے دو کو زر کثیر تحفتاً دے کر بٹھایا گیا۔ تیسرے کو ڈرا دھمکا کر علیحدہ کیا۔ چوتھے کو سفیر بنا کر باہر بھجوانا پڑا۔ دو کمال درجہ ضدی نکلے، ایک کو زد و کوب کرایا تو مانا، دوسرے نے مشکوک حالات میں داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔ رائے شماری شروع ہوئی۔ حقہ بردار خاں نے شہر بھر کی دعوت کی۔ لوگوں کو تحفے اور زر نقد دیا۔ رائے دینے والوں کو طرح طرح سے خوش کیا۔ اتنی خاطر تواضع کے بعد بھی کوئی بدتمیز نہ مانتا تو اسے ڈنڈے کے زور سے منوایا جاتا کہ ہم سچ مچ ہر دلعزیز ہیں۔ ہم جیت تو گئے لیکن اخراجات کی تفصیل دیکھی تو از حد پشیمان ہوئے۔ افسوس بھی ہوا کہ ناحق ذرا سی خوش وقتی کی خاطر اتنا روپیہ اور وقت برباد کیا۔ معلوم ہوا کہ ہند میں ہر صاحب دولت کی سب سے بڑی خواہش ہوتی ہے کہ الیکشن لڑے۔ سیاسی معاملات میں یہ لوگ سنجیدہ بالکل

نہیں ہوتے۔ نتیجے سے زیادہ وقتی ہنگامے کی پروا کرتے ہیں اور محظوظ ہوتے ہیں۔

ملک ملک کا رواج ہے صاحب۔

## دلی میں سیٹل ہونے کا ارادہ:

اُلوشناس نے مشورہ دیا کہ دنیا میں یوں مارے مارے پھرنے کی بجائے کیوں نہ ہم ایک اچھی سی مملکت میں باقاعدہ سیٹل ہو جائیں۔ یہ حقیقت ہے کہ اب تک ہماری حیثیت مانند ایک رفیوجی کے رہی ہے۔ ہم نے عزیزی محمد شاہ سے ذکر کیا اور رہائش کے لیے لال قلعہ الاٹ کروانے کی خواہش ظاہر کی۔ وہ بولا۔ لال قلعے میں تو ہم رہتے ہیں۔ آپ قطب صاحب کی لاٹھ الاٹ کرا لیجیے یا شاہی مسجد۔

ہم نے انکار فرمایا اور اپنے مہاجر ہونے کی اہمیت جتائی۔ وہ بولا۔ ہم لوگ بھی تو مہاجر ہیں۔ ہمارے آباؤ اجداد وسط ایشیا سے آئے تھے۔ ہم نے بہتیرا سمجھایا کہ وہ مقامی مہاجر ہیں اور ہم نووارد ہیں جنہیں اب تک نہیں بسایا گیا۔ اس نے گستاخانہ کہا۔ یوں تو حضرت آدم بھی مہاجر تھے کہ بہشت چھوڑ کر آئے تھے۔

ہمیں سخت غصہ آیا، لیکن فوراً اتر گیا۔ پتہ نہیں کیا بات ہے کہ ہند میں کچھ عرصہ رہنے کے بعد وہ پہلے جیسا غصہ ہی نہیں آتا۔ لیکن محمد شاہ کو اس گستاخی کی سزا اسی شام کو مل گئی۔ اُلوشناس بھاگا بھاگا آیا۔ بولا۔ محمد شاہ خزانے میں ہے اور زر و جواہرات ادھر ادھر چھپا رہا ہے۔ ہم فوراً موقع پر پہنچے۔ ہمارے دیکھتے دیکھتے اس نے ایک وزنی سی چیز اپنی پگڑی میں چھپا لی۔ ہند کے رواج کے مطابق ہم نے ازراہ مروت فرمایا کہ آج سے محمد شاہ اور ہم بھائی بھائی ہیں لہٰذا ہم دونوں اپنی پگڑیاں بدلیں گے۔

یہ محض اتفاق تھا کہ اس کی پگڑی سے کوہ نور ہیرا برآمد ہوا۔

## ہندی وزرا سے شکر رنجی:

اُلوشناس اور محمد شاہ کے وزرا کی ناچاقی کی وجہ دو کروڑ کی وہ رقم تھی جو شاہی ایلچی ہمارے لیے کرنال میں لے کر آیا تھا۔ وزرا کا اصرار تھا کہ رقم ادا ہو چکی ہے۔ الوشناس انکار کرتا تھا اور یہ بھی کہتا تھا کہ رقم دو کروڑ نہیں اڑھائی کروڑ تھی۔ ایلچی اسی کش مکش میں اللہ کو پیارا ہو چکا تھا۔ ہم نے محمد شاہ سے فرمایا کہ روپیہ پیسہ ہاتھ کا میل ہے لہٰذا شاہی خزانے سے رقم چکا دی جائے۔ رقم ادا کر دی گئی لیکن شکر رنجی نہ گئی۔ معلوم ہوتا ہے کہ محمد شاہ اپنے وزیروں سے ڈرتا ہے۔ کہنے لگا اہل دربار کی التجا ہے کہ اس مرتبہ آپ سے رسید لکھوالی جائے۔ ہم مان گئے۔ اڑھائی کروڑ کی رسید تیار کی گئی۔ ہم نے دستخط شروع کیے، ابھی چوتھی مرتبہ ہی ابن شمشیر لکھا ہو گا کہ وہ گھبرا گئے اور کہنے لگے کہ کاغذ چھوٹا ہے۔ دستخط مختصر ہونے چاہئیں۔ عزیزی محمد شاہ کے دستخط تو بے حد مختصر ہیں، اس نے شکستہ حروف میں محض ''ایم۔ ایس رنگیلا'' لکھا۔

اب کمبخت محرر کہیں سے آ مرا۔ معروض ہوا کہ محاسب اعلیٰ کے اعتراض سے بچنے کے لیے رسید پر ایک آنے کا ٹکٹ لگایا تو معلوم ہوا کہ یہ غلط ٹکٹ تھا۔ ڈاکخانے کا نہیں محکمہ مال کا ٹکٹ ہونا چاہیے۔ پھر کسی نے کہا کہ ایک آنے کا نہیں دو آنے کا ٹکٹ لگے گا۔ مجبوراً اپنی جیب سے دو آنے دیے۔ اس دفتری کارروائی سے طبیعت بدمزہ سی ہو گئی اور ساڑھے چار کروڑ کا لطف نہ آیا۔

''ایسے لاجواب وزیر تم نے کہاں سے حاصل کیے؟'' ہم نے پوچھا۔

''وزیرستان سے''۔ وہ بولا۔

''اور یہ وزیر آباد کیا ہے؟''

''یہ یونہی ہے۔''

## ایک باکمال بزرگ:

ب الدین خاں جاگیردار کے ہاں شادی پر گئے۔ دولہا کی عجب درگت بنی۔ عورتیں پہلے تو اسی برا بھلا کہتی رہیں، پھر زدوکوب کرنے لگیں۔ اور وہ تھا کہ چپ چاپ بیٹھا تھا۔ سوچا کہ شاید ان بن ہوگئی ہے۔ لیکن معلوم ہوا کہ شادی کی رسمیں ادا ہو رہی ہیں۔ لاحول پڑھی۔

نکاح سے قبل ہم نے دولہا سے دریافت کیا کہ اس کی آخری خواہش کیا ہے تاکہ پوری کروادی جائے۔ وہیں ایک لنگوٹی پوش بزرگ کو دیکھا کہ لمبا سا عصا ہاتھ میں لیے خاموش بیٹھے ہیں۔ کسی کو علم نہ تھا کہ یہ رہتے کہاں ہیں اور کیا کرتے ہیں۔ لیکن کہیں شادی ہو تو ضرور آتے ہیں۔ نکاح شروع ہوا تو ذرا قریب آ گئے۔ جب دولہا نے ''قبول کیا'' کہا تو بزرگ نے ڈنڈا اچھال کر ''پھنس گیا'' کا نعرہ لگایا اور غائب ہو گئے۔ معلوم ہوا کہ ہر شادی میں وہ اسی طرح کرتے ہیں۔

تعجب ہے کہ ہند میں ایسے ایسے باکمال بزرگ بھی موجود ہیں۔

## مینا بازاروں کی بھرمار:

اب تو مینا بازار ہر ہفتے لگنے لگا۔ ملک کے مختلف حصوں سے خواتین آرائشی سامان خریدنے کے بہانے آتیں، اپنی دختران وغیرہ کو بھی ساتھ لاتیں۔ نہ جانے کس نے اڑا دی تھی کہ یا تو خدانخواستہ ہم ایک اور شادی کریں گے یا برخوردار علی قلی خاں منگنی کرائے گا۔ لیکن ہم خواتین سے دور ہی رہتے۔ برخوردار علی قلی کو بھی دور دور رکھتے۔ ہم شادی برائے شادی کے ہرگز قائل نہیں ہیں۔

خواتین سے دور رہنے کی ایک اور وجہ بھی تھی کہ ان کے قریب رہ کر ہمیں دیدے مٹکانے، ہاتھ نچانے اور انگلی سے ناک چھو کر بات کرنے کی عادت پڑ گئی تھی۔ دوران گفتگو ہمارے منہ سے غیر شعوری طور پر اف، اوئی، اللہ، توبہ، ہائے، ہنگوڑا وغیرہ جیسے کلمات بھی نکل جاتے جس سے بعد میں سخت پشیمانی ہوتی۔ ہم زیورات، کپڑوں اور ساس بہو کے قضیوں میں بھی دلچسپی لینے لگے تھے۔ ذرا ذرا سی باتوں پر جھنجھلا اٹھتے۔ بات بات پر لڑنے کو تیار ہو جاتے۔ چنانچہ جب کسی خاتون نے ایک مینا بازار میں ہم سے حملہ آوری کی وجہ پوچھی تو ہم نے پہلے تو بھرے بازار میں اسے کوسنے دیے کہ اگر ہم نہ آتے تو کوئی اور آ جاتا۔ پھر فائل منگا کر وہ تمام کانفیڈنشل خطوط دکھائے جو ہندی امرا نے وقتاً فوقتاً ہمیں لکھے تھے اور ہمیں حملہ کرنے کا مشورہ دیا تھا (ہماری حملہ آوری کی ایک یہ وجہ بھی ہو سکتی تھی جو فرمانبردار خاں کو یاد نہ رہی)۔

## جنوبی ہند سے وفد:

جنوبی ہند سے ایک وفد برائے نادر یار جنگ بہادر آیا۔ ہم بہادر ضرور ہیں، جنگ کا بھی شوق ہے لیکن یار وغیرہ کسی کے نہیں ہیں۔ انہیں گلہ تھا کہ خیبر سے آنے والے حملہ آور دلی تک آتے ہیں اور وہیں کے ہو رہتے ہیں۔ جنوب کو بھولے سے بھی نہیں نوازتے ہم چونکہ سیٹل ہونے کے اہم مسئلے پر غور فرما رہے تھے اس لیے معذوری ظاہر کی۔ انہوں نے التجا کی کہ شبیہ مبارک کی ایک تصویر ہی عنایت فرمائی جائے تاکہ کیلنڈروں، جنتریوں میں چھپوا سکیں۔ ہندی بادشاہ تصویر اتروانے وقت ہاتھ میں ایک پھول پکڑ کر سونگھتے ہیں۔ ہم نے جدت پیدا کی اور دونوں ہاتھوں میں دو پھول پکڑ کر سونگھے۔

## ایک ترقی یافتہ خاتون:

ہمارا اور محمد شاہ کے دربار کی ایک ترقی پسند خاتون کا قصہ بہت بڑھا چڑھا کر بیان کیا گیا ہے۔ یہ بیان بالکل بے بنیاد ہے کہ ہمیں اس سے لگاؤ تھا۔ دراصل ہمیں تمباکو، شراب، محبت و دیگر منشیات سے بچپن سے نفرت رہی ہے۔ خاتون موصوف کو گانے بجانے کا شوق تھا اور ہمیں گانے بجانے سے شغف ہو چلا تھا۔ دربار میں اس نے ''نے تاب وصل دارم نے طاقت جدائی'' والی رباعی کچھ ایسے انداز سے گائی کہ یار لوگوں کو شبہ ہوا اور افواہیں اڑنے لگیں۔ شروع شروع میں تو ہمارا خیال اس کی جانب رہا لیکن پھر الوشناس کے سمجھانے پر سنبھل گئے۔ اس نے بتایا کہ بالائی طبقے میں لڑکیوں کا ایک مدرسۂ فکر ایسا بھی ہے جو چہلیں تو کرتی ہیں نوجوانوں سے اور شادی کرتی ہیں بوڑھے امیروں سے، خواہ ان کی پہلی بیویوں کی تعداد کتنی ہی ہو۔ کبھی کبھار بوڑھے کے پروگرام میں شریک ہو گئیں لیکن زیادہ وقت کزنوں کے ساتھ گزارا۔

ایسا کرنے میں وہ اپنے آپ کو اس لیے حق بجانب سمجھتی ہیں کہ نوجوانوں کے پاس روپیہ نہیں ہے اور بوڑھوں کے پاس ہے اور باقی چیزیں آنی جانی ہیں۔

ایک روز ہم چڑ گئے۔ اس نے ایک غزل گائی جس کے شروع کے بول تھے:

ساٹھویں سال میں قدم آیا　　زلف مشکیں میں پیچ و خم آیا
آمد آمد ہوئی جوانی کی!　　غمزہ و ناز و دلستانی کی

ہند میں ساٹھ برس کی عمر میں اکثر لوگ سٹھیا جاتے ہیں۔ ہم ساٹھ کے نہ تھے مگر سمجھ گئے کہ وار ہم پر ہوا ہے۔ دیر تک آئینے کے سامنے کھڑے رہے لیکن قطعی رائے قائم نہ کر سکے۔ فرمانبردار خان سے اپنی شکل وصورت کے متعلق دریافت کیا، اس نے حسب معمول نہایت گستاخ و مایوس کن جملے کہے۔ طیش میں آ کر اسے درے لگوانے کا قصد کیا۔ پھر خیال آیا کہ فرمانبردار خاں تو پہلے سے ہی دُرّانی ہے۔ چنانچہ اسے معاف کیا اور اُلّو شناس کو بلایا۔ وہ نمک خوار دست بستہ معروض ہوا کہ روئے پرنور پر وہ پرہیبت جلال طاری ہے کہ نگاہیں اوپر نہیں اٹھتیں۔ لہٰذا شکل وصورت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس فقرے سے بھی ہماری تسلی نہ ہوئی۔ پھر ہمیں معلوم ہوا کہ سارے معاملے میں مسز محمد شاہ کا ہاتھ ہے۔ محمد شاہ خود ترقی پسند ہے لہٰذا خاتون موصوف میں ضرورت سے زیادہ دلچسپی لیتا رہا ہے۔ عورتوں کا حسد مشہور ہے۔ مسز محمد شاہ ہمیں اس عمر میں بے وقوف بنانا چاہتی ہے کہ ہم اس طرار حسینہ کو اپنے ہمراہ ایران لے جائیں۔ ہم بھانپ گئے اور اس سے دور دور رہنے لگے۔ خاتون مذکور ہماری بے اعتنائی سے چراغ پا ہو گئی اور ایک جلسے میں ہمارے رجعت پسند ہونے کا اعلان کر کے ہم سے مکمل بائیکاٹ کر دیا۔

خیر رسیدہ بود بلائے ولے بخیر گزشت

## جامعہ فرقانی:

آج صبح ملا فرقان اللہ بن برہان اللہ کہ مقامی جامعہ فرقانی کا صدر ہے، آستاں بوسی کے لیے حاضر ہوا اور ملتمس ہوا کہ جامعہ ہم کو ایک اعزازی سند دے کر عزت افزائی (اپنی) کرنا چاہتا ہے۔ جامعہ میں پورا کورس چھ برس کا ہے۔ بعض فارغ البال اور نیک نفس والدین کے بچے یہ کورس دس بارہ سال میں کرتے ہیں۔ ان طلبا کو خلیفے کہا جاتا ہے۔ اگر کوئی بچہ کورس کے اختتام سے

پہلے بھاگ جائے تو اس کو صرف علامہ کی سند ملتی ہے۔ کورس پورا کرلے تو علامۃ الدہر کہلاتا ہے۔ دوسری سندیں مثلاً ابوالبرکات، ابوالافضال، ابوالفضیلات عموماً سرکاری حکاموں، جامعہ کے معلمین کے دوستوں اور ہمارے جیسے سیاحوں، تاجروں اور حملہ آوروں کے لیے وقف ہیں۔ عزیزی محمد شاہ دو مرتبہ ابوالبرکات ہے اور تین مرتبہ ابوالفضیلات۔

جامعہ ہر سال چار سو علامۃ الدہر بناتا ہے جو عموماً بیس پچیس روپے ماہوار کے منشی یا کسی تاجر کے ملیم بن جاتے ہیں۔ منشی بننے کے کوئی چار پانچ مہینے کے بعد ان کے والدین کو شادی کی (اپنے ہونہار فرزند کی، اپنی نہیں) فکر پڑ جاتی ہے۔ شادی کرتے وقت شکل صورت کی طرف زیادہ توجہ نہیں دی جاتی، کیونکہ اس ملک میں شکل وصورت نہیں ہوتی، صرف روپے پیسے کا خیال رکھا جاتا ہے۔ عجیب تماشا ہے کہ شادی میں لڑکے دلہن کے علاوہ ایک کثیر رقم کی بھی توقع رکھتے ہیں۔ یہ بھی چاہتے ہیں کہ سسرال والے انہیں اعلیٰ تعلیم دلانے کے لیے سمندر پار بھیج دیں۔ تاکہ وہ خوب داد عیش دے سکیں۔ ہمارے خیال میں یہ انتہا درجے کی کم ہمتی ہے۔ تبھی اس ملک میں بے چاری لڑکیوں کی وہ آؤ بھگت نہیں ہوتی جو لڑکوں کی ہوتی ہے۔

## جامعہ میں ہماری تقریر:

اعزازی سند کے سلسلے میں ہمیں خواہ مخواہ تقریر کرنی پڑی، حالانکہ نہ ہمیں پہلے سے خبردار کیا گیا تھا اور نہ ہم تیار تھے۔ پہلے ملا فرقان اللہ بن برہان اللہ نے ہماری ذات کا تعارف یوں کرایا:

''حضرات کیسا روز سعید ہماری زندگی میں آیا ہے کہ اعلیٰ حضرت نادر شاہ صاحب کی ذات والا صفات کا نزول ہوا ہے۔ شاہ صاحب کا تعارف محتاج بیان نہیں۔ آپ نے جس سلسلے میں دلی تشریف لانے کی زحمت گوارا کی ہے وہ اب واضح ہو چکا ہے۔ سنا ہے کہ جناب خان صاحب بین الاقوامی سطح پر ایرانی اور ہندوستانی روپے کی قیمت چکانے آئے ہیں۔ آپ کی علمیت شبہ مبارک سے ظاہر ہے۔ آغا صاحب پہلوی زبان کے ہر پہلو سے ماہر ہیں۔ شہنشاہی سے پہلے آپ کا شغل..... خیر جانے دیجیے۔ ان کی تقریر کو خاموشی سے سنا جائے کیونکہ آپ شہنشاہ ہیں اور آپ کو اپنی پھوپھی صاحبہ مدظلہا سے بھی ملاقات مقصود تھی جو اتفاق سے ملک میں مقیم نہیں ہیں۔ لیکن ہماری شامتِ اعمال..... معاف کیجیے..... اچھا تو حضرات..... مولانا نادر شاہ صاحب!''

ہم کو اس بدتمیز ملا پر سخت غصہ آیا کہ ہمارے تئیں کبھی آغا کہا ہے تو کبھی مولانا اور کبھی کچھ اور..... ایک بات پر قائم نہیں رہتا۔ یہ شخص دانستہ طور پر ہمارا تمسخر اڑاتا ہے۔ اچھا اسے سمجھیں گے۔

ہم تالیوں کے شور میں اٹھے اور فرمایا'' پیارے اطفال، معلمین حضرات و پرنسپل ملا الیف اللہ! آپ نے ہم کو یہاں مدعو کر کے جامعہ کی جو عزت افزائی کی ہے اس کے لیے ہم آپ سب کو ممنون ہونے کا موقع دیتے ہیں۔ آپ کو ایسے موقعے کہاں میسر ہوتے ہیں کہ ہم سا شہنشاہ آپ کو اپنی خوش کلامی سے مستفیض کرے۔ سب سے پہلے تو ہمیں آپ حضرات کی زبوں حالی پر تعجب ہوتا ہے۔ رونا بھی آتا ہے۔ ہمیں بتایا گیا ہے کہ آپ یہاں کوئی دو ہزار کی تعداد میں بیٹھے ہیں۔ بخدا ہمیں آپ ڈیڑھ سو کے قریب لگ رہے ہیں۔ پرسوں دربار میں کوئی کاریگر بیس گز ڈھاکے کی مل ایک انگوٹھی میں سے گزار رہا تھا۔ دوسری طرف سے کپڑے کو جھٹکے سے کھینچا گیا تو کاریگر خود بھی انگوٹھی میں سے گزر گیا۔ اس قدر دھان پان انسان ہم نے پہلے کبھی نہیں دیکھے۔ یہ آپ کی غذا کا قصور ہے یا آب وہوا کا۔ آپ کے چہروں پر کچھ ایسا جمود اور بے حسی ہر وقت رہتی ہے جیسے آپ ہر چیز سے مطمئن ہیں۔ آپ جی کیا رہے ہیں گویا زندگی پر احسان کر رہے ہیں۔ آپ کے قبرستانوں میں کتبے تک غلط ہیں (ہم نے بلیک بورڈ پر لکھنا شروع کیا) مثلاً..... ''شیخ خدا بخش مرحوم

سنہ سولہ سو دس میں پیدا ہوئے۔

سنہ سولہ سو ستر میں ساٹھ برس کی عمر میں انتقال کر گئے''۔

یہ غلط ہے۔ اس کی جگہ یوں ہونا چاہیے۔

''شیخ خدا بخش مرحوم

سنہ سولہ سو دس میں پیدا ہوئے

پچیس سال کی عمر میں انتقال فرمایا

ساٹھ برس کی عمر میں دفن ہوئے.....!''

حضرات واطفال ہم ایران سے بڑی امیدیں لے کر چلے تھے۔ شروع میں پختہ ارادہ تھا کہ دشمن کی بوٹی بوٹی اڑا دیں گے۔ کابل میں آئے تو سوچا انہیں زدوکوب کریں گے۔ خیبر پہنچے تو ارادہ ہوا کہ ان سے کشتی لڑیں گے۔ لیکن یہاں کی آب وہوا کو اس درجہ سکون پرور اور باشندوں کو اس حد تک با اخلاق، وضعدار، نحیف ونزار پایا کہ دن بھر قیلولہ کرنے اور یار لوگوں سے گپیں اڑانے کا شغل اختیار کر لیا ہے۔ یہاں کی آب وہوا کا اثر نہایت صلح جویانہ ہے۔ یہ خون کو بھی ٹھنڈا کرتی ہے۔ اب ہم سوچتے ہیں کہ دشمن نے ہمارا کیا بگاڑا ہے۔ مفت کی لڑائی بھڑائی سے آخر فائدہ؟ سنا ہے کہ جنوبی اور مشرقی ہند کی آب وہوا اور بھی گئی گزری ہے۔ چنانچہ ہم اور آگے نہیں جائیں گے۔ ہم آپ کو مبارک باد دیتے ہیں آپ کی روایات پر۔ آپ کی قومی روایات بے حد شاندار ہیں۔ آپ نے کسی اجنبی کو مایوس نہیں کیا۔ کئی سو سال سے آپ کا شغل بیرونی لوگوں سے حکومت کروانا ہے۔ اور تو اور آپ نے خاندان غلاماں سے بھی حکومت کروائی ہے اور وسعت قلب کا ثبوت دیا ہے۔ آپ کو ایک دوسرے کی نقل کرنے میں خاص مہارت حاصل ہے۔ یعنی آپ بھیڑ چال چلتے ہیں (یہاں ہم سٹیج سے نیچے اترے اور بھیڑ چال چل کر دکھائی)۔

آپ کے ادب وموسیقی کے چرچے ہم نے پہاڑ کے اس پار سنے تھے۔ آپ کے ہاں تقریباً ہر تیسرا یا چوتھا شخص شعر کہتا ہے اور تخلص کرتا ہے۔ یہ آب وہوا اور یہ صحت جیسی کہ آپ کی ہے شعر وشاعری کے لیے نہایت سازگار ہے۔ آپ کی موسیقی کے کیا کہنے۔ پچھلے ہفتے لال قلعے میں درجن بھر آدمیوں کو قوالی گاتے سنا۔ وہ سب خوب سر دھنتے اور وجد میں آ کر تالیاں بجاتے۔ یہ لوگ بے حد دانا ہیں، گاتے وقت ایک کان پر ہاتھ رکھ لیتے ہیں۔ غالباً دوسرے کان سے جسے کھلا چھوڑتے ہیں ضرور بہرے ہو جاتے ہوں گے۔ پھر ایک شخص کو دیکھا کہ گانے کے بہانے طرح طرح سے ہمارا منہ چڑاتا تھا۔ ہماری طرف عجیب وغریب اشارے کرتا تھا۔ ہمیں غیض وغضب آیا ہی چاہتا تھا کہ ہمیں بتایا گیا کہ یہ پکا راگ گا رہا ہے۔ سنا ہے کہ آپ کے ہاں ہر وقت کا راگ جدا جدا ہوتا ہے۔ آپ کی موسیقی کا مطالعہ فرما کر ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ یہاں صبح صبح ہر شخص بیزار ہوتا ہے۔ غالباً رات کو آپ چٹ پٹا مرغن کھانا کھا جاتے ہیں یا نشہ کر جاتے ہیں۔ کئی مرتبہ یوں ہوا کہ علی الصبح مسرور اٹھے لیکن وقت کے راگ نے غمگین کر دیا۔ اور رات کو عبادت کا قصد کر رہے تھے کہ وقت کے چنچل راگوں سے متاثر ہو کر رنگ رلیاں شروع کر دیں۔

حضرات! جب ہم پشاور سے آگے آئے تو ہمیں بتایا گیا کہ سکندر یونانی کے زمانے میں یہاں بہت بڑا جنگل تھا۔ مبارک ہو کہ آپ نے بیشتر جنگلات کو صاف کر دیا ہے۔ آپ کے نزدیک درخت کا صحیح مصرف اس کو کاٹ ڈالنا ہے۔ ہم نے گاؤں میں بچوں کو چھوٹی چھوٹی کلہاڑیاں لیے تفریحاً درخت کاٹتے دیکھا ہے.....''۔

ہماری تقریر جو کہ بے ربط تھی ملا فرقان اللہ کی گستاخی کا صحیح جواب تھی۔ ہم دیر تک بولتے رہے۔ ہمیں یاد نہیں کہ ہم نے

اور کیا کچھ کہا۔ اچانک چند بدتمیز طلباء کی جمائیوں اور خراٹوں نے ہمیں چونکا دیا اور ہم بیٹھ گئے۔

## سوالات اور جوابات:

ملا فرقان نے اٹھ کر ہمارا شکریہ ادا کیا اور حاضرین سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''نادر شاہ صاحب سے سوال پوچھے جائیں تو آپ ان کا موزوں جواب دیں گے''۔

کچھ دیر خاموشی رہی۔ پھر ایک کونے میں کھسر پھسر ہونے لگی۔ ''کیا آپ ملوکیت پسند ہیں؟'' پوچھا گیا۔

''ہم طوائف الملوکیت پسند ہیں.....'' ہم نے جواب دیا۔

''تو گویا آپ شہنشاہ پسند ہوئے.....؟'' کسی اور نے پوچھا۔

''شہنشاہ پسند؟'' ہم نے مسکرا کر کہا ''ہم خود شہنشاہ ہیں''۔

''کیا آپ کے خیال میں شہنشاہی بیکار سی چیز نہیں۔ خصوصاً جب ہم سب کے سب ایک جیسے ہیں''۔ ایک برخوردار بولے۔

''ہاں'' ہم نے فرمایا۔ ''جسمانی لحاظ سے تو ایک جیسے ہیں لیکن اوپر والی منزل میں (ہم نے اپنے سر کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا) فرق ہوتا ہے''۔

''صاف صاف بتائیے قبلہ، آپ دائیں جانب ہیں یا بائیں جانب؟''

یہ سوال ہماری سمجھ میں نہ آیا۔ ہم نے اسی طرح مسکراتے ہوئے (مقرر کو ہمیشہ مسکراتے رہنا چاہیے) جواب دیا۔ ''ہم شہباز خاں الوشناس کی بائیں جانب ہیں اور ملا فرقان اللہ کی دائیں جانب.....''

''کیا آپ ایران سے آئے ہیں.....؟''

ایسے آسان سوال پر ہم بڑے خوش ہوئے۔ ''ہاں ہاں برخوردار، اور کیا تم ہندوستان میں رہتے ہو؟''۔

''شہنشاہی سے پہلے آپ کا ذریعہ معاش کیا تھا.....؟'' ایک طرف سے آواز آئی۔

اگرچہ ہم نے کافی صبر و تحمل دکھایا تھا لیکن اس گستاخ سوال نے ہمیں سیخ پا کر دیا۔ ہماری آنکھوں میں خون اترنا شروع ہوا۔ میز پر ہمارا مکہ اتنے زور سے پڑا کہ میز ٹوٹ گئی۔ منہ کا جھاگ ملا فرقان اللہ پر گرا جس نے جست لگائی اور دوسری میز پر چڑھ گیا۔ ہڑبونگ سی مچ گئی۔ لوگ اپنی پگڑیاں چھوڑ چھوڑ کر بھاگنے لگے۔

## نوازنا ملا فرقان اللہ کو:

ہمیں یقین ہو گیا کہ ہو نہ ہو یہ سب اسی ملا کی شرارت ہے۔ پہلے ہمیں خفا کر کے ایسی جلی بھنی تقریر کروانا۔ پھر سوال پوچھنے کا شوشہ جان بوجھ کر چھوڑنا۔ اگلے روز ہم نے اس کی مالی حالت کے متعلق معلومات بہم پہنچائیں۔ پتہ چلا کہ ملائی کا نرا ڈھونگ ہے۔ خوب عیش و عشرت کی زندگی بسر کرتا ہے۔ چنانچہ ہم نے عزیزی محمد شاہ سے کہا کہ اس کی خدمات کے صلے میں اسے ایک ہاتھی انعام میں دیا جائے۔ کچھ عرصے کے بعد مخبر بھیج کر پتا کرایا تو معلوم ہوا کہ شاہی ہاتھی کے خورد و نوش پر نصف سے زاید اثاثہ نیلام ہو چکا ہے۔ ہم نے دوبارہ اسے دربار میں بلوا کر عزت افزائی کے بہانے ایک اور ہاتھی (جو سفید تھا) مرحمت فرمایا۔ ہفتے عشرے کے انتظار کے بعد خبر ملی کہ ملا فرقان اللہ نے خودکشی کر لی اور کیفر کردار کو پہنچا۔ ہمارے ساتھ کوئی جیسا کرے گا ویسا بھرے گا۔

## اہل ہند کو گستاخیوں کا صلہ:

ہم نے وہ تقریر کیا کی مصیبت ہی مول لے لی۔ دنیا میں سچ بولنا بھی جرم ہے۔ ذرا سی تنقید بھی ان لوگوں سے برداشت نہیں ہوتی۔ احتجاج ہو رہے ہیں، جلوس نکل رہے ہیں، پوسٹر لگ رہے ہیں۔ آج تو اہل ہند کی گستاخی حد سے بڑھ گئی۔ گزشتہ چند راتیں عزیزی محمد شاہ کی دعوتوں میں جاگ کر گزارنا پڑیں۔ چنانچہ طبیعت کچھ گراں ہو گئی۔ شاہی حکیم معائنہ کرنے آئے۔ اتنے میں نہ جانے کس احمق نے شہر میں یہ اڑا دی کہ نعوذ باللہ ہم اللہ کو پیارے ہو گئے ہیں۔ لوگوں نے اس خبر کو نہ صرف سچ مان لیا بلکہ اسی سلسلے میں جامع مسجد کے پاس فقراء کو جلیبیاں تقسیم کی گئیں۔ اس کی شہادت یوں ہوئی کہ شہباز خان الوشناس کو جو اس وقت جامع مسجد کے قریب سے گزر رہا تھا فقیر سمجھ کر کچھ جلیبیاں دی گئیں، جنہیں وہ بارگاہ دولت میں لے کر حاضر ہوا۔ ہم نے ان کو چکھا اور نہایت لذیذ پا کر اسے دوبارہ جامع مسجد کی طرف بھیجا۔

ہم چند ہزار ایرانی سپاہی لال قلعے میں رکھا کرتے تاکہ بوقت ضرورت کام آ سکیں۔ مفسدوں نے ان کے متعلق یہ مشہور کر دیا کہ ہم انہیں ہر شام مقفل کر دیتے ہیں کہ کہیں وہ بھاگ نہ جائیں۔ ان سپاہیوں کو قلعے کے اندر چھیڑا گیا۔ ہمارے کچھ سپاہی چاندنی چوک سے گزر رہے تھے ان پر آوازے کسے گئے اور ٹماٹر شلجم وغیرہ پھینکے گئے۔ ایسی کئی واردات کی اطلاع ہمیں ملی۔ ہم اسپ نمرود (یہ خطاب ہمارا دیا ہوا تھا) پر سوار ہو کر شہر میں گئے تاکہ رعایا کو شرف دیدار بخش کر ان کی غلط فہمی دور کرا دیں۔ اب یہ مشہور ہو گیا کہ اصلی نادر شاہ تو بہشت کو سدھار چکے ہیں۔ یہ کوئی اور شخص ہے جو بہروپ بھرے ہوئے ہے۔ ہم تخت طاؤس پر بیٹھے تھے کہ دور سے ''نادر شاہ مردہ باد'' کے نعرے سنائی دیے۔ اسی وقت غیض و غضب میں تخت سے چھلانگ لگا کر اپنے چند ہزار سپاہیوں کو کھولا اور تلوار کھینچ کر حکم دیا کہ تلوار کے دستوں سے لاٹھی چارج کر دو! یہ تھا وہ قتل عام، ہم چاہتے تو باقاعدہ تلواریں استعمال کرا سکتے تھے۔ گرمی سخت تھی ہم قمیض اتار کر موتی مسجد میں حوض کے کنارے ننگی تلوار ہاتھ میں لیے بیٹھے رہے۔

## قتل عام:

چنانچہ صاحب قتل عام شروع ہوا۔ ہمارے سپاہیوں نے فقط اہل شہر کو زدوکوب کیا تھا، اس کے باوجود لاتعداد لوگوں نے داعی اجل کو لبیک کہا۔ اگلے روز ایک بزرگ آنکھوں میں آنسو بھرے آئے اور دردناک لہجے میں گویا ہوئے۔ ''کسے نہ ماند کہ دیگر بہ تیغ ناز کشی.....''

یہ شعر ہم نے پہلے سن رکھا تھا۔ چنانچہ ہم نے مسکرا کر دوسرا مصرع..... ''مگر کہ زندہ کنی خلق را و باز کشی'' سنا کر ظاہر کر دیا کہ ہمیں پرانی فرسودہ شاعری زیادہ متاثر نہیں کر سکتی۔ ہمیں شاعری کی جدید قدروں کا قدردان پا کر انہوں نے جیب سے کاغذ کا پرزہ نکال کر ایک آزاد نظم پڑھی جو ہماری سمجھ میں بالکل نہ آئی۔ سوائے ایک مصرعے کے جس میں ہمیں تلوار نیام میں ڈالنے کو کہا گیا تھا۔ رات بھر جاگتے رہے تھے۔ گرمی زیادہ تھی۔ ہمارا دل پسیج اٹھا اور بغلگیر ہونے کی نیت سے آگے بڑھے لیکن بزرگ جلدی سے آداب بجا کر چمپت ہوئے۔ خیر، اب تلوار کو میان میں ڈالنے کی کوشش جو کرتے ہیں تو معلوم ہوا کہ ہمارے ہاتھ میں تو شہباز خاں کی تلوار تھی۔ ہماری تلوار تو پہلے ہی میان میں تھی۔ گویا کہ سارا قتل عام ہی غلط ہوا تھا۔ ہم نے فوراً منادی کرا دی کہ پہلا قتل عام غلط ہوا ہے۔ بلکہ ہوا ہی نہیں کیونکہ تلوار میان سے ذرا نہیں نکلی۔ چنانچہ اس مرتبہ دوسرا صحیح قتل عام شروع ہوا جو کافی کامیاب رہا۔ دراصل فریقین کو کافی ریہرسل مل چکی تھی۔ پہلے ارادہ تھا کہ اس کے بعد ایک مختصر سا قتل خاص بھی کرائیں جو امراء کے لیے ہو۔ پھر

سوچا کہ اہل دلی اس قسم کے تماشوں کے عادی ہو چکے ہیں۔ تیمور کا قتل عام تین دن تین رات تک ہوتا رہا تھا۔ بھلا ہمیں یہ کب خاطر میں لائیں گے۔

شام کو وہی بزرگ آئے۔ ایک اور آزاد نظم سنائی (جو ہماری سمجھ میں بالکل نہ آئی) اور معافی کے خواستگار ہوئے۔ ہم بھی مسجد میں اکیلے بیٹھے بیٹھے تھک چکے تھے۔ مسکرا کر معاف فرمایا اور از راہ تلطف انہیں بغلگیری سے سرفراز فرمایا۔ وہ فوراً بے ہوش ہو گئے۔ جب ہوش میں آئے تو پسلیوں میں درد کی شکایت کرتے تھے۔ پتہ نہیں کیوں؟ شاید ہماری بغلگیری کا نتیجہ ہو۔ آئندہ محتاط رہیں گے۔ انشاءاللہ باری تعالیٰ کارساز ہے۔

## ہم پر کمبل ڈلوانے کی کوشش:

شام کو دریائے جمنا کے کنارے مچھلی پکڑنے کی نیت سے بیٹھے تھے۔ مچھلیاں تھیں کہ جلال شاہی سے قریب نہ پھٹکتی تھیں۔ اندھیرا ہو چلا تھا۔ اچانک ہم نے اپنے اوپر کمبل کا دباؤ محسوس فرمایا۔ سوچا کہ کوئی ہمارا پرستار ہے جو خنکی کا خیال کرتے ہوئے گرم کپڑا لایا ہے، چنانچہ خاموش بیٹھے رہے لیکن ہمیں بالکل ڈھانپ دیا گیا۔ ہمارا دم گھٹنے لگا۔ گستاخ آوازیں سنیں تو معلوم ہوا کہ کوئی شرارت ہے۔ ہڑبڑا کر اٹھے اور دونوں لفنگوں کو پکڑ کر بغلوں میں دبایا ہی تھا کہ انہوں نے داعی اجل کو لبیک کہہ کر سعادت دارین پائی۔ نیا ملک ہے، خبردار رہنا چاہیے۔

## واپسی کا قصد:

ایک کباڑیے کی دکان پر پوستینیں دیکھی۔ آنکھوں میں آنسو بھر آئے (فرمانبردار خاں کی آنکھوں میں) ہم بھی پوستین کو دیکھتے تھے اور کبھی اپنے چوڑی دار پاجامے اور جالی دار کرتے کو۔ تحقیق کرنے پر معلوم ہوا کہ وہ پوستین ہماری ہی تھی جو غالباً فرمانبردار خاں نے بے مصرف سمجھ کر کباڑی بازار میں بیچ دی تھی۔ لیکن اب اس قدر تنگ ہو چکی تھی کہ کوشش کرنے کے باوجود بھی نہ پہن سکے۔ پہلے سے ہمارا وزن کافی بڑھ گیا تھا۔ دن بھر طرح طرح کے خیالات دل میں آتے رہے۔ دلی کے قیام نے ہمیں کتنا تبدیل کر دیا ہے؟ ہم موٹے ہو گئے ہیں۔ رات کو خراٹے لیتے ہیں۔ صبح کی چاء اور تمباکو نوشی کے بغیر بستر سے نہیں اٹھتے۔ قیلولے کی عادت قبیحہ ہمیں شام تک بیزار رکھتی ہے، یہاں کی تیز دھوپ سے ہماری رنگت سنولاتی جا رہی ہے۔ اگرچہ ہندی شاعری میں سانولا، سنوریا، کالیا وغیرہ کو پسند کیا گیا ہے تاہم یہ پسندیدگی تسلی بخش نہیں۔ کیونکہ ہندی شاعری ہے تو عورت کی زبانی لیکن شاعر سارے مرد ہیں۔ اور پھر ہم نے جنوبی ہند کے چند باشندوں کو بھی دیکھ لیا تھا جن کے آباء واجداد کبھی اچھے بھلے ہوں گے۔ ادھر ملک میں عجب دھما چوکڑی مچی ہوئی ہے۔ ہماری تقریر اور قتل عام سے پبلک دشمن بن گئی ہے۔ ہر روز کہیں بھوک ہڑتال ہو رہی ہے تو کہیں ستیہ گرہ۔ کمبل ڈالنے کے حادثے نے ہمارا موڈ قطعی طور پر خراب کر دیا ..... چنانچہ سیٹل ہونے کے خیال پر لعنت بھیجی اور کوچ کا مصمم ارادہ کر لیا۔

## ہمارا دلی سے تشریف لے جانے کا حال:

خدا کے فضل سے زاد راہ کافی تھا کہ راستے میں اخراجات بھی کافی ہوتے ہیں۔ ہم نے از راہ مروت محمد شاہ کو اجازت دے دی کہ اگر اس کی نظر میں کوئی ایسی چیز ہو جس کو ہم بطور تحفہ لے جا سکتے ہوں اور غلطی سے یاد نہ رہی ہو تو بے شک ساتھ باندھ دے۔ لوگ دھاڑیں مار مار کر رو رہے تھے اور بار بار کہتے تھے کہ ہمارے بغیر لال قلعہ خالی خالی سا لگے گا۔ یہ حقیقت تھی کہ لال قلعہ ہمیں بھی کافی خالی خالی سا معلوم ہو رہا تھا۔

اسپ نمرود پر سوار ہو کر در و دیوار پر حسرت کی نظر ڈال ہی رہے تھے کہ عین چوراہے میں گھوڑے سے نیچے آ رہے۔ اس بے ایمان گھوڑے کو ہم نے زیادہ منہ چڑھا لیا ہے۔ اسے تعزیری طور پر اہل ہند کو واپس دے دیا اور عزیزی محمد شاہ سلمہٗ سے فرمایا کہ اس انسان ناشناس کو خطاب سے محروم کر کے تانگے میں جتوایا جائے۔

## کابل میں والی کابل سے نجات:

والی کابل ہماری خدمت میں ملتمس ہوا کہ آپ ہند سے ہمارے لیے جو تحفے لائے ہیں وہ دیتے جائیں ورنہ مروت سے بعید ہوگا۔ ہم نے سمجھایا کہ یہ چند ہزار اونٹوں پر لدے ہوئے تحائف جو وہ دیکھ رہا ہے ہمارے پیارے عزیز محمد شاہ کی نشانیاں ہیں، جن سے ہم مرتے دم تک جدا نہیں ہو سکتے۔ البتہ کچھ پوستین، دنبے یا گلقند درکار ہو تو وہ دے سکتے ہیں۔ والی کابل راضی نہ ہوتا تھا۔ عجب ہونق آدمی ہے۔ دنیاوی دولت کی ہوس اس کو بہت ہے۔ بہتیرا سمجھایا کہ آدمی کو خدا سے لو لگانی چاہیے، دنیا آنی جانی ہے۔ شیخ بوٹا شجر پوری کی مثال پیش کی کہ دنیاداری سے مستثنیٰ ہو کر تارک الدنیا بنے ہوئے ہیں۔ اس پر کوئی اثر نہ ہوا۔ بلکہ گستاخانہ بولا۔ آپ خود تارک الدنیا کیوں نہیں ہو جاتے؟ بہت کہا کہ ہمارے حالات مختلف ہیں۔ وقت آنے پر تارک الدنیا بن کر بھی دکھا دیں گے۔ جب نہ مانا تو ہم نے ٹالنے کو فرمایا کہ تو خود سیاحت پر کیوں نہیں جاتا؟ آدمی سیانا تھا، جان گیا کہ پچھلے دو تین سو سال کی دولت تو ہم سمیٹ چکے ہیں۔ اب وہ ہند گیا تو کر کری ہوگی۔ کچھ ہاتھ نہ آئے گا۔ آخر از راہ پرورش اس کو پانچ شتر تازی، چھ اسپ باسی، دو سو مقامی مینڈھے اور دنبے، دو من گلقند، لال قلعے کا کچھ بوسیدہ فرنیچر، نقرئی پنجرے میں بند ایک ہندی کوا دے کر سرفراز کیا اور اس حریص لیموں نچوڑ سے رہائی پائی۔

## ہمارا خلد میں نزول

جس بات کا دیر سے خدشہ تھا آج وہی ہو کر رہی۔ ہمیں چند نابکاروں نے تنہا پا کر گھیر لیا اور ہمارا کام تمام کیا۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔ ہند سے ایران واپس پہنچ کر ہم اس نئی سیاحت پر سوئے عراق نکل کھڑے ہوئے تھے۔ ہمیں اپنی ناگہاں جوانا مرگ پر بے حد قلق ہے کیونکہ اس میں مشیت ایزدی ہرگز نہ تھی۔ اگر ہم فرمانبردار خاں کا کہا مان لیتے اور اتنی رات گئے تنہا باہر نہ نکلتے تو یہ دن دیکھنا نہ پڑتا۔ خیر، اب صبر کے سوا کوئی چارہ نہیں۔

عزیز واپس اللہ ہی اللہ ہے

دیکھئے آنجہانی بنتے ہیں یا خلد آشیانی یا کچھ اور۔ ویسے ہمارے متعلق یہاں طرح طرح کی مایوس کن افواہیں اڑ رہی ہیں۔

# قبر سے واپسی

فکر تونسوی

اور پھر مرنے کے ایک ہفتے بعد قبر میں میری آنکھ کھل گئی۔

مگر یہ ہوا کیسے؟ میرا تو باقاعدہ انتقال ہو گیا تھا۔ اگر انتقال نہیں ہوا تھا تو میری یہ قبر کیسے بن گئی؟..... ہو سکتا ہے کہ قبر کسی اور کے لیے کھودی گئی ہو اور موقع پا کر دفن مجھے کر دیا ہو۔ مگر نہیں، سماج ابھی اتنا کرپٹ نہیں ہوا کہ دوسروں کی قبر پر قبضہ کرنے کے لیے خود لاش بن کر لیٹ جائے۔

تو کیا یہ ڈاکٹر کی غلطی تھی؟ مگر ڈاکٹر تو بڑا کوالیفائیڈ تھا۔ میں اسے اچھی طرح جانتا تھا۔ اس نے جتنے زندوں کو قبرستان پہنچایا تھا ان میں سے ایک بھی زندہ ہو کر نہیں لوٹا تھا۔ میں بڑا پریشان ہوا کس سے تصدیق کرائی جائے کہ میں مر چکا ہوں یا نہیں؟ چنانچہ میں نے قبر میں لیٹے لیٹے آواز دی.....

''کوئی ہے؟''

جواب میں جیسے گنبد کی سی صدا آئی:..... ''کوئی ہے؟''

میں نے پوچھا ''تم کون ہو؟ ڈاکٹر ڈنگا سنگھ ہو؟''

جواب آیا ''نہیں! میں فکر تونسوی ہوں''۔

تھینک گاڈ! میں نے سوچا، اپنی ہی جان پہچان کا بندہ مل گیا۔ یہ میرے ساتھ بلیک میل نہیں کرے گا۔ چنانچہ میں نے پوچھا۔ ''تم کہاں ہو قبلہ؟''

''میں تمہارے اندر ہوں''۔

''اندر ہو؟ مگر تم تو باہر نکل گئے تھے تم تو انتقال کر گئے تھے، لوٹ کیوں آئے؟''

جواب میں کچھ سسکیاں سی سنائی دیں، جیسے کوئی نادم ہو، بے حد پچھتا رہا ہو۔ جیسے کوئی بچہ گھر سے لڑ جھگڑ کر نکل جائے اور دن بھر بھوکا پیاسا رہنے کے بعد گھر لوٹ آئے اور دیوار سے لگ کر سسکیاں بھرنے لگے۔

میں نے پوچھا ''رو کیوں رہے ہو فکر تونسوی؟ میں پوچھ رہا ہوں، انتقال کے بعد لوٹ کیوں آئے؟''

وہ بولا: ''دراصل غلط فہمی ہو گئی تھی..... یعنی انتقال میرا نہیں ہوا تھا، تمہارا ہوا تھا۔ میں تو تمہاری روح تھی کہ تمہارے جسم سے نجات پا کر بڑی خوشی ہوئی تھی کہ چلو اس بے ہودہ انسان سے پنڈ چھوٹا۔ اب کسی معقول جسم میں جا کر کچھ دن عیش کروں گی۔ چنانچہ ہفتے بھر تک مختلف جسموں کے دروازے کھٹ کھٹاتی پھری۔ ایک بادشاہ کے گھر گئی، ایک رئیس کے گھر، ایک نواب کے یہاں، ایک سمگلر کے در دولت پر..... یہاں تک کہ ایک مٹھ کے مہنت کے یہاں بھی گئی، مگر کسی نے بھی دروازہ نہیں کھولا۔ سب نے جواب دیا ''گو بیک! ہم یہ بلا اپنے گلے نہیں منڈھیں گے، جہنم میں جاؤ''۔

میں ہنس دیا۔ ''تو چلی جاتیں جہنم میں''۔

وہ بھی ہنس دی ''آ تو گئی ہوں جہنم میں۔ فکر تونسوی اور جہنم، دونوں ایک دوسرے کا ترجمہ ہی تو ہیں''۔

''کتنا غلط ترجمہ ہے!'' میں نے ٹھنڈی آہ بھر کر کہا ''کاش! اس جسم کا دروازہ بھی تم پر بند رہتا''۔

''کیسے بند رہتا؟ تم تو اپنے تھے، غیر تھوڑے ہی تھے! چلو نکلو اس قبر سے باہر چلیں''۔

اور میں اپنی گھسی پٹی روح کے ساتھ قبر سے باہر نکل آیا۔ قبر کی مٹی ابھی کچی تھی۔ پختہ نہیں کی گئی تھی شاید میرے رشتہ دار اور مداح پختہ قبر کے لیے ابھی چندہ فراہم کرنے میں مصروف تھے۔ جیسے ہی میں نے قبر سے سر باہر نکالا، دو آدمی جو شاید میری قبر کی مٹی کھود رہے تھے، مجھے دیکھتے ہی دم دبا کر بھاگے۔ میں نے پیچھے سے آواز دی۔ ''تم کون ہو بھائیو! میری قبر پر دیا جلانے آئے تھے یا میرا کفن چرانے؟ اور اب دوبارہ بھی آؤ گے یا یہ تمہارا آخری وزٹ تھا؟''

مگر میری آواز پر ان کی رفتار اور بھی تیز ہو گئی۔ اتنی تیز کہ ان میں سے ایک تو جھاڑی میں الجھ گیا اور پھر جھاڑی سمیت ہی بھاگتا چلا گیا اور جیسے دل ہی دل میں کہتا گیا: ''واہ فکر تونسوی! ہمیں تم سے ایسی توقع نہیں تھی۔ بیکار میں ہمارا قیمتی وقت ضائع کر دیا۔ اتنے وقت میں تو ہم کسی کے کھیت سے گنے توڑ لیتے یا خدا کی عبادت کر لیتے''۔

مجھے ان کی مایوسی پر واقعی صدمہ ہوا کہ میں زندگی میں تو کسی کے کام نہیں آ سکا، مرنے کے بعد بھی کسی کے کام نہ آیا۔ اگر وہ کفن چور تھے تو کم از کم میرا چند گز کفن ہی حاصل کر لیتے اور اگر دیا جلانے والے تھے تو خدا ان کے کچھ گناہ ہی بخش دیتا۔ میری بدولت انہیں کچھ تو مل جاتا۔ مگر آہ! یہاں بھی انہیں فکر تونسوی کے سوا کچھ نہیں ملا۔

میں نے دیکھا کہ میری قبر کے باہر ایک تختی لگی ہوئی تھی۔ کچی قبر کی طرح یہ ایک کچی سی تختی تھی، جس پر کچی سیاہی سے تحریر تھا:

''یہاں طنز نگار فکر تونسوی ابدی نیند سو رہا ہے۔ وہ مر گیا، لیکن اپنی چھوڑی ہوئی حماقتوں کے باعث لافانی رہے گا''۔

تاریخ پیدائش: جس دن قیصر جرمنی مرا تھا۔

تاریخ وفات: جس دن کوئی بھی نہیں مرا۔ سوا فکر تونسوی کے۔

تختی پڑھ کر مجھے یاد آیا کہ یہ سب فقرے میرے ہی ایک مضمون سے چرائے گئے ہیں۔ مجھے اپنے مداحوں اور رشتے داروں کے ذہنی افلاس پر بڑا افسوس ہوا کہ وہ میری موت پر دو اور بیچل فقرے بھی نہیں لکھ سکے۔ اگر نہیں لکھ سکتے تھے تو تختی کے نیچے کم از کم میرے مضمون کا ہی حوالہ دے دیتے۔

جب میں قبر سے باہر نکلا تو کھلی فضا اور ٹھنڈی ہوا تھی جس میں قریب کی ایک ربڑ فیکٹری کا کڑوا کسیلا دھواں ملا ہوا تھا۔ یہ فیکٹری ابھی حال ہی میں سیٹھ چھگن لال نے بنائی تھی۔ وہ اب بھی گورنمنٹ کے ساتھ خط و کتابت کر رہا تھا کہ اس قبرستان کو یہاں سے ہٹا کر آبادی سے دور لے جایا جائے۔ اور یہ قبرستان مجھے الاٹ کر دیا جائے تاکہ میں فیکٹری کو پھیلا کر ملک اور قوم کے لیے زیادہ سے زیادہ ربڑ پیدا کر سکوں۔

میں نے سنا تھا کہ لاشیں سڑاند پیدا کرتی ہیں مگر یہاں لاشوں کے بجائے ربڑ سڑاند پیدا کر رہی تھی۔

اپنے کفن کو تہبند کی طرح جسم پر لپیٹے ہوئے میں نے شہر جانے کی ٹھانی اور گرد کی قبروں میں پڑے ہوئے مردوں پر حسرت کی ایک نگاہ ڈالی اور ان سے کہا:

اب تو جاتے ہیں مے کدے سے میرؔ   پھر ملیں گے گر خدا لایا

شہر کے بڑے گیٹ کے باہر ایک سٹال پر آج کا اخبار دیکھا۔ خرید نہیں سکا، کیونکہ پیسے ہی نہیں تھے۔ اخبار میں وہی پرانی خبریں تھیں۔ گھیراؤ، ہڑتالیں، بھوی چھینواندولن، کیبرے ڈانس کے اشتہار۔ کچھ بھی تو نہیں بدلا تھا۔ اخبار پڑھ کر یوں لگا جیسے باسی روٹی کھا رہا ہوں۔ اچانک ایک اخبار پر نظر پڑ گئی، جو میرے ایک جیوتشی دوست جناب کھجور انند کی طرف سے شائع کیا گیا تھا۔ لکھا تھا:

## فکر تونسوی کا انتقال۔ پیش گوئی سچ نکلی

مشہور جیوتشی آچاریہ جناب کھجور انند جی نے دو برس پہلے طنز نگار فکر تونسوی کی موت کی پیش گوئی کی تھی کہ آپ باون سال اور ڈیڑھ گھنٹے کے بعد اپنے بال بچوں اور قرض خواہوں کو روتا دھوتا چھوڑ کر چلے جائیں گے۔ یہ پیش گوئی منٹ اور سیکنڈ کی حد تک صحیح نکلی۔ لہٰذا اپنے مستقبل کے حالات جاننے کے لیے جیوتشی کھجور انند کی خدمات حاصل کیجیے۔

اشتہار پڑھ کر میں اداس ہو گیا۔ میرے زندہ سلامت لوٹ آنے پر بے چارے کھجور انند کے بزنس کو شدید دھکا لگے گا۔ کیا میں دنیا کا بزنس تباہ کرنے کے لیے واپس آیا ہوں؟ میں کھجور انند سے مل کر اسے مشورہ دوں گا کہ تم ایک خنجر اٹھا کر مجھے دوبارہ مار دو!

میں نے ایک اسکوٹر رکشا والے کو اشارے سے روک لیا ........ ''موتی نگر چلو گے؟''

ہمارے دہلی شہر میں یہ رواج تھا کہ اگر اسکوٹر رکشا والے سے چاندنی چوک چلنے کے لیے کہا جائے تو جواب دے گا کہ میں تو انڈیا گیٹ جاؤں گا ........ اور اگر انڈیا گیٹ چلنے کے لیے کہا جائے تو کہے گا، شاہدرہ چلنا ہو تو لے چلوں گا۔

مگر اس اسکوٹر والے نے کوئی جواب نہیں دیا، بلکہ ٹکٹکی باندھ کر مجھے گھورنے لگا۔ میرے بدن پر سستا سا ریشمی کفن بندھا دیکھ کر بولا ''آپ کون ہیں؟ یہ مردے کا کفن کیوں باندھ رکھا ہے؟''

میں نے کہا ........ ''میں فکر تونسوی ہوں، یہ کفن میرا اپنا ہے، چرایا ہوا نہیں ہے''۔

''فکر تونسوی ہو؟'' اسکوٹر ڈرائیور گھبرا کر اپنی سیٹ سے اچھلا، مگر وہ تو انتقال کر گیا ہے، اور تم؟'' یہ کہتے کہتے وہ اسکوٹر چھوڑ کر تیزی سے بھاگ گیا۔ شاید وہ مجھے بھوت سمجھ کر بھاگا تھا۔ میری حالت بھی کسی بھوت سے مختلف نہیں تھی۔ بے ہنگم بڑھی ہوئی ڈاڑھی، سر کی بجائے بدن پر کفن، بھوک پیاس سے ہڈیاں باہر اور آنکھیں اندر۔ جسم پر جگہ جگہ مٹی لتھڑی ہوئی اور پاؤں سے بھی ننگا (حیرت ہے کہ دفن کرتے وقت مردے کو جوتا کیوں نہیں پہنایا جاتا؟)

تھکن، بھوک، توہین اور اداسی جو عام ہندوستانی کے نصیب میں ہے، میں بھی ان کا مجموعہ بنا ہوا تھا۔ اب میری پوزیشن بڑی عبرتناک تھی۔ نہ میں اپنے گھر جا سکتا تھا نہ واپس قبرستان جا سکتا تھا۔ سگریٹ پینے کی خواہش تیزی سے اٹھی مگر جیب میں ایک پیسہ نہیں تھا۔ بلکہ سرے سے جیب ہی نہیں تھی۔ پہلے اپنے آپ کو فکر تونسوی کہہ کر میں کسی بھی دکاندار سے سگریٹ ادھار لے سکتا تھا مگر اب؟ حالانکہ میں سو فی صدی وہی فکر تونسوی اپنا اعتماد، اپنی ساکھ کھو چکا تھا۔ آہ! صرف سات دن میں فکر تونسوی کیا سے کیا ہو گیا تھا!

تھکا ہارا، آہستہ آہستہ چلتا ہوا میں قریبی کمیونٹی ہال کی سیڑھیوں پر جا بیٹھا۔ سیڑھیوں کے اوپر کپڑے کا ایک بڑا سا نیلے رنگ کا مانو لگا ہوا تھا:

## طنز نگار فکر تونسوی کی یاد میں ماتمی جلسہ — رائٹرز اینڈ جرنلسٹ ایسوسی ایشن کی طرف سے

ماٹو پڑھ کر میرے دل میں ہوک سی اٹھی۔ جی چاہا کہ موت کے بعد عزت کا کفن پہنانے والے احباب سے ملوں اور ان [illegible]

''یارو! میری جدائی میں ٹھنڈی آہیں مت بھرو، کہ میں لوٹ آیا ہوں''۔

میں پھونک پھونک کر قدم رکھتا ہوا ہال کے اندر داخل ہوا اور احساسِ کمتری کے مارے سب سے پچھلی بینچ پر ایک کونے میں بیٹھ گیا۔ سارے ماحول پر اداسی اور غم کی گھٹائیں چھائی ہوئی تھیں۔ اسٹیج کے سیاہ پردے کے پیچھے ایک ماتمی دھن بج رہی تھی۔ کتنی لطیف دھن تھی! ماتم میں بھی کتنی گہرائی اور کتنا وقار ہوتا ہے۔ جی چاہا کہ یہ دھن بجتی رہے ........ بجتی رہے ........ بجتی رہے اور میں مرا رہوں ........ مرا رہوں۔

اتنے میں جلسے کا سیکرٹری مائیک پر آیا۔ میں اسے جانتا تھا۔ اس نے ایک ادبی میگزین میں ایک مرثیہ لکھا تھا ''فکر تونسوی کے طنز کی موت اسی دن واقع ہو گئی تھی جس دن اس نے طنزیہ مضامین لکھنے شروع کیے تھے'' اور میں نے فقرہ پر یہ کہا تھا: ''اگر یہ فقرہ دل کش نہ ہوتا تو میں اس حاسد شخص کے منہ پر طمانچہ لگا دیتا''۔ اب سیکرٹری نے رندھے ہوئے گلے سے کہنا شروع کیا:

''دوستو! مقام تاسف ہے کہ آج ہمارا محبوب و مقبول طنز نگار فکر تونسوی ہماری محفل میں موجود نہیں ہے، وہ ہمارے طنزیہ ادب کو سُونا کر کے چلا گیا''۔

ماتم گسار احباب نے وفورِ جذبات سے داد کی تالیاں بجائیں۔ ایک تالی میں نے بجائی اور طنزیہ ادب کو سونا کرنے کے غم میں شریک ہوا۔

اگلی نشستوں پر دو صاحب بیٹھے کھسر پھسر کرنے لگے۔ ایک نے کہا:

''حرام زادہ! بکواس کر رہا ہے! فکر تونسوی سے تو یہ انتہائی نفرت کرتا تھا''۔

دوسرا بولا: ''اور میں نے سنا ہے کہ اس نے مرحوم کی بیوہ کی امداد کے لیے پانچ ہزار روپے چندہ اکٹھا کیا ہے، جس میں آدھا ہڑپ کر گیا ہے''۔

''ہی ہی! کیوں نہ کرتا؟ یہ خود بھی تو ایک بیوہ ہے''۔

اس کے بعد صدرِ جلسہ نے مرحوم فکر تونسوی کی قد آدم تصویر کو ایک پھول مالا پہنائی۔ پھول مالا کی خوشبو اور ملائمت مجھے اپنے بدن میں محسوس ہونے لگی۔ بعض اوقات ٹریجڈی بھی کتنی ملائم اور معطر ہوتی ہے! میں جیسے مستی میں لہرا سا گیا۔ صدرِ جلسہ نے پھول مالا پہناتے وقت گلوگیر لہجے میں ایک شعر پڑھا:

سب کہاں، کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں   خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں

حاضرین میں سے ایک ینگ ٹرک قسم کا ادیب بے اختیار پکار اٹھا: ''ہائے ظالم نے کتنا صحیح شعر کتنے غلط موقع پر پڑھا ہے''۔

میرے ایک انتہائی مداح دوست نے اسے گردن سے پکڑا اور کشاں کشاں باہر جا کر پھینک آیا۔

اس کے بعد صدرِ جلسہ نے ماتم گسار احباب کو تقریریں کرنے کی اجازت دی اور ہر ایک نے ثابت کر دیا کہ صرف وہی فکر تونسوی کو قریب سے جانتا تھا۔ ایک ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ مرحوم کو جب بھی کھانسی ہوتی تھی، مجھ سے ہی گولیاں لے جاتا تھا اور یہ گولیاں ادبی خدمات کے سلسلے میں دی جاتی تھیں۔ ایک جرنلسٹ دوست نے دعویٰ کیا کہ ایک بار مرحوم نے میرے ساتھ شملے تک کا سفر کیا تھا تو اس نے انہیں راستے میں آلوچے کھلائے تھے۔ ایک پبلشر نے تین فقروں میں تین بار ٹھنڈی آہ بھرتے ہوئے تین بار اس بات کا ذکر کیا: ''مرحوم اپنی موت سے کچھ دن پہلے مجھ سے ایک سو روپے ادھار لے گئے تھے۔ اور ان سے اپنی قمیض پتلون سلوائی تھی۔ میں چاہتا ہوں کہ جب مرحوم کا میموریل ہال بنایا جائے تو اس پتلون، قمیض کو میری [illegible]

میرا جی چاہا کہ اٹھ کر اس پبلشر کا پردہ چاک کر دوں۔ لیکن پھر یہ سوچ کر خاموش بیٹھا رہا کہ مرحوم لوگوں کا اعتبار کون کرتا ہے؟

ایک اور صاحب اٹھے۔ وہ انتہائی گھٹیا شاعر اور انتہائی امیر آدمی تھے۔ وہ بڑے طیش میں تھے۔ میز پر مکا مارتے ہوئے گرج کر بولے: ''میں..... میں..... میں، ساہتیہ اکیڈمی سے پوچھتا ہوں کہ مرحوم کو ادبی ایوارڈ کا مستحق کیوں نہیں سمجھا گیا تھا؟ اور اگر زندگی میں نہیں سمجھا گیا تو کم از کم موت کے بعد ہی انہیں ایوارڈ دے دیا جائے''۔

اس پر 'شیم شیم' کے نعرے لگائے گئے۔ نہ جانے فکر تونسوی کو 'شیم شیم' کہا گیا یا ساہتیہ اکیڈمی کو؟ بہر کیف غصے اور جوش کی متفقہ تالیوں کی گونج میں اس تجویز کی تائید کر دی گئی۔

ماتمی میٹنگ کے خاتمے سے چند منٹ پہلے صدر جلسہ اٹھ کر چلے گئے۔ کیونکہ انہیں ایک سفارت خانے کی کاک ٹیل پارٹی میں شرکت کرنا تھی۔ مگر جاتے جاتے وہ ماتمی فنڈ میں ایک سو ایک روپیہ چندہ دینے کا اعلان کر گئے اور باقی ماندہ حضرات نے انسانیت کے بوجھ تلے دب کر جس طرح چندہ ادا کیا اس کے لیے پورے ایک ایکٹ کے ڈرامے کی ضرورت ہے۔

ایک ایکٹ کے اس ڈرامے میں کلائمکس اس وقت پیدا ہوا، جب سیاہ ساڑھی میں ملبوس میری بیوہ بیوی کو مائیکروفون پر آنسو بہانے کے لیے لایا گیا۔ اس نے سہاگ کی آخری چوڑی سٹیج پر توڑی، ماتھے کا سیندور اور بندی مٹائی، آنکھوں کا کاجل پونچھا اور پھر ان میں آنسو بھر لائی..... اس ماتمی حالت میں میری بیوی مجھے انتہائی دل کش اور دل ربا لگی۔ بیواؤں کی شخصیت میں بھی ایک عجیب سی سُتی سُتی، بھیگی بھیگی جاذبیت ہوتی ہے۔ میں نے جی ہی جی میں کہا: ''اے ظالم! تو میرے جیتے جی بیوہ کیوں نہیں بنی تھی؟ اس کی مسلسل سسکیوں سے محفل کی تمام آنکھیں نمناک ہو گئیں۔ میری آنکھوں میں بھی آنسو آ گئے۔ مگر یہ غم کے نہیں، خوشی کے آنسو تھے کہ کم از کم میری موت کے بعد تو مجھے بیوی کی محبت ملی، ورنہ اس سے پہلے جب بھی اس کی آنکھوں میں آنسو آتے تھے، اپنی ماں کی یاد میں ہی آتے تھے۔

اور پھر میری بیوی کی خاموش ماتم گساری سے محفل پر ایسی رقت طاری ہوئی کہ کسی کے منہ سے کوئی لفظ تک نہیں نکلتا تھا نہ آہ کا، نہ واہ کا، چنانچہ محفل کی ناگفتہ بہ حالت دیکھ کر سیکرٹری نے جلسہ کے خاتمے کا اعلان کر دیا..... اور ''فکر تونسوی میموریل کمیٹی'' کے پانچ معزز ممبران میری بیوہ کی دلجوئی کے لیے قریبی ریسٹوران میں چلے گئے۔ یہ ریسٹوران کافی اور آملیٹ کے لیے بہت مشہور تھا۔ کاش! میں ان سے اتنا کہہ سکتا: ''حضرات میرے نام کے چندے میں سے ایک کافی اور آملیٹ اس بدنصیب کو بھی مل جائے''۔

ہال ماتم کرنے والوں سے خالی ہو گیا۔ میں آخری آدمی تھا جو اپنی نشست پر بیٹھا رہا..... بیٹھا رہا..... بیٹھا رہا..... نہ جانے کتنے سال بیٹھا رہا۔ نہ جانے کتنی صدیاں، کہ اچانک کسی نے میرا کندھا جھنجوڑا اور ایک کرخت سی آواز آئی: ''صاحب اٹھیے، میٹنگ ختم ہو گئی''۔

اور میری صدیوں کی نیند کھل گئی۔ میرے سامنے کمیونٹی ہال کا چپڑاسی کھڑا تھا اور میں نے ہڑبڑا کر پوچھا ''میں کہاں ہوں؟''

چپڑاسی ہنس دیا ''فکر صاحب! آپ کمیونٹی ہال میں ہیں۔ آپ ملک کے مشہور شاعر جناب گھائل نامراد آبادی کے ماتمی جلسے میں شرکت کے لیے آئے ہوئے تھے۔ جلسہ کب کا ختم ہو گیا۔ آپ گھر نہیں جائیں گے کیا؟''

# آرا اور تبصرے

مخدومی محترمی! سلام مسنون،

قائداعظم لائبریری کا ادبی مجلّہ ''مخزن'' موصول ہوا اور آپ کے علمی و ادبی خدمات کے تسلسل و استحکام کے حوالے سے نہ جانے کتنی یادیں تازہ کر گیا۔ پرچے پر آپ کی وسعت مطالعہ، نفاست طبع اور پختگی ادارت کی مہر لگی ہوئی ہے۔ یقین آیا کہ:

منعم بکوہ و دشت و بیاباں غریب نیست

یہ آغاز کار یعنی تاسیس کا نشان ہے اور صاف بتا رہا ہے کہ اس پر بہت جلد، دیرپا ایوان ادب تعمیر ہو جائے گا۔ اس موسسہ مندانہ اقدام پر دلی مبارک باد

**ڈاکٹر فرمان فتح پوری۔ کراچی**

======

محترم عنایت اللہ صاحب! السلام علیکم

محترم ڈاکٹر وحید قریشی کی ادارت میں شائع ہونے والا یہ جریدہ اپنے مزاج اور مضامین کے تنوع کی وجہ سے منفرد پہچان رکھتا ہے۔ تمام مضامین معیاری ہیں اور طباعت بھی عمدہ ہے۔ میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو ادب کے میدان میں تابندہ رکھے۔ آمین

**بریگیڈیئر عزیز احمد خاں**

ریکٹر نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد

======

محترم عنایت اللہ صاحب!

السلام علیکم،

ادبی مجلّہ ''مخزن'' بڑا معیاری اور ہر اعتبار سے اعلیٰ درجے کا ہے۔ ڈاکٹر وحید قریشی صاحب بلاشبہ ماضی کے نامور مدیران کا ایک تسلسل ہیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ آپ پاکستان کے عاشق، مستند، معزز اور زندگی سے بھرپور شخصیت ہیں۔

آپ اور آپ کی مجلس ادارت نے انسانی اقدار کی گرتی دیواروں کے دور میں علمی و ادبی سفر کا آغاز کیا ہے۔ ہزار جتن کے باوجود ادبی سفر ہمیشہ کوشش ناتمام ہی ہوا کرتا ہے۔

مجھے مسرت ہے کہ رسالہ ''مخزن'' ایک سنجیدہ اور معتبر رسالہ ہے جس نے اپنے پس منظر کے مطابق تنقیدی، تخلیقی اور تحقیقی تحریریں شائع کرنا اپنا فرض جانا ہے۔

اللہ تعالیٰ آپ کے ساتھ رہے۔ ہماری بس یہی دعا ہے۔

**ثاقبہ رحیم الدین۔ راولپنڈی کینٹ**

======

گرامی قدر محترم ڈاکٹر وحید قریشی صاحب! السلام علیکم،

مخزن کا باطنی حسن ظاہری حسن سے ظاہر ہے۔ یہ اپنے دوسرے دور میں جس آب و تاب اور عزم سے داخل ہوا ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس نے جن اغراض و مقاصد کو پیش نظر رکھا تھا دوسرے دور کی زندگی میں انہیں نہ صرف قائم رکھے گا بلکہ آگے بڑھائے گا اور اس دور میں بھی ایسی ہی منفرد مثال قائم کرے گا۔ اب تک جس نہج پر چل رہا ہے آپ کی ادارت میں اس کی امید بھی کی جاتی ہے کہ اس کا رجحان تحقیق کی طرف زیادہ ہے۔ مجھ جیسے ایک عام قاری کو آپ جیسے اہل علم و دانش سے یہ امید ہے کہ آپ ادب کے تینوں شعبوں یعنی تخلیق، تنقید اور تحقیق میں توازن قائم رکھ کر اسے ایک مثالی رسالہ بنائیں گے۔ بلکہ دوسرے دور کی زندگی میں یہ رسالہ ایک قدم آگے بڑھائے گا اور آپ اس میں پاکستانی زبانوں سندھی، پنجابی، پشتو، بلوچی، کشمیری، گجراتی، سرائیکی، ہندکو اور گوجری وغیرہ زبانوں کے بہترین ادب کے تراجم بھی شائع کر کے اسے پاکستانی ادب و ثقافت کا ایک مثالی رسالہ بنائیں گے اس کا مجھے یقین ہے کہ آپ کی ادارت میں یہ کام جس حسن و خوبی اور توازن سے ہوگا وہ اپنی مثال آپ ہوگا۔

**الیاس عشقی۔ حیدر آباد (سندھ)**

======

مکرمی و محترمی جناب ڈاکٹر وحید قریشی صاحب! سلام مسنون،

مجلّہ ماشاءاللہ ظاہری و باطنی حسن سے مرصع ہے۔ مضامین ادبیات اردو کے اعلیٰ تنوع اور خوبیوں کی نشاندہی کرتے ہیں۔ اس مجلّہ سے قدیم مجلّہ مخزن کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ ادبی دنیا میں، جدید دور میں، ادبیات میں ایک خوبصورت اضافہ ہے۔ اللہ کرے یہ مجلّہ اسی آب و تاب سے جاری رہے۔

**پروفیسر ڈاکٹر ڈاکٹر احمد حسین قریشی قلعداری۔ گجرات**

======

مخدوم مکرم و کرم فرمائے محترم! تسلیمات،

اداریے سے مخزن کی پالیسی واضح ہے۔ مخزن نے ہر دور میں اردو ادب کی ترقی و ترویج میں خصوصی کردار ادا کیا ہے۔ ادب میں نئے اور صحت مند رجحانات کی داغ بیل ڈالی ہے۔ تحقیقی و معلوماتی مضامین و مقالات اور نوادرات کی اشاعت سے اردو ادب کو مالا مال کیا ہے۔ یہ میری خوش قسمتی ہے کہ شیخ عبدالقادر اور مولانا حامد علی خان کی ادارت میں شائع ہونے والے مخزن کی جلدیں زیر مطالعہ رہیں۔ لاہور کے دوران قیام حامد علی خاں صاحب سے شرف نیازمندی بھی حاصل رہا۔

اب میرے دیرینہ کرم فرما ڈاکٹر وحید قریشی صاحب کے زیر ادارت مخزن کے تیسرے دور کا آغاز نہایت مبارک اور خوش آئند ہے۔

مخزن کا پیش نظر شمارہ بھی ہر لحاظ سے معیاری، وقیع اور متنوع ہے۔ میر انیس کے دو صد سالہ جشن کی مناسبت سے مشکور حسین یاد کا مقالہ ''میر انیس کے تصور غربت کی اہم جہتیں'' خصوصی اہمیت کا حامل ہے۔ پروفیسر ایوب صابر کا مقالہ ''اقبال کے فن کو پرکھنے کا معیار'' اقبالیات کے باب میں ایک معلوماتی اضافہ ہے۔ دیگر مضامین بھی اپنے موضوع، افادیت اور معلومات کے اعتبار سے قابل مطالعہ اور لائق استفادہ ہیں۔

**ڈاکٹر وفا راشدی۔ کراچی**

======

محترمی ڈاکٹر وحید قریشی صاحب! السلام علیکم،

جب سے آپ کے نام نامی کا قائداعظم لائبریری کے ساتھ تعلق قائم ہوا ہے ''مخزن'' ہماری زبان کا ایک وقیع جریدہ بن گیا ہے۔ میں ''مخزن'' کے ہر شمارہ میں بہت قابل مطالعہ اور بامعنی تحریریں پڑھتا ہوں اور آپ کے حسن انتخاب و پیشکش کی داد دیتا ہوں۔ ان دنوں اردو جرائد میں معیاری تحریریں ذرا کم ہی نظر آتی ہیں۔ یہ شاید ہمارے معاشرہ میں ادبی ذوق کی کمی کا شاخسانہ ہو۔

**ڈاکٹر محمد علی صدیقی۔ کراچی**

======

مخزن کا نام زبان پر آتا ہے تو سو برس پر پھیلی ہوئی ادب و تنقید کی ایک روایت اور تاریخ کا ایک حسین نقش ذہن کے پردے پر ابھر آتا ہے۔ مخزن اپنے پہلے ادوار میں بھی اپنے معاصرین میں امتیاز کا حامل تھا اور اپنے خصائص میں آج بھی وہ امتیازات کا مالک ہے۔

مخزن اپنے موجودہ دور میں جو اس کی تاریخ کا تیسرا اہم دور ہے اور اگر لاہور کے دوسرے دور کو اس کے دہلی کے دور سے الگ رکھا جائے اور درست بھی یہی ہے کہ دہلی کے دور کو اس کے بعض خصائص کی بنا پر الگ ہی رکھا جائے تو یہ اپنے چوتھے دور میں بھی ایک خاص شان کا مالک اور نمایاں امتیازات رکھتا ہے۔

اس کے بانی اور پہلے رہنما شیخ سر عبدالقادر مرحوم ادب و تنقید کی روایت قائم کرنے والے تھے۔ شیخ اکرام اور راشد الخیری نے مخزن کی ادبی و تنقیدی روایت کو نہ صرف قائم رکھنے بلکہ اسے آگے بڑھانے میں حصہ لیا تھا۔ اس کے موجودہ دور کے قافلہ سالار حضرت مخدومی ڈاکٹر وحید قریشی دامت فیوضہم ادب و تنقید میں اپنے پیش روؤں کے قابل فخر جانشیں اور تحقیق کے میدان میں اس عہد کی ایک نامور ترین شخصیت اور اپنے اسلاف کے لیے فضائل و محاسن اور علم و سیرت کی ایک جامع اور مرجع شخصیت ہیں۔

وہ تنقید و تحقیق کے شیخ کل اور میخانہ ادب کے پیر مغاں ہیں، ان کا مقام استاذ الاساتذہ کا اور ان کا نام ادب و تنقید میں سند کا درجہ رکھتا ہے۔ وہ نامور مصنف اور صاحب اسلوب و شگفتہ نگار ادیب ہیں۔ انہوں نے مجلس ترقی ادب، اقبال اکادمی، پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج کے میگزینوں کو تحقیق اور ادب و تنقید کی تاریخ میں ناقابل فراموش اور ان کے نہ صرف خصوصی شماروں کو بلکہ عام شماروں کو بھی یادگار بنا دیا ہے۔ ان کا نام کسی علمی مجلّے کے معیار اور مقبولیت کی ضمانت ہے۔ مخزن ادبی اور علمی صحافت کی تاریخ میں ایک اور سنگ میل اور اس کے تینوں شمارے جو اب تک شائع ہوئے ہیں اس کا بین ثبوت ہے۔

مخزن اپنے مواد، معیار اور پیش کش کے حسن میں اپنی مثال آپ ہے۔ اس کے علمی، ادبی، تنقیدی محاسن اور فکر و تحقیق کے خصائص میں کوئی شریک نہیں اور وقت کے کسی میگزین کو حضرت مخدومی ڈاکٹر وحید قریشی جیسے نقاد، محقق اور نادر روزگار ادیب کی

رہنمائی میسر نہیں۔ انہوں نے اپنے ذاتی تعلقات کی بنا پر ملک کے نامور اور صف اول کے اہل قلم اور اصحاب فکر و نظر کا تعاون حاصل کر لیا ہے۔ وقت کے شائقین ادب مخزن کے گرویدہ اور اس کے محاسن علمی کے پرستار ہیں۔ یہ مخزن کا خاص امتیاز ہے۔

**ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہان پوری۔ کراچی**

======

محب گرامی۔ محبتیں

حقیقت یہ ہے کہ ہماری نسل کے بہت سے لکھنے والوں کی ابتدائی تربیت اسی جریدے نے کی جب تک یہ جاری رہا ہم جیسے کوچہ گردانِ شہر لوح و قلم کو دعوت جنوں دیتا رہا پھر

او بصحرا رفت و ما در کوچہ ہا رسوا شدیم

یہ بات لڑکپن کی تھی ایک طویل عرصہ بعد جب عمر کی اس منزل پہ پہنچے جہاں

ہمیں بھی غم طلبی کا نہیں رہا یارا
ترے بھی رنگ نہیں گردش زمانہ وہ

تو اس روپوش خزینہ نے اپنی طلسم کاریاں بار دگر دکھانی شروع کر دی ہیں ''اے آمدنت باعث خوشنودی ما'' میں جب لائبریری میں حاضر ہوا تھا تو آپ نے بہ کمال شفقت مخزن کے دو شمارے عنایت فرمائے تھے جو میرے لیے ایک نادر تحفہ تھا مخزن کے بارے میں میں صرف اتنا ہی عرض کروں گا کہ یہ ایک کلاسک کا درجہ رکھتا ہے اور اس سے فیض یاب ہونے کے لیے سنجیدہ دل و دماغ کی ضرورت ہے۔ گزشتہ نصف صدی سے جن جریدوں اور تحریروں کا رواج عام ہو چلا تھا ان سے یہ رسالہ یکسر مختلف ہے۔ خدا کرے آپ کی محنت، بصیرت اور تجربے سے یہ پرچہ جاری رہے اور ہم جیسے ادب کے بے شمار طالب علموں کے لیے نشو و نما کا ذریعہ بنے۔ میں ہر شمارے کا منتظر رہوں گا۔

کرم گردی الٰہی زندہ باشی

**احمد فراز**

**مینجنگ ڈائریکٹر نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد**

======

محترم عنایت اللہ صاحب، تسلیم و تکریم

''مخزن'' کے حوالے سے آپ کی کاوشیں بڑی لائق احسان ہیں، خدا آپ کو سرپرستی کے بیش از بیش مواقع عطا فرمائے۔

**ڈاکٹر سید معین الرحمن۔ لاہور**

======

تاریخ خود کو دہراتی ہے لیکن اس کا انداز تقلیدی نہیں بلکہ تخلیقی ہوتا ہے۔ گردش ایام نے کبھی ہم سے ''مخزن'' کو چھینا تھا، مقام صد شکر کہ اسے واپس لوٹا دیا گیا۔ ''مخزن'' کو حیات نو بخشنا واقعی قائداعظم لائبریری کا ایک بہت بڑا کارنامہ ہے۔ یہ سچ ہے کہ ''مخزن'' کو جسم تو قائداعظم لائبریری نے عطا کیا، لیکن اس میں روح ڈالنے کا فریضہ ڈاکٹر وحید قریشی نے انجام دیا۔ ڈاکٹر وحید قریشی بلاشبہ اس عہد کے ایک بڑے نابغہ ہیں۔ اب تک کے تمام شمارے ان کی علم پروری اور ادب دوستی کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔ ڈاکٹر موصوف ادبی گروہ بندیوں اور تعصبات سے ماورا ہو کر ادب کی مخلصانہ خدمت کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مختلف کیمپوں میں بٹنے والے ان شماروں میں ایک ہی صف میں نظر آتے ہیں۔ قائداعظم لائبریری نے ''مخزن (دور جدید)'' کا پہلا شمارہ ۲۰۰۱ء میں شائع کیا تھا۔ اب ہمارے ہاتھوں میں ''مخزن'' کا یہ تیسرا شمارہ ہے۔ اس شمارے کے اداریے میں ڈاکٹر وحید قریشی نے اس امر کی وضاحت کر دی ہے کہ عام پرچوں میں شعری مزاج کی فراوانی کو مدنظر رکھتے ہوئے ''مخزن'' نے اپنی الگ راہ نکالی ہے، جس میں علم ادب خصوصاً نقد و تحقیق کے لیے زیادہ گنجائش ہے۔ یہ شمارہ معیاری تحریروں اور حسن ترتیب کے باعث ادب کے عالمی پرچوں کی صف میں رکھے جانے کے قابل ہے۔ اس کے مندرجات کا مطالعہ کچھ پانے اور حاصل کرنے کا احساس دلاتا ہے۔

کالی داس گپتا رضا کی یاد میں گوپی چند نارنگ کا مضمون تاثراتی ہونے کے ساتھ ساتھ ان کے تحقیقی کارناموں کی اچھی تصویر پیش کرتا ہے۔ گوپی چند نارنگ کی یہ بات میدان تحقیق کے نو واردوں کو گرہ میں باندھ لینی چاہیے کہ ''تخلیق میں تو ایک مصرعے سے بھی مغفرت ہو سکتی ہے لیکن علمی کام میں پوری کی پوری عمر کھپ جاتی ہے تب کہیں جا کر پایہ اعتبار حاصل ہوتا ہے''۔

انتظار حسین نے اپنے مضمون ''نظریے کی جبریت'' میں اگرچہ جبریت کو پسند نہیں کیا، تاہم انہوں نے اس حقیقت کا اعتراف کیا ہے کہ ادب میں نظریے سے مفر نہیں۔ ادب میں کسی نہ کسی نظریے کی آمیزش ضرور ہوتی ہے۔ خواہ وہ ادب برائے زندگی ہو یا کوئی اور نظریہ۔

ڈاکٹر سہیل احمد خاں عہد حاضر میں اردو ادب کے ایسے بالغ نظر نقاد ہیں، جن کا کوئی بدل ہمارے پاس موجود نہیں۔ ڈاکٹر سہیل احمد خاں نے روسی ناول نگار دستوئیفسکی کے ناول ''برادرز کرمازوف'' کے چودہ سو صفحات پر مشتمل اردو ترجمے کو موضوع بنایا ہے۔ یہ ترجمہ شاہد حمید نے کیا ہے۔ تمام پہلوؤں کا جائزہ لینے کے بعد ڈاکٹر سہیل احمد خاں کہتے ہیں کہ اس بے نظیر ناول کے ترجمے نے اردو ادب کی اس شرمندگی کو ختم کر دیا ہے جو اب تک اس کا ترجمہ نہ ہونے کے باعث محسوس کی جا رہی تھی۔

ڈاکٹر انور سدید نے تین جلدوں پر مشتمل حضور اکرم ﷺ کی سیرت پاک ''الامین'' جو رفیق ڈوگر کی تصنیف ہے کو ''اکیسویں صدی کے لیے نسخہ کیمیا'' قرار دیا ہے۔ اس تبصرے کا سب سے اہم حصہ وہ ہے، جس میں ڈاکٹر انور سدید نے رفیق ڈوگر کی نفسی کیفیت اور کایا کلپ ہونے کا حال بیان کیا ہے۔

ڈاکٹر خواجہ حمید یزدانی جیسے اساتذہ کا دم غنیمت ہے۔ وہ انتہائی مخلصانہ رویے اور مثبت سوچ کے حامل ہیں۔ انہوں نے ریسرچ سوسائٹی آف پاکستان سے شائع ہونے والی میر عبدالعزیز کی انگریزی کتاب ''فریڈم سٹرگل ان کشمیر'' پر تفصیلی بحث کے بعد اسے ٹھوس محققانہ انداز میں لکھی گئی کتاب قرار دیا ہے۔

امجد اسلام امجد نے عطیہ سید کے افسانوی مجموعے ''حکایات جنوں'' میں کہیں کہیں تشنگی کے احساس کی بھی نشاندہی کی ہے اور عطیہ کو مبارک باد بھی دی ہے کہ وہ ان کہانی کاروں میں شامل ہو گئی ہیں جن کے دم سے اردو افسانے کا مستقبل تابناک ہے۔

عام طور پر تبصروں کو درخور اعتنا نہیں سمجھا جاتا کیونکہ ہمارے ہاں اکثر تبصرے تقریظی انداز لیے ہوئے ہوتے ہیں، تاہم کلیہ علوم اسلامیہ پنجاب یونیورسٹی کی ضخیم کتاب ''آثار الاولیاء'' پر محمد عالم مختار حق کا تبصرہ روایتی انداز سے ہٹ کر انتہائی تدقیقی اور تحقیقی ہے۔ موصوف نے دقت نظری اور باریک بینی سے ''آثار الاولیاء'' میں راہ پانے والی سینکڑوں اغلاط و اسقام کی نشاندہی کی ہے۔ محمد عالم مختار حق نے آثار کے محض چونسٹھ صفحات میں سے قریب قریب دو سو اغلاط کا صحت نامہ مرتب کیا ہے۔ اس سے پوری

کتاب میں غلطیوں کا تناسب معلوم کیا جا سکتا ہے۔ اس تبصرے سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچتی ہے کہ ہمارے ہاں وقت نظری سے کام کرنے والے ماہرین کی کمی نہیں۔ اگر کچھ ایسا طریقہ کار وضع کیا جاتا کہ کتاب چھپنے سے قبل ہی مختار حق جیسے کسی عالم فاضل سے نظر ثانی کرالی جاتی تو ایک علمی کام صحت کے ساتھ عوام و خواص تک پہنچتا اور یونیورسٹی اغلاط جاریہ بلکہ گناہ جاریہ کی مرتکب نہ ہو پاتی۔ اب یونیورسٹی کو چاہیے کہ وہ اس کی فروخت کے سلسلے کو بند کر دے، جس طرح علی گڑھ یونیورسٹی سے چھپنے والی اردو ادب کی تاریخ کو کثرت اغلاط کی بنا پر تقسیم ہونے سے روک دیا گیا تھا۔ یونیورسٹی کو چاہیے کہ ایک جامع صحت نامہ اس کے ساتھ لف کر کے کتاب کو فروخت کے لیے پیش کرے۔ یوں چھپے ہوئے لفظ کا اعتبار بھی بحال رہے گا۔

ڈاکٹر امجد ثاقب کے سفر نیپال ''گوتم کے دیس میں'' کا تعارف ''مخزن'' کی مجلس ادارت کے صدر عنایت اللہ نے بڑی تفصیل سے کرایا ہے۔ چند ایک تسامح سے صرف نظر کیا جائے تو یہ ایک کامیاب تبصرہ ہے جو قاری کے تجسس کو ایڑ لگا کر انتہائی سرعت سے کتاب تک پہنچنے پر مجبور کر دیتا ہے۔

''اقبال دشمنی'' جیسا مطالعہ پیش کرنے والے پروفیسر ایوب صابر نے ''اقبال کے فن کو پرکھنے کا معیار'' میں معترضین اقبال کی توجہ اردو کے لسانی اختلافی امور کی طرف دلائی ہے، گویا وہ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ اختلافی معاملات و مسائل کے طے ہونے تک اقبال پر اعتراضات جڑنے کا کوئی جواز نہیں۔

محمد ہارون عثمانی کتابوں کے سچے پارکھ ہیں۔ انہوں نے اس مرتبہ انجمن ترقی اردو پاکستان کی چار نئی مطبوعات ''شاہد احمد دہلوی: حالات و آثار'' از ڈاکٹر سید محمد عارف، ''میرے زمانے کی دلی'' از ملا واحدی دہلوی، ''جدید اردو افسانے کے رجحانات'' از ڈاکٹر سلیم آغا قزلباش اور ''انتخاب کلام: سودا، درد، میر، انشا، مصحفی اور آتش'' مرتبہ یونس سعید (مرحوم) پر اپنی گراں قدر رائے کا اظہار کیا ہے۔ وہ کتابوں کو ہر ہر زاویے سے جانچ کر اس کی خوبیاں نمایاں کرتے اور خامیوں پر ہمدردانہ نگاہ ڈالتے ہیں۔ ہارون عثمانی کا تنقیدی شعور اور بالغ نظری یہ بتا رہے ہیں کہ وہ ''مخزنی مکتب فکر'' کے ہونہار سپوت ثابت ہوں گے۔

رفاقت علی شاہد کی ''اتحاد'' لکھنو تک رسائی تو ہے مگر تھوڑے مواد کو پھیلانے کی کوشش نے مقالے کے معیار کو نقصان پہنچایا ہے۔ اگر صرف اہم معلومات کو سلیقے اور جامعیت سے پیش کر دیا جاتا اور ''مضامین شرر'' میں رسالہ ''اتحاد'' کے تذکرے کو بھی زیر بحث لایا جاتا تو مفروضوں اور قرائن کا سہارا لیے بغیر وثوق سے حتمی بات کہی جا سکتی تھی۔

مولانا حسرت موہانی تحریک پاکستان کے مخلص کارکن تھے۔ ان کا شمار دبستان سرسید کے اعلیٰ پائے کے نثر نگاروں میں ہوتا ہے۔ شفقت رضوی نے مولانا حسرت موہانی کی دیباچہ نگاری کے حوالے سے ان کی بامقصد نثر نگاری کو اجاگر کیا ہے۔

ڈاکٹر قرۃ العین طاہرہ نے ''حفیظ ہوشیار پوری اور ان کے چند احباب'' میں پیر حسام الدین راشدی، سید محمد نواز، قاضی احمد میاں اختر جوناگڑھی اور شیخ صلاح الدین سے حفیظ کی دوستی کے حوالے سے ان اقدار کا سراغ لگایا ہے جنہیں ان کی دوستی کی بنیاد سمجھنا چاہیے۔ یہ مضمون موصوفہ کے پی۔ ایچ۔ ڈی کے مقالے ''حفیظ ہوشیار پوری بیسویں صدی کی اردو غزل کے تناظر میں'' سے ایک اقتباس ہے۔

''مخزن'' کی گزشتہ اشاعتوں میں محمد سعید کے تبصرے موضوع پر ان کی گرفت اور طرز اظہار کے عمدہ نمونے ہیں۔ اس مرتبہ سہ ماہی ''انشا'' حیدر آباد کے ''ڈاکٹر نجم الاسلام نمبر'' پر بھی ان کی گرفت کمزور نہیں۔ انہوں نے موضوع کا محاصرہ پوری قوت سے کیا ہے اور چند اچھی تجاویز بھی پیش کی ہیں۔

بقول ڈاکٹر وحید قریشی ''مخزن'' کے پیش نظر قائداعظم لائبریری کا ایسا قاری بھی ہے جو اردو نثر کے اچھے نمونوں کا مطالعہ کرنا چاہتا ہے۔ اس مقصد کے تحت پیروڈی کی صنف کا انتخاب کیا گیا ہے۔ اس سلسلے میں کرشن چندر، پطرس بخاری، حاجی لق لق اور خضر تمیمی کی نمائندہ تحریریں شامل اشاعت ہیں، جو پرانے اور نئے قاری کے لیے یکساں مفید ہیں۔

اس شمارے میں معلوماتی مواد کے طور پر ''مخزن'' کے بارے میں آرا اور تبصروں کو یکجا کیا گیا ہے۔ اسی طرح تبادلے میں موصول ہونے والے رسائل اور قائداعظم لائبریری میں آنے والی نئی اردو کتب کی فہرستوں کو فروغ مطالعہ کی ایک کڑی خیال کرتے ہوئے پیش کیا ہے۔

بہرحال ''مخزن'' نے ڈاکٹر وحید قریشی کی ادارت میں جو کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں ان کو دیکھتے ہوئے بے اختیار کہنے کو جی چاہتا ہے کہ ''مخزن'' کو کسی شیخ عبدالقادر کی ضرورت ہے جو اس کی ماہوار اشاعت کو ممکن بنا سکے۔

**سہ ماہی نوادر لاہور: شمارہ ششم، فروری۔ اپریل ۲۰۰۳**

======

## قائداعظم لائبریری کا مجلّہ ''مخزن''

قائداعظم لائبریری کے زیر اہتمام شائع ہونے والا موقر ادبی جریدہ ''مخزن'' کا نیا شمارہ شائع ہو گیا ہے۔ ''مخزن'' کے مدیر ڈاکٹر وحید قریشی اور معاون ہارون عثمانی ہیں۔ ان کی کاوشوں سے ایک وقیع جریدہ اہل دانش کی توجہ حاصل کر رہا ہے۔ اس مرتبہ جن ممتاز اہل قلم کی نگارشات شامل ہیں ان میں ڈاکٹر سلیم اختر، شہزاد احمد، ڈاکٹر محمد یوسف خٹک، ڈاکٹر داؤد رہبر، افضل توصیف، ڈاکٹر اختر شمار، محمد حمزہ فاروقی، اسلم کمال، ڈاکٹر وحید قریشی، ڈاکٹر ظہور الدین احمد، ڈاکٹر خواجہ حمید یزدانی، محمد سعید، ڈاکٹر انور سدید، محمد ہارون عثمانی، جاوید اختر بھٹی، سہیل منصور کے علاوہ کنہیا لال کپور اور ابن انشا کی تخلیقات بھی شامل ہیں آخر میں محمد عباس چغتائی، شہناز مزمل اور خلیل چیمہ کی تحریریں بھی موجود ہیں۔ مجلس ادارت میں عنایت اللہ صدر مجلس کے علاوہ انتظار حسین، ڈاکٹر سلیم اختر، ڈاکٹر انور سدید، امجد اسلام امجد بھی شامل ہیں۔

**ماہنامہ بجنگ آمد، مئی ۲۰۰۳ء**

======

مخزن اردو کا قدیم جریدہ ہے۔ جس کا آغاز ۱۹۰۱ء میں شیخ عبدالقادر نے کیا اور اسے بجا طور پر ''بیسویں صدی کا ادبی آغاز'' قرار دیا جاتا رہا۔ قیام پاکستان کے بعد اس جریدہ کی نشاۃ ثانیہ ادارہ نوائے وقت کے اہتمام میں ہوئی اور مولانا حامد علی خاں اس کے مدیر مقرر ہوئے۔ پھر یہ جریدہ وقت کی رات میں کسی ستارہ کی مانند کھو سا گیا۔ اب ۲۱ویں صدی کے آغاز پر قائداعظم لائبریری نے اس جریدہ کو شائع کرنے کا فیصلہ کر کے گویا ۲۱ویں صدی کا ادبی آغاز کیا ہے جو قابل مبارک باد ہے۔

اس وقت مخزن کا تیسرا شمارہ زیر نظر ہے۔ جریدہ کی مجلس ادارت میں بڑے بھاری بھرکم نام عنایت اللہ (صدر مجلس) انتظار حسین، ڈاکٹر سلیم اختر، ڈاکٹر انور سدید، امجد اسلام امجد اور محمد ہارون عثمانی (معاون مدیر) شامل ہیں اور ادارتی ذمہ داری ڈاکٹر وحید قریشی کے سپرد ہے۔

مخزن بلاشبہ ایک ادبی رسالہ ہے اور ادب کے جدید رجحانات اور مسائل اس کا خاص موضوع ہیں۔ اس شمارہ میں انتظار حسین کا مضمون ''نظریے کی جبریت'' پروفیسر ایوب صابر کی تحریر ''اقبال کے فن کو پرکھنے کا معیار'' اور مشکور حسین یاد کا ''میر

personalities like Sir Syed Ahmad Khan and Sir Abdul Qadir.

The two journals are Tahzibul Akhlaq and Makhzan now appearing in their revived form under the editorship of Professor Abul Kalam Qasim and Dr. Waheed Qureshi.

In fact, it is more because of their glamorous past that I feel tempted to talk about them. But let me not mix them up. So at the moment I will talk about Makhzan. I will talk about the past and present of Tahzibul Akhlaq later.

Makzan was a venture of Sheikh Abdul Qadir, who had conceived it as a purely literary journal devoted to the cause of Urdu. It made its appearance at the advent of the twentieth century and soon turned into a leading literary journal of its time. It had the privilege of having Allama Iqbal and Maulana Zafar Ali Khan, as its permanent contributors. Sheikh Muhammad Ikram was its assistant editor.

The journal flourished as a leading literary magazine for a decade or so and then closed. But after the emergence of Pakistan it was revived under the editorship of Maulana Hamid Ali Khan. Again it did not last long.

The journal, which was born at the start of the twentieth century, was revived once again at the turn of the twenty first century. It was during 2001 that the Quaid-e-Azam Library took the initiative to revive it. An editorial board headed by Mr. Inayatullah, who in fact is the moving spirit behind this project, was formed and Dr. Waheed Qureshi was appointed its editor.

Makhzan, which was originally a monthly, has this time been conceived as a bi-annual. I have before me the later issue of 2002, which has come out in 2003. Among the contents is an article about Bhartari Hari, which tempts one to talk about.

Bhartari Hari is one of the poets of ancient India, who was a

انیس کے تصورِ غربت کی اہم جہتیں'' اور کتابوں پر تبصرے مخزن کے مزاج اور فکر شناسی کے آئینہ دار ہیں۔

اس شمارے میں کرشن چندر، پطرس بخاری اور حاجی لق لق کی مزاحیہ تحریریں اور شگفتہ باتیں بھی شامل ہیں۔ کیا یہ مناسب نہیں کہ اس وقت جو ادیب عمدہ مزاح لکھ رہے ہیں، ان کی چھلجھڑیاں بھی مخزن میں شامل ہوں۔ اس سے جریدہ کو ''قبول خواص'' کے ساتھ ''قبول عام'' کی سند بھی مل سکتی ہے۔

جریدہ کی طباعت عمدہ ہے اور سادگی میں کمال کا نمونہ ہے۔ قیمت نہایت مناسب ہے۔

**ہفت روز زندگی**: جلد ۲۲ شمارہ ۳۷، ۱۶ تا ۲۲ فروری ۲۰۰۳

======

قائداعظم لائبریری لاہور کا ادبی مجلّہ ''مخزن'' جس کی ادارت ڈاکٹر وحید قریشی کرتے ہیں، شائع ہو گیا ہے۔ دو سال کے عرصے میں یہ ''مخزن'' کا تیسرا شمارہ ہے، جو ظاہر کرتا ہے کہ ''مخزن'' کا اشاعتی سفر تیز رفتار نہیں بلکہ آہستہ رو ہے۔ اس کی وجہ ظاہر ہے کہ ''مخزن'' شاعری اور افسانے کی تخلیقی نگارشات پیش کرنے کی بجائے نثر کے ایسے مضامین کا مرقع ہے جو مصنفین کی لمبی سوچ، فکر کے گہرے زاویے اور خیال کی ندرت آفرینیوں کا نتیجہ ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ''مخزن'' کے مضامین اردو ادب کے حال کی بجائے اس کے ماضی کے دفینوں کو کھنگالتا اور خیال کے خزینوں کی تزئین نو کرتا ہے۔ زیرِ نظر پرچے میں ادبی زاویے سے انتظار حسین نے ''نظریے کی جبریت'' کے مختلف زاویے تراشے ہیں، مشکور حسین یاد نے ''میر انیس کے تصورِ غربت کی اہم جہات'' تلاش کی ہیں۔ شفقت رضوی نے مولانا حسرت موہانی کی دیباچہ نگاری کے زاویے دریافت کیے ہیں اور ڈاکٹر قرۃ العین طاہرہ نے حفیظ ہوشیار پوری کی عظمت کو ان کے حلقہ یاراں سے مرتب کیا ہے۔ کتابوں کے خصوصی مطالعے میں جناب عنایت اللہ نے سفرنامہ ''گوتم کے دیس میں'' کا بسیط تعارف کرایا۔ رفاقت علی شاہد نے لکھنو کے ایک قدیم رسالہ ''اتحاد'' کی ادبی خدمات کا مطالعہ پیش کیا ہے۔ محمد عالم مختار حق نے ''آثار اولیاء'' پر داد تحقیق دی ہے۔ انجمن ترقی اردو کی نئی مطبوعات کا بامعنی جائزہ محمد ہارون عثمانی نے پیش کیا ہے۔ اس مرتبہ ایک خاص حصہ ادبیات کے گم شدہ مضامین کے تعارف نو کے لیے بھی مرتب کیا گیا ہے۔ اس میں کرشن چندر، پطرس بخاری، حاجی لق لق اور خضر تمیمی کے مضامین جو طنز و مزاح کی صنف پیروڈی کی نمائندگی کرتے ہیں، پیش کیے گئے ہیں۔ مجموعی طور پر ''مخزن'' ایک ایسا صاف ستھرا نظر افروز اور خیال انگیز رسالہ ہے جس کا مطالعہ ذہن کو نئی بالیدگی عطا کرتا ہے اور گھر میں موجود ہو تو بچوں اور بڑوں کے ذوق کی آبیاری کرتا ہے۔ ''مخزن'' کے صدر مجلس جناب عنایت اللہ ہیں۔ مجلس ادارت میں انتظار حسین، ڈاکٹر سلیم اختر اور امجد اسلام امجد کے علاوہ یہ ناچیز انور سدید شامل ہے۔ تاہم اس کی خوبصورت پیش کش کا کریڈٹ محمد ہارون عثمانی کو جاتا ہے۔

**نوائے وقت سنڈے میگزین** ۲۶ جنوری ۲۰۰۳

======

## MAKHZAN AND BHARTARI HARI

Sometime back, I received two Urdu journals, one from Aligarh and the other from my own city Lahore, both carrying with them a history of literary journalism now hallowed because of its association with

different languages of the world, including Urdu.

Akhtar Shumar in his article is chiefly concerned with the Urdu translations of the poet. In his survey he has discussed the translations made by Gori Shankar Lal and Krish Chaudhary. I will like to add a few more names to this brief list. First and foremost is Iqbal, who has translated him both in Urdu and Persian Bang-i-Dara includes a poem titled Aftab, which is a translation from Bhartari's Gaetri Mantra. In Javaid Nama we come across couplets which are, as mentioned there, translations from Bhartari. Asar Lukhnavi too has translated a few ashloks from him.

More recent are the translations by Intizaruddin Khan. These translations have been presented volume title, Shair-i-Azam Bhartari Hari.

Bhartari Hari is chiefly known as a poet. But in addition he also enjoys the reputation of a philosopher-poet, who, though a king, had also gained a high place in the tradition of Faqr, which Bhartari himself will like to call Sanyas.

**Intizar Hussain, Point of view**
**Dawn Magazine 13th April 2003**

======

## ALL ABOUT BOOKS AND MAGAZINES

It is all about books and magazines this time. First, about Makhzan whose very mention brings to mind the name of Sir Abdul Qadir. It was he who started this highly rated literary journal in April 1901 and kept it going till 1910. I had some bound copies in the library inherited from my father but these were borrowed by a famous literary figure of the country and, as usual, never returned. I remember having seen contributions in it by a plain Abdul Qadir and someone called Muhammad Iqbal.

source of inspiration for Iqbal. Apart from his couplet, which translated in Urdu makes the title line in Bal-i-Jibreel, the poet also makes an appearance in Javaid Nama and wins glowing tribute from Iqbal.

However, the poet has not been able to attract much attention from Iqbal scholars. But if we know very little about him it is not solely because of the Iqbal scholar's indifference to him. In fact, very little is known about this poet. His whole life is wrapped in mystery. This is what has been discussed in the article included there. The writer is Akhtar Shumar, who, while surveying Urdu translations of Bhartari's verse, has painstakingly dug out a few facts about his life. But they are legends rather than facts.

Akhtar Shumar deserves praise for his labour. But the biographers, from whom he has benefited, seem to have derived much of their information from a work of fiction, where Bhartari makes his appearance as a fictional character. This work is Baital Pachchisi.

It forms part of Katha Sarit Sagar, a work of fiction running into nine volumes. But it at the same time enjoys an independent position. It was rendered into Urdu under the auspices of the Fort William College. In this katha Bhartari Hari has been presented as a Raja ruling Dharangar, which in some other versions has been described as Ujjain. He is the son of Raja Gandharav Sain and the younger brother of Vikramajit.

But there is no mention of him being a poet. Betrayed by his consort he loses interest in all things worldly. He abdicates, turns a sanyasi, and goes into the woods.

So the real man is lost in legend and tales. But his verse is there. As Akhtar Shumar tells us, there exist three collections of his verse known as Shringar Shatah, Niti Shatah, Vairag Shatah. This verse carrying with it the quality of universality has been translated in

conversant with the new words of command, nor was it proper to put me through the drill during the last years of my service, yet the parades went on as usual. I don't think the new words of command created any farcical situation.

ASHFAQUE NAQVI
Lahore Literary Scene
Daily Dawn 5-7-03

======

مدیر محترم!

السلام علیکم۔ مخزن کے جلد۲، شمارہ ا میں ڈاکٹر امجد ثاقب کے سفرنامے پر عنایت اللہ صاحب کا تبصرہ نما مضمون دیکھا۔ اس تبصرے میں عنایت اللہ صاحب نے اسلم انصاری صاحب کی شہرہ آفاق نظم ''مرے عزیزو، تمام دکھ ہے'' کو ڈاکٹر امجد ثاقب کی نظم کے طور پر درج کیا ہے۔ اب اسے کیا کہیے؟ اسلم انصاری کی کسی اور نظم کے بارے میں مغالطہ ہوسکتا ہے لیکن ان کی یہ نظم علمی و ادبی حلقوں میں تعارف کی محتاج نہیں۔ انصاری صاحب کی یہ نظم ان کے شعری مجموعے ''خواب و آگہی'' میں شامل ہے۔ ریکارڈ کی درستی فرمائی جائے۔

**خالد سنجرانی. شعبہ اردو. گورنمنٹ کالج یونیورسٹی لاہور**

خالد سنجرانی صاحب!

آپ کا مکتوب فاضل مقالہ نگار نے دیکھ لیا ہے۔ ریکارڈ کی درستی کے لیے آپ کا یہ خط شائع کیا جارہا ہے۔

**مدیر**

======

مکرمی!

تسلیم و نیاز

مخزن کا دوسرا شمارہ موصول ہوا۔ اس عنایت کے لیے شکرگزار ہوں۔ ورق گردانی کرتے ہوئے پرچے پر صرف ''جلد ا، شمارہ ۲'' لکھا گیا ہے، کہیں ماہ و سال کا ذکر نہیں۔ کیا یہ انداز مناسب ہے؟

بالاستیعاب دیکھنے کے بعد عریضہ ارسال کروں گا۔ امید ہے آپ بخیریت ہوں گے۔

**ڈاکٹر سفیر اختر . راولپنڈی**

ڈاکٹر سفیر اختر صاحب!

آپ کا ارشاد درست ہے۔ اس پرچے سے ماہ و سال کی احتیاط کی جارہی ہے بلکہ اندرونی سرورق پر شمارے کا مسلسل نمبر بھی درج کیا جارہا ہے۔ آپ کے تفصیلی تبصرے کا انتظار رہے گا۔

**مدیر**

======

Many years later, a magazine with the same name came out under the editorship of Hafeez Jallandhri but could not survive. It was again revived in the 1940s under the editorship of Maulana Hamid Ali Khan but had to close down as the Maulana accepted an offer from Maktaba-i-Franklin and took over its reins. It now goes to the credit of the Quaid-e-Azam Library for reviving Makhzan once again. It was in 2001 that they produced the magazine as a six monthly publication. On top of it, they induced a person of the caliber of Dr. Waheed Qureshi to assume its editorship and gave him a panel of eminent writers on the editorial board. A detailed history of the Makhzan has already been published in the second issue of the magazine produced by the library.

The latest issue of Makhzan has some interesting articles. One is a research piece by Dr. Akhtar Shumar on the poetry of the legendary Bhartarihari, which impressed even Allama Iqbal. Another is a personalized sketch of Prof. Muhammad Hassn-al-Azmi Al-Azhari by Muhammad Hamza Farooqi and a long, autobiographical article by the renowned artist, Aslam Kamal.

An article by my Model Town fried, Dr. Daud Rahbar, on the 'flavour' of Urdu, is also interesting to read. He quotes his younger brother, Muhammad Ilyas, who had joined the Pakistan Air Force, as having told him that the service had once adopted Urdu words of command for parade which not only created a lot of confusion but also led to a mushaira like situation on the parade ground. This has come to me like something of a news. Ilyas and I have been together in the PAF for years and I never heard of any such incident. Ilyas died many years ago. It was only after I returned from deputation in Saudi Arabia and was posted at the PAF Base, Sargodha in 1974, that I came to know that the parade was being conducted in Urdu. Although my base commander excused me from attending those parades as I was not

گرامی قدر عنایت اللہ صاحب!

السلام علیکم۔ آپ کے توسط سے قائد اعظم لائبریری کا ادبی مجلہ ''مخزن'' ملا۔ عزت افزائی کا شکریہ۔

رسالہ اپنے مواد کے لحاظ سے بہتر ہے، کچھ مضامین تو ایسے ہیں جو پہلے بھی کچھ رسائل میں چھپ چکے ہیں۔ اسی طرح غالب کی تشریحات کا سلسلہ انہی اصحاب کے توسط سے کراچی کے ایک سرکاری رسالے میں چلتا رہا ہے۔ حیرت ہے کہ ڈاکٹر وحید قریشی جیسے عالم مدیر کی موجودگی میں غالب کی تحریروں میں تصرفات کی رسم جاری ہے۔ انہی توضیحات کو عام فہم بنا کر اردو کے طلبا کے لیے سہولت بھی فراہم کی جاسکتی تھی۔

کھوئے ہوؤں کی جستجو والا حصہ بھی بہت ہی قدیم اور الیم ہے۔ اسی طرح مختصر تبصرے، کتب برائے تبصرہ، لائبریری میں آنے والی نئی کتب کو ایک ہی عنوان کے تحت ترتیب دیا جاسکتا ہے۔

سرکاری یا نیم سرکاری سطح پر زیادہ سنجیدہ اور عالمانہ رسالہ جات کی عدم مقبولیت کا بڑا سبب یہی ہے کہ سلسلہ انتخاب کو بہت ہی محدود کر دیا جاتا ہے۔ صحیفہ، قومی زبان، اخبار اردو، غالب وغیرہ وغیرہ اسی قسم کی صورت حال سے گزر رہے ہیں۔

ستر برس کے رسائل میں کچھ نہ کچھ سترہ برس کے لیے بھی ہونا چاہیے تاکہ نئے لکھنے اور پڑھنے والوں کی ایک اہمیت بنی رہے اور رسالہ محض ''ریفرنس بک'' بننے کی بجائے ایسی افادیت کا بھی باعث ہو جسے عرف عام میں ''تربیت قارئین'' کہا جاسکتا ہے۔ واضح رہے میں کسی آزادہ روی کی بات نہیں کر رہی، لیکن لائبریری کی وسعت کو صرف اردو ادب کے چند گنے چنے موضوعات تک محدود کر دینا مخزن اور لائبریری دونوں کے لیے مناسب نہ ہوگا۔ بہرحال مخزن کا کام اردو ادب کا نصاب تشکیل دینا تو نہیں مجلس ادارت کی ذمہ داری ہے کہ وہ اس خزانے میں نئی کرنسی کا بھی اضافہ کریں۔

جملہ احباب کی خدمت میں آداب۔

**ڈاکٹر شاہین مفتی، پرنسپل گورنمنٹ کالج فار وومن جلال پور جٹاں گجرات**

ڈاکٹر شاہین مفتی صاحبہ!

خاتون محترم صدر مجلس کے نام آپ کا خط ملا۔ ہمارا ششماہی پرچہ ہے بعض لکھنے والے اس دوران اپنے مضامین دوسرے پرچوں کو بھیج دیتے ہیں۔ ہم آئندہ احتیاط کریں گے۔ جو مقالے دوسرے پرچوں سے لیے جاتے ہیں ہم ان کی نشان دہی مقالے کے آخر میں کر دیتے ہیں۔ کھوئے ہوؤں کی جستجو بعض مرحومین کی تحریروں کی بازیافت پر مشتمل ہے اس لیے انہیں مختصر تبصروں میں شریک کرنا ممکن نہیں۔

آپ کا یہ ارشاد بالکل بجا ہے کہ نئے لکھنے والوں کی چیزیں بھی شائع ہونی چاہئیں۔ مجلے کے دوسرے شمارے کے اداریے میں اس کی وضاحت کی گئی ہے۔ اگر آپ نے پہلے تین پرچے ملاحظہ فرمائے ہیں تو ان میں رسالے کے دائرہ کار کی وضاحت کر دی گئی ہے۔ امید ہے آپ جلیل موضوعات پر کچھ لکھ کر ارسال فرمائیں گی۔ ہم چشم براہ ہیں۔ وجودیت پر آپ نے بہت کام کیا ہے اگر وجودی تحریک پر آپ کوئی نیا مقالہ لکھ کر بھیج سکیں تو ادارہ ممنون ہوگا۔

**مدیر**

======

# کتب موصولہ برائے تبصرہ

محمد ہارون عثمانی

درج ذیل کتب ''مخزن'' کو تبصرے کے لیے موصول ہوئی ہیں:

## شعبہ تصنیف و تالیف و ترجمہ جامعہ کراچی

۱۔ بلا کم و کاست (خودنوشت سوانح) / مہدی علی صدیقی ۔۔۔ کراچی: شعبہ تصنیف و تالیف و ترجمہ، جامعہ کراچی، ۲۰۰۲ء
۲۔ افکار و حوادث جلد سوم / عبدالمجید سالک مرتبہ از محمد حمزہ فاروقی ۔۔۔ کراچی: شعبہ تصنیف و تالیف و ترجمہ، جامعہ کراچی، ۲۰۰۳ء
۳۔ افکار و حوادث جلد چہارم / عبدالمجید سالک مرتبہ از محمد حمزہ فاروقی ۔۔۔ کراچی: شعبہ تصنیف و تالیف و ترجمہ، جامعہ کراچی، ۲۰۰۳ء
۴۔ جریدہ / مرتبہ ڈاکٹر معین الدین عقیل ۔۔۔ کراچی: شعبہ تصنیف و تالیف و ترجمہ، جامعہ کراچی، شمارہ ۱۸، جون ۲۰۰۲ء
۵۔ جریدہ / مرتبہ ڈاکٹر معین الدین عقیل ۔۔۔ کراچی: شعبہ تصنیف و تالیف و ترجمہ، جامعہ کراچی، شمارہ ۱۹، اکتوبر ۲۰۰۲ء
۶۔ جریدہ / مرتبہ ڈاکٹر معین الدین عقیل ۔۔۔ کراچی: شعبہ تصنیف و تالیف و ترجمہ، جامعہ کراچی، شمارہ ۲۰، مارچ ۲۰۰۳ء
۷۔ جریدہ / مرتبہ ڈاکٹر معین الدین عقیل ۔۔۔ کراچی: شعبہ تصنیف و تالیف و ترجمہ، جامعہ کراچی، شمارہ ۲۱، جون ۲۰۰۳
۸۔ مخزن ادب / مرتبہ شعبہ اردو، جامعہ کراچی ۔۔۔ کراچی: شعبہ تصنیف و تالیف و ترجمہ، جامعہ کراچی، ۲۰۰۳
۹۔ یاد ہے سب ذرا ذرا (خودنوشت) / عبید الرحمٰن ۔۔۔ کراچی: شعبہ تصنیف و تالیف و ترجمہ، جامعہ کراچی، ۲۰۰۳

## ٹی اینڈ ٹی پبلشرز، لاہور

۱۰۔ شبلی کی حیات معاشقہ / ڈاکٹر وحید قریشی، مرتبہ از عرفان احمد خان ۔۔۔ لاہور: ٹی اینڈ ٹی پبلشرز، ۲۰۰۲
۱۱۔ آبدوز (غزلیں) / افتخار نسیم ۔۔۔ لاہور: ٹی اینڈ ٹی پبلشرز، ۲۰۰۳ء
۱۲۔ شبری (افسانے) / افتخار نسیم ۔۔۔ لاہور: ٹی اینڈ ٹی پبلشرز، ۲۰۰۳ء

## انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی

۱۳۔ تاریخ انجمن: بابائے اردو مولوی عبدالحق کے بعد، شہزاد منظر تکملہ ادیب سہیل ۔۔۔ کراچی: انجمن ترقی اردو پاکستان، ۲۰۰۲ء
۱۴۔ غالب کی بعض تصانیف / کالی داس گپتا رضا ۔۔۔ کراچی: انجمن ترقی اردو پاکستان، ۲۰۰۲ء
۱۵۔ حرفے چند / جمیل الدین عالی ۔۔۔ کراچی: انجمن ترقی اردو پاکستان، ۱۹۸۸ء

۱۶۔ حرفے چند (حصہ دوم) رجمیل الدین عالی۔ــــ کراچی: انجمن ترقی اردو پاکستان، ۱۹۹۳ء

۱۷۔ حرفے چند (حصہ سوم) رجمیل الدین عالی۔ــــ کراچی: انجمن ترقی اردو پاکستان، ۱۹۹۷ء

۱۸۔ اطراف رشید احمد صدیقی راسلوب احمد انصاری۔ــــ کراچی: انجمن ترقی اردو پاکستان، ۱۹۸۸ء

### مقبول اکیڈمی لاہور

۱۹۔ افسانوی ادب رڈاکٹر وحید قریشی۔ــــ لاہور: مقبول اکیڈمی، س۔ن

۲۰۔ عجائبات فرنگ (سفرنامہ) رعلی سفیان آفاقی۔ــــ لاہور: مقبول اکیڈمی، س۔ن

۲۱۔ نظریہ پاکستان رسید واجد رضوی۔ــــ لاہور: مقبول اکیڈمی، ۱۹۹۸ء

۲۲۔ سخن ہائے آشنا رعبد العزیز خالد۔ــــ لاہور: مقبول اکیڈمی، ۲۰۰۳ء

۲۳۔ عمر خیام کے دیس میں ربلقیس ریاض۔ــــ لاہور: مقبول اکیڈمی، س۔ن

۲۴۔ شرح بال جبریل رقاضی ذوالفقار احمد۔ــــ لاہور: مقبول اکیڈمی، س۔ن

۲۵۔ زوال ملت اور نشاۃ ثانیہ رسید واجد رضوی۔ــــ لاہور: مقبول اکیڈمی، ۱۹۹۹ء

۲۶۔ دلاور فگاریاں: سوانح، تحقیق و تنقید رڈاکٹر انور سدید۔ــــ لاہور: مقبول اکیڈمی، ۱۹۹۹ء

۲۷۔ حضرت اویس قرنی رڈاکٹر ایس ایم ناز۔ــــ لاہور: مقبول اکیڈمی۔ــــ لاہور: مقبول اکیڈمی، ۱۹۹۹ء

۲۸۔ ارمغان مشرق رعبد العلیم صدیقی۔ــــ لاہور: مقبول اکیڈمی، س۔ن

۲۹۔ خواجہ حسن نظامی کے مضامین رخواجہ حسن نظامی، مولفہ از ڈاکٹر علی محمد خان۔ــــ لاہور: مقبول اکیڈمی، ۱۹۹۵ء

۳۰۔ طارق بن زیاد رڈاکٹر ارشد مقبول اور اختر حسین شیخ۔ــــ لاہور: مقبول اکیڈمی، س۔ن

۳۱۔ شہاب الدین غوری رمقبول کلاسیک سلسلہ۔ــــ لاہور: مقبول اکیڈمی، س۔ن

۳۲۔ بہادر شاہ ظفر رمقبول کلاسیک سلسلہ۔ــــ لاہور: مقبول اکیڈمی، س۔ن

۳۳۔ احمد شاہ ابدالی رمقبول کلاسیک سلسلہ۔ــــ لاہور: مقبول اکیڈمی، س۔ن

۳۴۔ شیر شاہ سوری رمقبول کلاسیک سلسلہ۔ــــ لاہور: مقبول اکیڈمی، س۔ن

۳۵۔ صلاح الدین ایوبی رمقبول کلاسیک سلسلہ۔ــــ لاہور: مقبول اکیڈمی، س۔ن

### پولیمر پبلی کیشنز، لاہور

۳۶۔ اٹکھیلیاں رذوالفقار علی احسن۔ــــ لاہور: پولیمر پبلی کیشنز، ۲۰۰۲ء

### محروم میموریل لٹریری سوسائٹی، نئی دہلی

۳۷۔ نسیم حجاز رجگن ناتھ آزاد۔ــــ نئی دہلی: محروم میموریل لٹریری سوسائٹی، ۱۹۹۹ء

# قائداعظم لائبریری کی علمی و ادبی تقاریب

محمد ہارون عثمانی

**۱۹ دسمبر ۲۰۰۲**

### تبصرہ کتب کی نشست

صدارت: پروفیسر عبد الجبار شاکر، ڈائریکٹر پبلک لائبریریز پنجاب، لاہور

مبصرین: نصرت علی اثیر، حافظ محمد توفیق، نسرین رانا

**۷ تا ۸ جنوری ۲۰۰۳**

### Two days Training Workshop on "Team Building, Motivation and Leadership"

تعاون: پرزم انسٹیٹیوٹ آف بزنس

شرکاء: محمد تاج، رانا اختر علی، محمد احسن، محمد ہارون عثمانی اور سرکاری اور نجی شعبے کے افسران

**یکم فروری ۲۰۰۳**

### Book Launching Ceremony

"Man and Money" by

Shaikh Mahmud Ahmad

مہمان خصوصی: ڈاکٹر عشرت حسین، گورنر سٹیٹ بنک آف پاکستان

مقررین: ڈاکٹر رفیق احمد، ڈاکٹر امجد سعید، ڈاکٹر خالد ظہیر، جناب کے ایم اعظم اور جناب عنایت اللہ

**۱۷ مارچ ۲۰۰۳**

### Lecture: Libraries and Librarians in the 21st century

صدارت: جناب طارق یوسف، سیکرٹری، بورڈ آف گورنرز قائداعظم لائبریری

مقرر: عبد الوحید، چیف لائبریرین پنجاب یونیورسٹی، لاہور

شرکاء: لاہور کے ممتاز لائبریرین

**۲۹ مارچ ۲۰۰۳**

## Seminar: Good Governance

صدارت: ڈاکٹر رفیق احمد، سابق وائس چانسلر، پنجاب یونیورسٹی، لاہور

مقررین: جناب اختر حیات، ممبر ڈائریکٹنگ سٹاف، ایڈمنسٹریٹو سٹاف کالج، لاہور

۲۔ پروفیسر جاوید احمد شیخ، چیئرمین، شعبہ سیاسیات، گورنمنٹ کالج یونیورسٹی، لاہور

۳۔ جناب حسن رضا شاہ، چیف ایگزیکٹو، پرزم انسٹی ٹیوٹ آف بزنس، لاہور

**۱۲ اپریل ۲۰۰۳**

## سیمینار: اقبال اور جمہوریت

صدارت: جناب محمد سہیل عمر، ڈائریکٹر، اقبال اکیڈمی، لاہور

مقررین: ۱۔ پروفیسر ڈاکٹر تحسین فراقی، شعبہ اردو، اورنٹیئل کالج، لاہور

۲۔ ڈاکٹر وحید عشرت، ڈپٹی ڈائریکٹر، اقبال اکیڈمی، لاہور

۳۔ پروفیسر عبدالجبار شاکر، ڈائریکٹر، پبلک لائبریریز پنجاب، لاہور

**۳۰۔ اپریل ۲۰۰۳**

## اردو مشاعرہ

صدارت: جناب امجد اسلام امجد

مہمان خصوصی: جناب انور مسعود

شعراء کرام: جعفر بلوچ، درانجم عارف، اعزاز احمد آذر، نثار اکبر آبادی، زاہد فخری، نیلما سرور، سعود عثمانی، کرامت بخاری، ڈاکٹر اختر شمار، پروفیسر عبدالجبار شاکر، سید شہزادہ خرم، صغریٰ صدف، سرفراز سید، ڈاکٹر سید شبیہ الحسن، عرفان جمیل، سید انعام نجمی علیگ، اعجاز احمد قاضی، پروین تجل، عفت علوی، اعجاز فیروز اعجاز، علمدار حسین اور طارق محمود در پن

میزبان: شہباز مزمل

**۲۰ مئی ۲۰۰۳**

## لیکچر: گیارہ ستمبر، امت مسلمہ کا بحران اور اس کا حل

مقرر: کموڈور (ر) طارق مجید

میزبان: جناب محمد تاج، چیف لائبریرین، قائداعظم لائبریری

**۳۱ مئی ۲۰۰۳**

## تبصرہ کتب کی نشست

صدارت: ڈاکٹر سلیم اختر

مبصرین: ۱۔ پروفیسر عبدالجبار شاکر، ڈائریکٹر، پبلک لائبریریز پنجاب، لاہور

۲۔ جناب محمد نعیم، چیف لائبریرین، گورنمنٹ کالج یونیورسٹی، لاہور

۳۔ پروفیسر محمد سعید، شعبہ اردو، گورنمنٹ کالج یونیورسٹی، لاہور

۴۔ جناب محمد ساجد مرزا، چیف لائبریرین، اقراء یونیورسٹی، لاہور

۵۔ جناب شفیق الرحمٰن، لائبریرین، پنجاب یونیورسٹی، لاہور

شرکاء: جناب انتظار حسین، جناب محمد تاج، محترمہ شگفتہ نازلی، جناب محمد ہارون عثمانی، محترمہ نسرین رانا، جناب رانا اختر علی، محترمہ سعیدہ خان، محترمہ شائستہ حسن ودیگر

**۱۴۔ جون ۲۰۰۳**

## سیمینار: مادر ملت محترمہ فاطمہ جناح۔ حیات وخدمات

صدارت: پروفیسر ڈاکٹر سید قلب عابد، صدر شعبہ تاریخ پنجاب یونیورسٹی لاہور

مقررین: ۱۔ ڈاکٹر طاہر کامران، اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ تاریخ، گورنمنٹ کالج یونیورسٹی لاہور

۲۔ جناب محمد تاج، چیف لائبریرین، قائداعظم لائبریری لاہور

**۲۷ جون ۲۰۰۳ء**

## ادبی نشست

مہمان خصوصی: ڈاکٹر سید معین الرحمٰن، سابق صدر شعبہ اردو، گورنمنٹ کالج یونیورسٹی، لاہور

مہمانان گرامی: امجد اسلام امجد، محمد تاج، ڈاکٹر سید شبیہ الحسن، ڈاکٹر معراج نیر زیدی، شگفتہ نازلی، نسرین رانا، پروفیسر صابر لودھی، آغا امیر حسین، پروفیسر لیاقت راوی، پروفیسر محمد سعید، محمد نعیم، پروفیسر طارق زیدی، شائستہ حسن، محیط اسماعیل، پروفیسر خورشید حسنین بخاری، سردش نگار ہاشمی ودیگر

میزبان: محمد ہارون عثمانی

# قائداعظم لائبریری میں آنے والی نئی اردو کتب

ضیاء الدین فاروقی رفہیم عثمانی

۱۔ قلب ظلمات (ناول) رجوزف کونریڈ، مترجمہ محمد سلیم الرحمٰن ۔ کراچی: سٹی پریس بک شاپ ۲۰۰۱، ص ۱۳۷،
قیمت -/80

۲۔ پاکستان کا ثقافتی ورثہ رشیخ محمد اکرم ۔ لاہور: ادارہ ثقافت اسلامیہ، ۲۰۰۱، ص ۳۱۵، قیمت -/200

۳۔ مجمع البحرین (یعنی شیعہ اور سنی کی متفق علیہ روایات) رمولانا جعفر شاہ پھلواری ۔ لاہور: ادارہ ثقافت اسلامیہ، ۲۰۰۱،
ص ۲۳۹، قیمت -/200

۴۔ تمدن ہند پر اسلامی اثرات رمحمد سعود احمد ۔ لاہور: مجلس ترقی ادب، ۲۰۰۲، قیمت -/270

۵۔ جمالیات (قرآن حکیم کی روشنی میں) رڈاکٹر نصیر احمد ناصر ۔ لاہور: مجلس ترقی ادب، ۲۰۰۲، ص ۳۶۸،
قیمت -/200

۶۔ اقبال کا تصور زمان و مکان اور دوسرے مضامین رڈاکٹر رضی الدین صدیقی ۔ لاہور: مجلس ترقی ادب، ۲۰۰۲،
ص ۲۴۷، قیمت -/150

۷۔ للو لال جی کوی (ایک ادبی سوانح) رابو سعادت جلیلی ۔ لاہور: مجلس ترقی ادب، ۲۰۰۲، ص ۲۹۵، قیمت -/140

۸۔ آغا حشر کے ڈرامے جلد چہارم رعشرت رحمانی ۔ لاہور: مجلس ترقی ادب، ۲۰۰۲، ص ۳۱۸، قیمت -/150

۹۔ مجموعہ منشی پریم چند (افسانے) رمنشی پریم چند ۔ لاہور: سنگ میل پبلشرز، ۲۰۰۲، ص ۹۲۸، قیمت -/765

۱۰۔ پاکستانی انقلاب کے مسائل رسردار شوکت علی ۔ لاہور: فکشن ہاؤس ۲۰۰۲، ص ۳۲۸، قیمت -/170

۱۱۔ پیداوار، سماج اور صنعت کاری رغلام کبریا ۔ لاہور: فکشن ہاؤس، ۲۰۰۱، ص ۲۹۶، قیمت -/255

۱۲۔ میرا سفر نامہ رحافظ تقی الدین ۔ لاہور: کلاسیک، ۲۰۰۲، ص ۳۵۲، قیمت -/200

۱۳۔ کلام اقبال کے عوامی افق رمشکور حسین یاد ۔ لاہور: کلاسیک ۲۰۰۱، ص ۱۹۲، قیمت -/150

۱۴۔ پاکستان میں ترقی پسند صحافت رڈاکٹر احسن اختر ناز ۔ لاہور: کلاسیک، ۲۰۰۲، ص ۲۷۴، قیمت -/150

۱۵۔ مطالعہ انیس کے نازک مراحل رمشکور حسین یاد ۔ لاہور: کلاسیک، ۲۰۰۲، ص ۱۸۷، قیمت -/150

۱۶۔ نقطے سے نقطے تک رغلام الثقلین نقوی ۔ لاہور: کلاسیک، ۲۰۰۱، ص ۱۶۸، قیمت -/100

۱۷۔ پاکستان کی سیاسی جماعتیں اور تحریکیں رحافظ تقی الدین ۔ لاہور: کلاسیک ۲۰۰۲، ص ۵۲۰، قیمت -/300

۱۸۔ شبلی کی حیات معاشقہ رڈاکٹر وحید قریشی ۔ لاہور: ٹی اینڈ ٹی پبلشرز، ۲۰۰۱، ص ۱۲۶

۱۹۔ مقالات سیرت النبی (قومی سیرت کانفرنس) حکومت پاکستان ۔ اسلام آباد: ص ۸۰۵

۲۰۔ قومی سیرت کانفرنس (خواتین) ۲۰۰۱، حکومت پاکستان ۔ اسلام آباد: ص ۴۹۷، قیمت -/350

۲۱۔ قومی سیرت کانفرنس (مرد) ۲۰۰۱، حکومت پاکستان ۔ اسلام آباد: ص ۵۲۲، قیمت -/350

۲۲۔ قومی سیرت کانفرنس ۲۰۰۲ر حکومت پاکستان ۔ اسلام آباد: ص ۵۵۴، قیمت -/350

۲۳۔ کتابیات پاکستانی ادب 1995۔۲۰۰۱ رسعیدہ درانی ۔ اسلام آباد: اکادمی ادبیات، ص ۴۹۰،

۲۴۔ کتابیات پاکستانی ادب ۲۰۰۱ رسعیدہ درانی، ۲۰۰۲، ص ۲۵۶

۲۵۔ کتابیات پاکستانی ادب نثر ۲۰۰۱ ررشید امجد، ۲۰۰۲، ص ۳۸۰

۲۶۔ کتابیات پاکستانی ادب شاعری ۲۰۰۱ رمحمد اظہار الحق ۔ اسلام آباد: اکادمی ادبیات ۲۰۰۲، ص ۲۱۸

۲۷۔ ادبیات (سہ ماہی) نمبر ۵۷ رنگہت سلیم، ۲۰۰۲، ص ۲۵۲

۲۸۔ ادبیات نمبر ۵۸ رنگہت سلیم ۲۰۰۲، ص ۳۱۰

۲۹۔ خاندان لوہارو رطاہر بانو حجاب ۔ لاہور: فیروز سنز، ۲۰۰۲، ص ۱۳۲

۳۰۔ اپنا گریباں چاک (خودنوشت) رڈاکٹر جاوید اقبال ۔ لاہور: سنگ میل، ۲۰۰۳،

۳۱۔ اقبال شناسی رمنظور احمد ۔ لاہور: ادارہ ثقافت اسلامیہ، ۲۰۰۲، ص ۱۲۷

۳۲۔ سرسید کی صحافت راصغر عباس ۔ لاہور: اردو اکیڈمی پاکستان، ۲۰۰۳، ص ۲۷۸

۳۳۔ تنوع رسلیم اختر ۔ مغربی پاکستان اکیڈمی، ۲۰۰۳، ص ۲۶۴، قیمت -/120

۳۴۔ کتابیات ادب اردو (۵) رمحمد انصار اللہ ۔ لاہور: اردو اکیڈمی، ۲۰۰۲، ص ۱۴۴، قیمت -/120

۳۵۔ پاکستان میں اردو غزل کا ارتقا رانور صابر ۔ مغربی پاکستان اکیڈمی، ۲۰۰۲، ص ۸۴۰، قیمت -/120

۳۶۔ آغا حشر کاشمیری اور اردو ڈرامہ رانجمن آرا انجم، مغربی پاکستان اکیڈمی ۲۰۰۲، ص ۳۲۸، قیمت -/120

۳۷۔ میرے دیار میرے ساحل رغازی صلاح الدین ۔ لاہور: سنگ میل، ۲۰۰۲، ص ۲۸۸، قیمت -/250

۳۸۔ حجاب سے آگے رفاطمہ مرنیسی، مرتبہ از محمد ارشد رازی ۔ لاہور: مشعل، ۲۰۰۱، ص ۲۱۹، قیمت -/170

۳۹۔ پاکستان ریاست اور اس کا بحران رحمزہ علوی ۔ لاہور: فکشن ہاؤس، ۲۰۰۲، ص ۳۷۴، قیمت -/230

۴۰۔ خط مرموز رفہمیدہ ریاض ۔ کراچی: سٹی پریس ۲۰۰۲، ص ۱۳۲، قیمت -/100

۴۱۔ بولتے رنگ سوچتی لکیریں ربشیر موجد ۔ لاہور: فنون پبلشرز، ۲۰۰۲، ص ۲۹۴، قیمت -/1500

۴۲۔ رنگ نیرنگ ربشیر موجد ۔ لاہور: فنون پبلشرز، ۲۰۰۲، ص ۱۹۲، قیمت -/750

۴۳۔ پس حجاب راحمد رفیق اختر ۔ اسلام آباد: اقرا ملت ۲۰۰۲، ص ۱۸۲، قیمت -/150

۴۴۔ مشرق کا وینس (سفرنامہ) رڈاکٹر عبدالرحمٰن خواجہ ۔ لاہور: فکشن ہاؤس، ۲۰۰۲، ص ۳۰۱، قیمت -/250

۴۵۔ اور جہد انقلاب رکلد یپ نیر، مترجمہ از فہمیدہ ریاض ۔ لاہور: آکسفورڈ یونیورسٹی پریس، ۲۰۰۲، ص ۲۴۲،
قیمت -/395

۴۶۔ ہیری پوٹر اور رازوں کا کمرہ رجے کے رولنگ، مترجمہ از درخشندہ اصغر کھوکھر ۔ لاہور: آکسفورڈ یونیورسٹی پریس،

۲۰۰۱، ص ۲۹۵، قیمت -/275

۴۷۔ پاکستان آرمی: تاریخ و تنظیم / سٹیون پی کوہن، مترجمہ از سہیل انجم ۔ لاہور: آکسفورڈ یونیورسٹی پریس، ۲۰۰۱، ص ۲۲۰، قیمت -/275

۴۸۔ بے نظیر حکومت: پہلا دور کیا کھویا کیا پایا / اقبال اخوند، مترجمہ از فہمیدہ ریاض ۔ لاہور: آکسفورڈ یونیورسٹی پریس، ۲۰۰۲، ص ۳۳۸، قیمت -/395

۴۹۔ پاکستان میں آمریت اور ججوں کا کردار / روداب پٹیل، مترجمہ از نعیم اللہ ملک ۔ لاہور: آکسفورڈ یونیورسٹی پریس، ۲۰۰۲، ص ۱۶۴، قیمت -/250

۵۰۔ اسلام اور جمہوریت / مترجم محمد ارشد رازی ۔ لاہور: مشعل بکس، ۲۰۰۲، ص ۲۰۸

۵۱۔ کانٹوں کی کھیتی / مترجم محمد ارشد رازی ۔ لاہور: مشعل بکس، ۲۰۰۲، ص ۱۹۶

۵۲۔ بولتے سر / پرویز پارس ۔ لاہور: ظفر سنز، ۲۰۰۲، ص ۱۹۶

۵۳۔ محسن کائنات اسلام اور جدید مسائل / ڈاکٹر ایم محی الدین قاضی ۔ لاہور: ہجویری پرنٹر اردو بازار، ۲۰۰۲، ص ۲۸۸

۵۴۔ انسانیت کی کہانی رسومات کی زبانی / ڈاکٹر شمس الحق ۔ لاہور: العفو ایکسز انٹرنیشنل، ۲۰۰۱، ص ۲۳۱

۵۵۔ لوق کوٹ سے لاہور تک / راؤ جاوید اقبال ۔ لاہور: راجپوت بک فاؤنڈیشن، ۲۰۰۲، ص ۱۴۴

۵۶۔ اولاد امیر المومنین کیا علوی سادات ہیں؟ / ابوالحسنین وزیر حسین العلوی ۔ ایران: موسسہ سید الاولیاء امیر المومنین، ۲۰۰۱، ص ۸۰

۵۷۔ صالح خاوند صالح بیوی / غازی محمد اسحاق ۔ لاہور: جی ڈی ایس پرنٹرز، ۲۰۰۱، ص ۱۵۰

۵۸۔ ادب کہانی ۱۹۹۷ / ڈاکٹر انور سدید ۔ لاہور: مکتبہ فکر و خیال، ۲۰۰۱، ص ۳۴۴

۵۹۔ سرمایہ دار طبقہ پاکستان کے مسائل اور ان کا حل / نصیر الدین بٹ ۔ سیالکوٹ: مرحبا بلڈنگ، ۲۰۰۱، ص ۱۱۴

۶۰۔ عظیم ماں / حارث عبدالحفیظ ۔ لاہور: قاضی پبلشرز، ۲۰۰۱، ص ۱۷۹

۶۱۔ ہم آنکھیں ہیں / وزیر آغا ۔ لاہور: کاغذی پیرہن، ۲۰۰۱، ص ۸۰

۶۲۔ مثال / منیر سیفی ۔ لاہور: کاغذی پیرہن، ۲۰۰۲، ص ۱۵۱

۶۳۔ کھوئے ہوؤں کی جستجو / شہرت بخاری ۔ لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۲، ص ۴۵۲

۶۴۔ بولتے سنّاٹے / پروین طارق ۔ لاہور: کاغذی پیرہن، ۲۰۰۲، ص ۱۰۳

۶۵۔ صلائے عام / حامد خان درانی ۔ ملتان: بزم ثقافت پبلک لائبریری، ۲۰۰۲، ص ۲۵۴

۶۶۔ فضیلت ذکر اللہ تعالیٰ / فاطمہ بنت شوکت محمد علیان ۔ لاہور: مکتبہ دار السالکین ۲۰۰۲، ص ۳۳۱

۶۷۔ پاکستان میں امریکی سازشیں / علی جاوید نقوی ۔ لاہور: صبح پبلشرز، ۲۰۰۲، ص ۳۴۷

۶۸۔ ذکر فرید، شیخ فرید الدین مسعود گنج / سید افضل حیدر ۔ لاہور: کلاسیک، ۲۰۰۲، ص ۳۲۵

۶۹۔ قلم قبیلہ۔ ایک ادارہ ایک تحریک / عرفان احمد بیگ ۔ راولپنڈی: پیپ بورڈ پرنٹرز لمیٹڈ ۲۰۰۱، ص ۳۳۹

۔ محبت / ثاقب رحیم الدین ۔ راولپنڈی: پیپ بورڈ پرنٹرز لمیٹڈ، ۲۰۰۲، ص ۱۲۷

۷۱۔ قلم قبیلہ (سہ ماہی) / ثاقب رحیم الدین ۔ کوئٹہ: قلم قبیلہ ادبی ٹرسٹ ۲۰۰۲، ص ۲۴۲

۷۲۔ اردو شاعری میں نئے تجربے / علیم صبا نویدی ۔ چنائے: اکادمی آف اسلامک ریسرچ، ۲۰۰۲، ص ۲۹۶

۷۳۔ ٹمل ناڈو میں اردو رباعی / علیم صبا نویدی ۔ چنائے: ٹمل ناڈو اردو پبلیکیشنز، ۲۰۰۳، ص ۱۴۰

۷۴۔ اصول تحقیق و ترتیب متن / ڈاکٹر تنویر احمد علوی ۔ لاہور: سنگت پبلشرز، ۲۰۰۳، ص ۳۵۲

۷۵۔ تلاش موسم گل / قیوم طاہر ۔ راولپنڈی: انجم پبلشرز، ۲۰۰۱، ص ۲۲۱

۷۶۔ افکار و حوادث (جلد سوئم، چہارم) / عبدالمجید سالک ۔ جامعہ کراچی: شعبہ تصنیف و تالیف ترجمہ ۳۔۲۰۰۲، ص ۲۹۰، ۱۷۳

۷۷۔ بلا کم و کاست (خود نوشت سوانح) / مہدی علی صدیقی، ۲۰۰۲، ص ۳۷۲

۷۸۔ دبستانوں کا دبستان کراچی (حصہ اول) / احمد حسین صدیقی ۔ کراچی: محمد حسین اکیڈمی، ۲۰۰۳، ص ۵۳۶

۷۹۔ القرآن الکریم / بورڈ ادارہ علم القرآن ۔ لاہور: ادارہ علم القرآن ۲۰۰۲، ص ۹۸۷

۸۰۔ جریدہ (جلد ۱۸+۱۹+۲۰) / ڈاکٹر معین الدین عقیل ۔ کراچی: شعبہ تصنیف و تالیف جامعہ کراچی، ۲۰۰۲، ص ۶۴+۱۶۱+۱۷۵

۸۱۔ اٹکھیلیاں / ذوالفقار علی احسن ۔ لاہور: پولیمر پبلی کیشنز، ۲۰۰۲، ص ۱۲۷

۸۲۔ گوتم کے دیس میں (سفر نامہ نیپال) / ڈاکٹر محمد امجد ثاقب ۔ لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز ۲۰۰۱، ص ۲۱۳

۸۳۔ پنجابی مضمون / بذل حق محمود ۔ لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۳، ص ۶۲

۸۴۔ سگ آوارہ / بذل حق محمود (مترجم) لاہور: سنگ میل پبلیکیشنز، ۲۰۰۱، ص ۳۲۰

۸۵۔ بہادر شاہ ظفر: شخصیت، فکر اور فن / پروفیسر ڈاکٹر سردار احمد خان ۔ کراچی: فضلی سنز، ۲۰۰۱، ص ۳۱۵

۸۶۔ مضامین بذل حق محمود / بذل حق محمود ۔ لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۳، ص ۴۲۴

## قائد اعظم لائبریری میں چند اہم شخصیات کے ذاتی ذخیرہ ہائے کتب

| نمبر شمار | نام ذخیرہ کتب | تعداد کتب |
|---|---|---|
| ۱۔ | میاں بشیر احمد | ۱۰۶۳ |
| ۲۔ | خواجہ منظور حسین | ۳۴۷ |
| ۳۔ | ڈاکٹر نصیر احمد ناصر | ۲۳۰ |
| ۴۔ | صفدر میر | ۷۵۰۰ |
| ۵۔ | عطاء اللہ کلیم | ۳۱۱۰ |
| ۶۔ | میاں عبدالحمید ضیاء | ۳۶۰ |
| ۷۔ | چینی سفارت خانہ | ۵۱۵ |